مضامین الندوہ۔ لکھنؤ

(۱۹۰۵-۱۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

پورب اکادمی

مضامین الندوہ۔ لکھنؤ

(۱۹۰۵۔۱۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(ڈائریکٹر ابوالکلام آزاد ری سرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان۔کراچی)

پورب اکادمی، اسلام آباد

طبع اوّل: نومبر 2007ء

ناشر: پورب اکادمی، اسلام آباد

فون نمبر: 051 - 538 29 67, 0301 - 559 58 610

ای میل: info@poorab.com.pk

ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

Mazameen Al-Nadwa - Lucknow

by: Dr. Abu-Salman Shahjahanpuri

Published by: Poorab Academy, Islamabad, Pakistan

۲۹۷.۰۴

آزا آزاد، ابوالکلام

مضامین الندوہ۔ لکھنؤ / ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔-

اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء

ص ۲۹۶

۱. اسلام- مضامین و مقالات

۲. ہندوستان- تاریخ ۳. ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

باسمہٖ

میں اپنی یہ تالیف

مولانا ابوالکلام آزاد

کے مخلصین و محبین اور مصنفین

محمد عبدالشاہد خاں شروانی (علی گڑھ)

محمد یونس خالدی (لکھنؤ)

عبداللطیف اعظمی (دہلی)

کے نام معنون کرتا ہوں

جن کی تحریرات سے میں نے بیش از بیش استفادہ کیا،

جن کی تنقیدات سے مجھ میں لکھنے کا سلیقہ آیا اور

جن کی ہمت افزائی سے حوصلہ پیدا ہوا!

اگر مجھ سے کوئی مفید کام انجام پایا ہے تو اس میں ان بزرگ دوستوں کا بہت حصہ ہے

اللہ تعالیٰ ان کے مراتب کو بلند فرمائے

ابوسلمان

فہرست

مضامین الندوہ (۱۹۰۵ـ۱۰ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

کسی علمی شخصیت اور اس کے افکار کے بارے میں ہم کوئی حتمی بات کیوں کر کہہ سکتے ہیں جب تک اس کے آثار تک ہماری رسائی نہ ہو جائے! یہ بات مولانا غلام رسول مہر (ف ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء) نے کہی تھی یا خواجہ عبدالوحید (ف ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۹ء) علیہما الرحمہ نے کہی تھی، یہ مجھے یاد نہیں۔ میرے ذوق کی تربیت میں دونوں بزرگوں کا بہت قریب کا حصہ ہے، میرے ساتھ دونوں کا نہایت شفقت کا برتاؤ تھا۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد پر آغاز کار ہی سے مولانا کے آثارِ علمیہ و ادبیہ کی جستجو اور ان کی تالیف و تدوین اور اشاعت کا مقصد میرے سامنے رہا۔ اگرچہ میں نے مولانا ابوالکلام پر مختلف نوعیت کے کام کیے اور پچاسوں مضامین لکھے، لیکن ببلیوگرافیکل کاموں کا پلہ بھاری رہا۔

اس کے باوجود کہ اس قسم کے کاموں کی اہمیت میرے دل پر آغاز کار ہی میں نقش ہو گئی تھی، لیکن کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت، سوانح، آثارِ علمیہ کے تعارف، افکار و خدمات کے تذکرے میں ایک ضخیم کتاب تالیف کروں اور اس سلسلے میں میں نے شروع ہی میں ایک منصوبہ بنایا تھا اور اس سلسلے کی ایک کتاب "امام الہند...... تعمیر افکار" لکھی تھی اور شایع بھی ہوئی تھی۔ لیکن خود اندازہ ہوا کہ اس میدان میں وقت سے پہلے قدم رکھ رہا ہوں، اس خیال کو محترم مشفق خواجہ صاحب نے اور پختہ کر دیا۔ انھوں نے کہا، آپ مولانا پر کتاب ضرور لکھیے لیکن فی الحال معلومات جمع کیجیے، پڑھیے۔ پختہ فکری اور وسعت نظر پیدا کیجیے، جذبات سے بلند ہوئیے۔ عقیدت کے سحر سے نکلیے، تنگ نظری دور کیجیے۔ مولانا پر لکھنے کا وہی وقت مناسب ہوگا جب آپ ان کاموں سے فارغ ہو جائیں گے! میں نے کہا، آپ کی سب باتیں درست لیکن میں جذباتی، عقیدت میں محصور اور تنگ نظر تو نہیں! بولے، "آپ جذباتی ہیں، آپ بسم اللہ کے گنبد میں بند

ہیں۔ ابوالکلام کے علم وفکر کے قدر آشنا نہیں، صرف عقیدت کے سحر زدہ ہیں۔ آپ کی یہ خصوصیات علمی زندگی کے منافی ہیں! میں نے دریافت کیا، آخر اس جذباتیت اور سحر زدگی کا کوئی ثبوت بھی ہے؟ بولے، یہ ''امام الہند'' کیا ہے؟ کتاب کا یہ نام کیوں؟ پاکستان میں آپ انھیں ''امام الہند'' منوانا چاہتے ہیں۔ لوگ خدا اور رسول کو نہیں مانتے، آپ ابوالکلام کو ''امام الہند'' کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ یہ تنگ نظری ہی نہیں حماقت بھی ہے۔ یہ جناح واقبال کا ملک ہے، یہاں کوئی شیخ الاسلام، امام الہند، امام انقلاب کی حیثیت سے سرسبز نہیں ہو سکے گا۔ اگر آپ کے عبید اللہ سندھی، حسین احمد مدنی، ابوالکلام علم وفکر اور سیرت وخدمات سے اپنے حریفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو آپ کے بخشے ہوئے خطابات ان کی شخصیت کی عظمت کو منوا نہیں سکیں گے۔ دنیا نے ہر دور میں صرف علم وسیرت کے سامنے سر جھکایا ہے، انسان کے بخشے ہوئے خطابوں کے سامنے نہیں! میں نے کہا، لیکن خواجہ صاحب کتاب کا یہ نام تو آپ کا پسندیدہ تھا، آپ کے مشورے سے رکھا گیا تھا اور اس کتاب کو آپ ہی نے چھاپا تھا، پھر اب کیا ہو گیا؟ ارے مولانا صاحب! میں اس سے کب انکار کرتا ہوں۔ اس وقت میں بھی آپ کی حماقت میں شریک تھا، لیکن اب نہیں! اور آپ کے لیے بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ بسم اللہ کے گنبد میں بند رہیں! اور پھر میں بھی اس گنبد سے نکل آیا۔ خواجہ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ ببلیوگرافیکل قسم کے کام اپنی اہمیت رکھتے ہیں، انھیں کم تر نہ سمجھیے۔

حالی نے چالیس سال کے مطالعے، مشاہدے، سرسیّد کی صحبت اور دور ونزدیک کے تجربات اور غور وفکر کے بعد ''حیات جاوید'' اسم بامسمّٰی تالیف کی تھی اور سلیمان ندوی نے اگرچہ حالی کی نقل میں ''حیاتِ شبلی'' لکھی تھی، لیکن سیّد صاحب کو شبلی کا جو قرب حاصل تھا، درس وتدریس کی مجلسوں سے لے کر سفر وحضر تک معیتیں اور صحبتیں نصیب ہوئی تھیں، انھیں ان کی نگرانی میں علمی کاموں کی جو تربیت ملی تھی، شخصیت کو سمجھنے اور ان کی تصنیفات سے، مصنف کی زندگی میں استفادے کے جو مواقع انھیں میسر آئے تھے اور شبلی کے تلامذہ اور معاصر اہل علم وقلم میں انھیں جو امتیاز حاصل ہوا تھا وہ آپ کو ابوالکلام، مولانا مدنی، مولانا سندھی وغیرہ کے باب میں کیوں کر میسر آ سکتا ہے۔ آپ کو ان بزرگوں کے قرب وصحبت سے فیض یاب ہونے کی سعادت میسر نہیں آئی، ان کے آثارِ علمیہ تک رسائی کے لیے تو ایک عمر چاہیے اور ان کے مآخذ تک پہنچنے کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں! ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ آپ مولانا پر کتاب لکھیں گے، اس کی اہمیت ہوگی اور شائقین اس کی

پذیرائی کریں گے۔ خواجہ صاحب مرحوم سے اس گفتگو نے میرے خیال کو اور پختہ کر دیا اور اس سلسلے میں مَیں نے کئی کام انجام دیے، ان پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے:

ا۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد: سب سے پہلے میں نے مکاتیب کی فراہمی سے کام کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۶ء تک ۴۴ حضرات کے نام ۱۶۸ مکاتیب ایسے حاصل ہو گئے تھے جو غبار خاطر، کاروانِ خیال، نقش آزاد، تبرکاتِ آزاد، ملفوظات آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خطوط و جوابات آزاد میں شامل نہیں تھے۔ بعض بزرگوں کو ان مکاتیب کی فراہمی اور ان کی اس خصوصیت کا علم ہوا تو ان کے مشورے کے مطابق انھیں مجموعے کی صورت میں مرتب کر دیا۔ ۱۹۶۸ء میں اسے اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے شایع کیا۔

۲۔ افاداتِ آزاد: میں نے اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ مزید خطوط کی تلاش کی مہم جاری رکھی۔ اس زمانے میں مولانا آزاد کے پرائیویٹ سیکریٹری محمد اجمل خان نے دہلی سے ''ملفوظات آزاد'' اور ''مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خطوط و جوابات آزاد'' کے نام سے دو مجموعے شایع کرائے۔ ان دونوں مجموعوں میں مولانا کے وہ تحریری یا زبانی جوابات تھے جو مولانا نے مذہبی، تاریخی، یا ادبی سوالات کے سلسلے میں دیے تھے اور اجمل خان صاحب نے اپنی ڈایری میں محفوظ کر کے مستفسرین کو جواب بھیج دیے تھے۔ ان مجموعوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں مستفسرین کے خطوط کے ساتھ ان کے پتے بھی تھے۔ میں نے ان پتوں پر خطوط لکھے اور اچھی خاصی تعداد میں مزید خطوط حاصل کر لیے اور ان دونوں کتابوں کے خطوط و جوابات کا ''افاداتِ آزاد'' کے نام سے ایک نیا مجموعہ مرتب کر لیا۔ اجمل خان صاحب اس وقت حیات تھے، ان سے اس پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی، آں مرحوم نے کرم فرمایا۔ میں نے ان کے مقدمے کے ساتھ یہ مجموعہ شایع کر دیا۔ ابھی چند ہی دن پہلے اس کا تیسرا ایڈیشن ترتیب و تدوین کے نئے قالب میں ڈھل کر متعدد اضافوں، تصحیح اور دیگر اہتمام کے ساتھ پورب اکادمی۔ اسلام آباد سے شایع ہوا ہے۔

۳۔ ابوالکلام آزاد (آثار و افکار): ۱۹۸۸ء میں مجھے ہندوستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ دہلی میں محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے ملاقات ہوئی۔ آں موصوف نے از راہِ کرم ایک مختصر لیکن نہایت اہم مکاتیب کا مجموعہ عنایت فرمایا۔ یہ ۱۹۱۲ء سے جنوری ۱۹۲۰ء تک محمد ابراہیم زکریا بھاگر، پوری۔ کے نام مولانا کے بیس یادگار خطوط تھے۔ خاکسار نے یہ مجموعہ ۱۹۹۰ء میں ''مطبوعات

آزاد صدی‘‘ کے سلسلے میں آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان کے زیرِ اہتمام بائیسویں مطبوعہ کی صورت میں شایع کیا تھا۔ ہندوستان میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے جرنل میں یہ خطوط بعد میں شایع ہوئے۔

۴۔ آثار و نقوش: یہ مولانا آزاد کے خطوط، فائلوں پر نوٹس، ہدایات وغیرہ پر مشتمل حضرت مولانا آزاد کی یادگار تحریرات کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ دو حصوں اور چند ضمیموں پر مشتمل ہے۔ آثار کے عنوان سے نیشنل آرکائیوز (نئی دہلی) میں محفوظ مولانا کی ۶۱۴ تحریرات ہیں۔ یہ تحریرات ’’آثارِ آزاد‘‘ کے عنوان سے آرکائیوز کے محترم ڈائریکٹر ڈاکٹر راجیش کمار پرتی نے شایع کردی تھیں۔ لیکن یہ مجموعہ جلد ہی نایاب ہوگیا اور بیرونِ ہند کے شائقین تو درکنار بہت سے ہندوستان کے اہلِ ذوق بھی اس کے مطالعے سے فیض یاب نہ ہوسکے۔ اس کا پہلا حصہ وہی ہے جو دہلی سے ’’آثارِ آزاد‘‘ کے نام سے شایع ہوا تھا۔ پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی نے خاکسار کی ترتیبِ جدید و تدوین میں اسے شایع کیا تھا۔ اس کے دوسرے حصے ’’نقوش‘‘ میں مولانا آزاد کی سترہ ہدایات و احکام ہیں جو انھوں نے انڈین کونسل برائے ثقافتی تعلقات (آئی سی سی آر) کے مختلف فائلوں میں تحریر فرمائے تھے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی متعدد تحریرات، ’’آج کل‘‘ یا ’’ایوانِ اُردو‘‘ دہلی کے آزاد نمبروں میں یا کسی اور جگہ شایع ہوئی تھیں، خاکسار نے مرتب کردی ہیں۔ حصہ سوم میں مسلم ویلفیئر بل اور اس پر مولانا کی رائے، کانگریس کے اجلاس مدراس (۱۹۵۵ء) میں مولانا کی ایک اہم تقریر اور ڈاکٹر کاٹجو، بھیم سین سچر اور پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مولانا آزاد کے نادر اور نہایت بیش قیمت خطوط ہیں اور شروع میں خاکسار کے قلم سے اس مجموعے کی اہمیت اور مولانا آزاد کی شخصیت اور سیرت کے مطالعے میں ان تحریرات کی افادیت کے بیان میں ایک مفصّل تحریر بہ طور مقدمہ ہے۔

یہ چند وہ چیزیں تھیں جو دستیاب ہوئیں اور ان کی اہمیت اور افادیت کے نقطۂ نظر سے مرتب کر کے شایع بھی کردیں۔ لیکن مولانا کے آثار و نقوش کی جستجو کا سب سے بڑا ذخیرہ مولانا کے وہ خطوط ہیں جو کئی سو حضرات کے نام ہزاروں خطوط کی شکل میں موجود ہے۔ یہ تمام غیر مرتب اور منتشر خطوط ہیں جو اخباروں، رسالوں، کتابوں سے اخذ کیے، جہاں وہ چھپے ہوئے تھے یا بعض اشخاص سے حاصل ہوئے ہیں۔ یہ ایک اندازے کے مطابق کم از کم دو ہزار صفحات کے کئی مجموعوں

میں شائع ہوں گے۔ ان مجموعوں میں غبارِ خاطر، نقشِ آزاد وغیرہ کے خطوط شامل نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے کا پہلا حصہ جس میں ۳۲ حضرات کے نام ۱۹۲۱ء تک کے تقریباً ۳ سو خطوط ہیں، خدا نے چاہا تو آیندہ چند ماہ میں شائع ہو جائے گا۔

خطوط کی جدید ترتیب میں میرے مرتبہ پہلے مجموعہ ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' کے مکاتیب بھی تاریخی ترتیب سے شامل ہو جائیں گے۔

۵۔ ارمغانِ آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد کے ابتدائی دور کے متفرق مضامین اور ان کے کلام پر مشتمل ایک مجموعہ ۱۹۷۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت بعض مضامین اور مزید دستیاب کلام کے اضافے کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں عمل میں آئی۔

۶۔ دیوانِ ابوالکلام آزاد: اسی زمانے میں ''ارمغانِ آزاد'' کا حصۂ نظم اس سے الگ کر کے ''دیوان ابوالکلام آزاد'' کے عنوان سے ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ (بہار) سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد نے اپنے نام سے چھپوالیا۔ افسوس کہ انھوں نے اس کی نئی کتابت کروانے، اس میں کتابت کی غلطیاں درست کروانے اور کچھ نیا کلام جو اس وقت تک دستیاب ہو چکا تھا، شامل کر لینے کی زحمت اٹھانی بھی گوارا نہیں فرمائی۔ ارمغان میں مطبوعہ کلام کا عکس چھاپ دینا اور ایک صفحے پر ''ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے شکریے کے ساتھ'' لکھ دینا کافی سمجھا۔ میرے لیے اس شکایت میں بھی یہ خوشی کا پہلو تھا کہ جہاں تک ''ارمغانِ آزاد'' کے ذریعے حضرت ممدوح مولانا آزاد کا نام نہیں پہنچ سکا تھا، وہاں بھی مرحوم کے نام کا ڈنکا بج گیا۔

۷۔ کلیاتِ آزاد: پہلے مولانا کا کلام ''ارمغانِ آزاد'' کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۹۷ء میں ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کی جانب سے تمام کلام ارمغان سے الگ کر کے ''کلیاتِ آزاد'' کے نام سے چھاپ دیا گیا۔ لیکن اس دوران مولانا آزاد کا جو مزید کلام دستیاب ہو گیا تھا، کلیات میں اسے بھی شامل کر لیا، نیز کلیات میں حوالے کی، کتابت کی یا دیگر جو غلطیاں واقع گئی تھیں، انھیں بھی درست کر دیا گیا۔

۸۔ لسان الصدق، کلکتہ (۱۹۰۳۔۵ء): ببلیو گرافیکل نوعیت کا ایک مزید اور نہایت اہم کام مولانا آزاد کے مشہور رسالے لسان الصدق کی عکسی اشاعت ہے۔ اس کی اس سے زیادہ کیا تعریف کی جائے کہ جو صاحبِ ذوق لسان الصدق کی ترتیب و تدوین، کتابت و طباعت

کے انداز کو اس کی اوّلین شکل میں مطالعہ کرنا چاہیں اور کسی محقق و نقاد کی تحریر اور تنقید و تبصرہ سے استفادے کے بغیر اپنے مشاہدہ و مطالعہ ہی پر اپنی رائے قایم کرنا چاہیں، ان کے لیے لسان الصدق کا زیرِ نظر عکسی ایڈیشن کفایت کرتا ہے۔

۹۔ **پیغام۔کلکتہ (۱۹۲۱ء):** خاکسار نے پیغام کا عکسی ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں ''مطبوعاتِ آزاد صدی'' کے سلسلے میں ''آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان'' کے زیرِ اہتمام شایع کیا تھا اور پاکستان میں اشاعت کے بعد اس کی پریس کاپیاں خدا بخش لائبریری، پٹنہ کو بھیج دی تھیں، جسے اس وقت کے ڈایریکٹر محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ایک نہایت قیمتی تحریر کے اضافے کے ساتھ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شایع کیا۔

۱۰۔ صحافت مولانا کی زندگی کا بہت اہم شعبہ تھا۔ اس میدان میں مصنفین اور محققین کی رہنمائی کے لیے ضروری تھا کہ مولانا کی صحافتی زندگی کا ایک ایسا خاکہ مرتّب کر دیا جاتا جس میں مولانا کا جن اخبارات و رسایل سے تعلق تھا، ان کی تاریخی ترتیب، ان کی فنی نوعیت، ان کے اجرا کے زمانے، اس کی انتظامی حالت اور اس سے مولانا کے تعلق اور خدمات کے بارے میں مستند ترین معلومات موجود ہوں تاکہ ریسرچ اسکالرز کے قدم ٹھوکر کھانے سے محفوظ ہو جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کی تالیف میں میرے پیشِ نظر یہی مقصد تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری سمجھا کہ وہ رسایل جو نایاب ہیں یا بہ آسانی دستیاب نہیں ہو سکتے اور ہر شایق کی دست رس سے باہر ہیں، ان کے مضامین تک اسکالرز کی رہنمائی کر دی جائے۔ ان تک رسائی حاصل کرنا بہر حال اسکالرز کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں لسان الصدق (۵۔۱۹۰۳ء)، البلاغ (۱۶۔۱۹۱۵ء)، پیغام (۱۹۲۱ء)، الجامعہ (۲۴۔۱۹۲۳ء) اور الہلال (۱۹۲۷ء) کے انڈکس مرتّب کر دیے ہیں۔ یہ تمام رسایل و جراید کلکتہ سے جاری ہوئے تھے۔ اس میں الندوہ (لکھنؤ) کا تعارف اور اس میں مولانا کے مضامین کی فہرست بھی شامل ہے، اب الندوہ تو زیرِ نظر کتاب ہی کا موضوع ہے۔ الجامعہ عربی کا رسالہ تھا۔ اس کے ضابطے کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی تھے اور مولانا ابوالکلام اس کے نگراں اور سرپرست تھے۔ آجکل دہلی کے آزاد نمبر ۱۹۸۸ء میں الجامعہ پر خاکسار کا ایک مفصّل مضمون ہے۔ اور 'ابوالکلام آزاد کی صحافت' میں اس کا ضروری تعارف اور مکمل انڈکس ہے۔ مولانا ابوالکلام کی صحافت کی زبان، اُسلوب اور فن کے بارے میں

کسی شخص کی کچھ بھی رائے ہو لیکن معلومات کے بارے میں کوئی اسکالر اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اِلا یہ کہ ہر رسالہ اس کی دست رس میں ہو اور مولانا کی صحافت کے مطالعے اور اس پر غور و فکر میں اس نے کم از کم چند سال بسر کیے ہوں۔

ان ابتدائی مضامین و کلام کے مجموعوں، ارمغان آزاد، کلیات آزاد، لسان الصدق، پیغام، افاداتِ آزاد، آثار و نقوش، آثار و افکار، مکاتیب اور ''ابوالکلام آزاد کی صحافت'' کی اشاعت کے بعد مجھے امید ہے کہ اب کوئی صاحب علم و قلم مفروضات اور قیاسات پر اپنی تحقیق و رائے کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔

۱۱۔ اس سلسلے میں ایک بہت بڑا کام مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبات، تقاریر، بیانات، پیغامات اور دیگر اہل علم کی تالیفات و تصنیفات پر مولانا کے قلم سے تعارف، پیش لفظ، دیباچے یا آرا ہیں جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ کئی کتابیں بن جائیں گی۔

ابوالکلامیات کے سلسلے میں مَیں نے چند ایسی کتابیں بھی ترتیب دیں اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جن کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ان کے مضمون نگاروں سے اچھے لکھنے والے موجودہ دور میں ڈھونڈے سے نہ ملیں گے۔ خالص ابوالکلام کے حوالے سے ان کے افادات کو مرتب کر دینا یقیناً خدمت شمار ہوگی۔ اس سلسلے میں اُردو اور انگریزی میں دو کتابیں وہ ہیں جو مولانا آزاد کے ایک عقیدت مند عبداللہ بٹ مرحوم نے مرتب کی تھیں اور ۱۹۴۳ء میں

۱۔ ''ابوالکلام آزاد'' اور

۲۔ ''آسپکٹس آف ابوالکلام آزاد''

کے ناموں سے شایع کی تھیں۔

اس سلسلے میں ایک کتاب خاکسار نے ''مولانا ابوالکلام آزاد ...... ایک شخصیت ایک مطالعہ'' کے نام سے ۱۹۶۷ء میں مرتب کی اور پہلے سندھ ساگر اکادمی، لاہور نے، اس کے بعد پروگریسو بکس، لاہور نے شایع کی تھی۔ ایک اور کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد ......ایک مطالعہ'' مرتب کی اور مکتبۂ اسلوب، کراچی سے شایع ہوئی تھی۔ ان تمام مجموعوں میں لکھنے والے بھی مولانا آزاد کے معاصرین، ان کے دوست، قریبی تعلق رکھنے والے حضرات ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب ان حضرات سے اچھے لکھنے والے نہیں مل سکتے۔ جس طرح ابوالکلام کو سمجھنے اور ان پر لکھنے کے لیے

ریسرچ اسکالرز کو مولانا کی ابتدائی تحریرات کی ضرورت ہوگی اسی طرح مولانا آزاد کے بارے میں موجود دور کے اصحاب علم وقلم کو رائے قایم کرنے سے پہلے مولانا کے معاصرین اور بہت قریبی تعلق رکھنے والے اہل قلم کے افادات سے استفادہ لازم قرار دے لینا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ان کی زندگی کے علمی، ادبی اور مذہبی آثار فراہم کرنے اور ان کی زندگی میں ان کے معاصرین کی تحریروں کو جمع کرنے کا جو عزم خاکسار نے کیا تھا اور جستجو کی جس راہ میں قدم اٹھایا تھا، اس راہ میں اب تک کسی مقام پر میرے قدم رک نہیں گئے۔ میں نے قریبی دور کے بعض اہل قلم اور علم واخلاص کا تعلق رکھنے والوں کی تحریروں کو ترتیب دینا بھی ابوالکلام پر تحقیق کی راہ کی ضرورت سمجھا۔ اس سلسلے میں دو کتابیں ''اُردو کا ادیب اعظم'' اور ''ابوالکلام وعبدالماجد ...... ایک ادبی معرکہ'' مرتب کیں۔ ان کا تعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے افادات ورشحاتِ قلم سے ہے، ایک کتاب مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی ابوالکلام آزاد کے متعلق تحریروں، تبصروں، شذروں، یادداشتوں اور تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی کا نام میرے دل سے فراموش نہیں ہوسکتا۔ مولانا آزاد سے ان کی عقیدت میرے لیے ایک مثال تھی۔ ان کے مطالعے اور مشاہدے کا حاصل اور مولانا کے بارے میں ان کے تاثرات وافادات کے مجموعے، ''مولانا ابوالکلام آزاد ...... ایک شخصی مطالعہ'' کی اشاعت بھی میرے پیشِ نظر مقصد کی ایک ضرورت تھی۔

میرے ذوق کی تربیت میں جن بزرگوں کا خاص حصہ ہے، ان میں مولانا غلام رسول مہر، آغا شورش کاشمیری اور پروفیسر ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، مرحوم مشفق خواجہ کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں۔ مولانا مہر کی حیثیت میرے لیے پیر ومرشد اور خضر راہ کی تھی، انھوں نے پاکستان میں مولانا آزاد کے مطالعے کا جواز پیدا کیا۔ شورش کاشمیری نے مولانا آزاد کی عبقریت کا ڈنکا بجایا اور ان کے مطالعے کی تحریک پیدا کی۔ میں نے اس کے متفرق ومنتشر مضامین کے مجموعے ''ہندوستان میں ابن تیمیہ'' کی ترتیب واشاعت سے اپنی عقیدت کا اظہار ہی نہیں کیا، بلکہ تحقیق کی ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ محترم ڈاکٹر شروانی کی حیثیت میرے لیے استاد کی سی ہے، میں نے ان کی تحقیق، ان کی رائے، ان کے افادات وتحریرات سے ہمیشہ استفادہ کیا۔ کبھی کسی بات میں ان سے آگے نکلنے کا خیال دل میں نہیں آیا۔ حضرت موصوف نے میری رہنمائی کی، میرے اغلاط

پر مجھے ٹوکا، ہمت افزائی کی اور میرے کاموں کو سراہا۔ ان کے مقالات و مضامین کے مجموعے، ''میرِ کارواں مولانا ابو الکلام آزادؔ'' کی ترتیب و اشاعت سے اپنے لیے اور دوسرے محققین و مصنّفین کے لیے رہنمائی کا سروسامان کیا ہے۔ وہ میرے محسن ہیں۔ ابوالکلامیات میں میرا درجہ اگر ان کے شاگرد اور خوشہ چین کا تسلیم کرلیا جائے تو یہ میرا بڑا اعزاز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سر پر قایم رکھے۔

ابوالکلامیات کے باب میں جن کاموں کو میں نے اوّلیات کے درجے میں رکھا تھا، اس کے اوّلین کاموں میں الندوہ، لکھنؤ میں مولانا آزاد کی تحریروں کی ترتیب وتدوین تھی۔ اگرچہ اس کام کی باری بہت دیر میں آرہی ہے۔ الندوہ سے تعلق کا زمانہ مولانا کے علمی سفر کی درمیانی منزل تھی اور ارتقاے علم وفکر کا درمیانی عہد! وہ ابھی حصول علم وتجربہ کی منزل میں تھے۔ ان کے علمی عروج کا زمانہ بعد میں آیا۔ اگرچہ وہ مقام اس وقت سے زیادہ دور نہیں تھا۔

آیندہ چند برسوں میں وکیل امرتسر کی ادارت کے تجربے کے بعد وہ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئے تھے جہاں سے ان کی علمی زندگی کا وہ دور شروع ہونے والا تھا جس میں انھیں اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں اپنی اختیار کردہ راہ پر چل کر خود اپنے متعین کردہ نصب العین کے حصول اور مقصد کے لیے جینا مرنا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے جو رسایل جاری کیے تھے ان کی ادارت سے، اور بعض میں اپنے تعلقات کی بنا پر شریک ہوکر علم وصحافت میں شوق وتربیت کی جو زندگی گزاری تھی، اس سے بھی انھیں علمی وادبی دنیا میں ایک خاص حد تک شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس دور کا سب سے اہم جریدہ لسان الصدق (۵-۱۹۰۳ء) تھا۔ یہ ان کا ذاتی رسالہ تھا۔ اس کی ادارت کی پوری ذمہ داری انھی پر تھی۔ اس ذمے داری اور اس کے کاموں میں کوئی دوسرا شریک و دخیل نہیں تھا۔ اس کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہوا کہ وہ اعتماد جو ان میں نیرنگ عالم اور المصباح کی ادارت نے پیدا کردیا تھا، اس میں پختگی آئی اور اس کے ذریعے ان کی شہرت ملک کے علمی حلقوں تک پھیل گئی۔ لیکن ان رسایل کا اور ان کے بعد لسان الصدق کا کوئی علمی وصحافتی ماحول نہیں تھا۔ ان کے چند دوست تھے، جن سے ان کا صبح وشام کا ملنا جلنا تھا۔ اس کے برعکس الندوہ ایک علمی درس گاہ کا ترجمان تھا۔ ندوۃ العلماء ایک علمی، تعلیمی، اصلاحی کل ہند ادارہ تھا، اس کا دار العلوم تھا، جس میں درس وتدریس کا ہنگامہ برپا

تھا، پورے ملک کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ علامہ شبلی کے لکھنؤ آجانے کے بعد ایک مستقل علمی فضا پیدا ہوگئی تھی، طلبہ میں درس وتعلیم کے ساتھ تحقیق وتصنیف اور علمی مباحث و مذاکرات کی سرگرمیاں پیدا ہوگئی تھی، ان میں علمی ذوق کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ اب روز وشب علمی صحبتیں گرم ہوتی تھیں، علوم وفنون کے چرچے، بحث ونظر کے ہنگامے اور مذاکرے ہوتے تھے۔ کلکتہ اور بمبئی میں ابوالکلام کو یہ ماحول میسر نہ تھا، کسی صاحبِ علم ومطالعہ کا ذہن اس قسم کے گرد وپیش اور ماحول کے بغیر نہیں کھلتا۔ کلکتہ میں ۱۹۰۱ء میں ندوے کے سالانہ جلسے کے انعقاد نے بحث ومذاکرات کا جو ماحول اور سرگرمی پیدا کردی تھی، جس کا ذکر خود مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا ہے، اس قسم کا ماحول روز کا معمول نہ تھا، لکھنؤ میں یہ ماحول اور علمی صحبتیں ہر وقت میسر تھیں۔ اس ماحول سے ابوالکلام نے یقیناً فایدہ اٹھایا، ان کا ذہن کھلا، انھیں اپنے اوپر کامل اعتماد پیدا ہوا۔ حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی نے جو لکھا ہے کہ ندوے کی صحبتوں نے انھیں مولوی سے مولانا ابوالکلام بنادیا، تو یہ بالکل غلط نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شبلی نے انھیں علم کا کوئی نسخہ گھوٹ کر پلادیا تھا۔ یا فن دانش مندی کا کوئی سبق انھیں پڑھایا تھا۔ لیکن جو ماحول اور علمی فضا لکھنؤ میں تھی اس کے بھی حدود تھے، یہ زندگی قواعد وضوابط کی پابند تھی۔ یہاں کی ایک تہذیب تھی۔ تہذیبی زندگی آداب ورسوم کی پابند ہوتی ہے۔ مولانا ابوالکلام کی زندگی کا یہ وہ دور تھا، جب وہ فکر وعقیدہ کے ایک انقلاب سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر کی ایک مرتب تہذیبی زندگی کے خلاف بغاوت کی تھی اور ابھی تک انھیں ردعمل کی زندگی کی بے چینیوں سے نجات نہ ملی تھی، ان کے فکر وعقیدہ نے ابھی سکون وطمانیت کی کوئی کروٹ نہ لی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے، وہ لکھنؤ کی زندگی کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکے اور چھ مہینے گزرنے سے پہلے ہی انھوں نے امرتسر کی آزاد فضا کو تلاش کرلیا، جہاں کسی فلسفہ وتہذیب کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اب انھوں نے جو زندگی تلاش کی تھی، اس میں وہ آزاد وخودمختار تھے۔ ان سے کسی بات کی کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا، یہ ایک دایرے کی محدود ومختصر زندگی تھی، اس میں کوئی سازشی اور بدطینت نہ تھا۔ ان کے گرد وپیش جتنے چہرے تھے سب معمول اور حکم بجالانے والے تھے، امرتسر میں مولانا ایک نئے تجربے سے گزرے تھے۔ یہ ان کے شوق وتربیت کے دور کی آخری منزل تھی۔ لیکن افسوس کہ اس زندگی کا کوئی نقش اور کوئی اثر بھی تو ہمارے سامنے نہیں۔ ۱۹۰۶ء میں اور چند ماہ کے وقفے کے بعد ۸-۱۹۰۷ء میں خاصہ عرصہ انھوں نے وکیل میں گزارا۔ لیکن اس دور

کے ایک شمارۂ وکیل کا بھی تو ہندوستان پاکستان کے کسی ذخیرۂ علمی میں ابھی تک پتا نہیں چلا۔ حال آں کہ مولانا کی بعض تحریروں سے بعض مضامین و مباحث اور شذرات کا پتا چلتا ہے، اگر وکیل دستیاب ہوتا تو بہت سے مضامین کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ وکیل کے وہ خود مختار ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے کتنی ہی احتیاط کے ساتھ اداریے لکھے ہوں لیکن سیاست، مذہب، تعلیم، رسوم وغیرہ میں ان کے افکار اور اُسلوبِ تحریر کی بنا پر ان کی پچاسوں تحریروں کی نشان دہی کی جا سکتی تھی۔ لیکن افسوس کہ ۱۹۰۷ء کے نصف آخر سے ۱۹۰۸ء کی دو تہائی گزرنے تک کی زندگی پر ایسا دبیز پردہ پڑا ہے کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتا اور ہماری نظریں ایک حقیقت کے نظارے کی آرزو میں پردے سے ٹکراتی ہیں اور مایوس لوٹ آتی ہیں۔ آیندہ کوئی کرشمہ ظہور میں آجائے تو یہ نہ صرف ابوالکلام کی حیاتِ علمی کا بہت بڑا انکشاف ہوگا، بلکہ صحافت، سیاست اور براعظم ہند پاکستان کی تاریخ عمومی کے ایک دور کے فتح باب کا عجوبہ قرار پائے گا۔

اس وقت ابوالکلام کے حوالے سے جو آثارِ علمیہ ہمارے سامنے ہیں، ہم پہلی ہی نظر میں دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ایک سپاٹ اور ایک یا دو پہلوؤں کی جامع شخصیت کے آثار نہیں ہیں بلکہ یہ ایک جامع جہات اور متنوع ذوق کی حامل شخصیت کے افکار اور مطالعہ و تحقیق کا حاصل ہیں۔ اگر چہ وہ بعض پیش کردہ افکار اور تحقیقات سے بعد میں غیر مطمئن ہو گئے تھے، جیسا کہ محمد یونس خالدی مرحوم کے خط کے جواب میں المراۃ المسلمہ کے مصنف فرید وجدی مصری کے پیش کردہ بعض خیالات سے انھوں نے عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اور اپنی اس رائے میں اس درجہ شدید تھے کہ المراۃ المسلمہ پر اپنے تبصرے کی تکمیل اور ۱۹۰۶ء میں وکیل بک ایجنسی، امرتسر سے کتابی شکل میں ''مسلمان عورت'' کے نام سے چھپوانے کے بعد پھر کبھی نہ خود اسے شایع کیا، نہ کسی اور کو اس کی اشاعت کی اجازت دی! لیکن یہ بات صرف مسلمان عورت (المراۃ المسلمہ) ہی کے بعض افکار کے بارے میں کیوں کہی جائے؟ مولانا کی زندگی میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک عقاید و اعمال کی شکست وریخت کا جو عمل ہوا تھا، اس میں کون سی ایسی بات ہے جو اپنی پہلی حالت میں رہ گئی تھی۔ مذہب اور اس کے اصول و فروع، سیاست اور اس کے انداز و مقاصد، تعلیم اور اس کی غرض اور نصاب و نظام اور سماجی زندگی کے سیکڑوں مسایل ہیں، جن میں مولانا نے زمانے کی روش پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر بعد میں مولانا کے خیالات میں کوئی انقلاب آیا تھا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہو سکتی!

ہمیں معلوم ہے کہ کتنے ہی مسایل میں ان کی رائے ابنائے زمانہ سے مختلف تھی۔ عورت مرد کی مساوات، عورت کی آزادی، حقوق، پردہ، تعلیم، اس کے سوسایٹی میں مقام، اس کی زندگی کے دایرۂ کار کے بارے میں وہ مغرب اور مشرق کے اہل علم ونظر سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ ہم اسی مقام پر المراۃ المسلمہ پر تبصرے میں ان کے کسی جملے پر کوئی فتویٰ نافذ کردینا نہیں چاہتے۔ جب ان پر تحقیق اور کسی فیصلے کا وقت آئے گا تو ہم حضرت مولانا کے افکار کے ضروری اور اہم ماخذ؛ الہلال، البلاغ، ترجمان القرآن، ان کے خطبات، خطوط، مقالات کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان سے استفادہ کریں گے اور نہایت تفحص اور غور وفکر کے بعد کسی نتیجے تک پہنچیں گے۔ یہ مقام مولانا ابوالکلام کے ایمان وعقیدہ کا فیصلہ کردینے اور کسی رائے کے غلط اور صحیح کے تجزیہ وتحقیق کا نہیں، الندوہ میں ان کے مضامین کی ترتیب وتدوین اور اہل علم ونظر اور اصحابِ ذوق کے سامنے پیش کردینے کا ہے! ایک ایسا شخص جس نے اس تاریخ کے بعد بھی پچاس برس سے زیادہ طویل علمی، ادبی، سماجی، سیاسی، مذہبی زندگی گزاری ہو اور اپنے پیچھے بیسیوں مجلدات اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اپنے افکار وافادات کا ذخیرہ یادگار چھوڑ گیا ہو، اس کی کسی ایک تحریر وبیان پر کیوں کر فیصلہ کردیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مضامین ومقالات اور نقد وتبصرہ کی تالیف واشاعت کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مولانا نے ساٹھ سال کی بھرپور ادبی، علمی، سیاسی، مذہبی زندگی گزاری تھی، وہ زمانے کے مختلف نشیب وفراز سے اور ذہن وفکر کے انقلابات سے گزرے تھے، جب وہ ندوہ پہنچے تھے تو ان کی رسمی تعلیم سے فراغت پر کامل تین سال گزر چکے تھے، اس وقت ان کی زبان وبیان، اُسلوبِ تحریر ونگارش، ذوق وفکر، مذہبی سماجی رجحانات، ان کے علم، ان کے شوق، ان کے سیرت کے خصایص، ان کے ذہن کی نشو ونما اور زندگی کے اٹھان کا کیا عالم تھا۔ ان کی زندگی، اس کے اطوار اور مشاغل کی روشنی میں ان کے مستقبل کے بارے میں کیا پیش گوئی کی جاسکتی تھی۔ علمی تحقیقات میں بچپن کی تعلیم وتربیت اور ابتدائی ماحول کی دریافت کی اہمیت پہلے بھی تھی، اب ذہنی ارتقاء کی رفتار وانداز کی جستجو کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت چھوٹی عمر میں اپنے خاندان کے رسوم وروایات سے بغاوت کی تھی، اس لیے ان پر تحقیق میں ان امور کی خاص اہمیت ہے۔ اگر الندوہ میں مولانا کی

تحریرات ترتیب واشاعت کے ذریعے جامعات کے اساتذہ تک نہ پہنچادی جائیں تو وہ اس باب میں اپنے تلامذہ کی کیا رہنمائی کرسکیں گے اور ریسرچ اسکالرز کی ان تحریروں تک رسائی ممکن نہ ہوتو وہ غور وفکر کے بعد کیوں کر صحیح نتیجے نکال سکیں گے؟ ابوالکلام کے کسی فکر وعقیدے کے بارے میں ہمیں آج ہی فیصلہ نہیں کردینا ہے، اس میں محققین کو مطالعے اور تحقیق کے کئی مشکل مقامات اور غور وفکر کی کئی آزمایشوں سے گزرنا پڑے گا۔ تب کہیں وہ حقیقت کا سراغ لگانے میں کامیابی سے سرخ رو ہوسکیں گے۔

شاید میں اس تحریر میں اپنے مقصد کو پیش کرنے میں ناکام رہا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ فاضل قارئین میرے منشا کو پالینے سے قاصر نہ رہیں گے۔ وہ یقیناً اس کام کی افادیت کو محسوس کرلیں گے۔ اگرچہ الندوہ میں مولانا ابوالکلام کے مضامین کی ترتیب وتدوین کے ذریعے میں نے اپنے مقصد میں ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے، لیکن مولانا کے رشحات قلم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آں مرحوم کی علمی ادبی زندگی کے آغاز سے الہلال کے اجرا تک تقریباً بارہ برس کے اخبارات ورسایل میں مدفون ہے اور اپنے ظہور کے لیے کسی صاحب ہمت کی توجہ کا منتظر ہے۔ اگرچہ اخبارات ورسایل کی بازیابی میں روز بہ روز اتنی مشکلات پیدا ہوتی جارہی ہیں کہ مقصد کا حصول ناممکن بنتا جارہا ہے۔ ایک افسوس ناک صورتِ حال یہ پیدا ہوگئی ہے کہ طلبہ محنت سے جی چراتے ہیں اور اساتذۂ کرام ان سے محنت کروانے سے عاجز آجاتے ہیں۔ اوّلاً موضوعات تحقیق کے انتخاب میں مواد کی فراہمی میں سہولت پیشِ نظر رہتی ہے، محنت طلب موضوعات کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی جو علمی کام انجام پاتے ہیں، وہ تحقیق کے اعلیٰ معیار سے بہت کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں بعض عذرات بھی ہیں جنھیں ہم بالکل نظر انداز نہیں کرسکتے، لیکن ان پر بحث ونظر کا یہ موقع نہیں۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

حرفِ اوّل

(۱)

بیسویں صدی کے اُردو ادبی منظرنامے پر جن لوگوں کی طلائی حرفوں میں کندہ سحرکار لوحیں جگمگا رہی ہیں اور ہمیشہ ضیا بار رہیں گی، ان میں ایک ناقابلِ فراموش اور حافظہ گیر نام مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کا ہے۔ آزاد ایسی بے مثل شخصیت تھے جن پر بہ سہولت ''نابغۂ روزگار'' کی ترکیب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اُردو میں کم شخصیتیں ہوں گی جن پر جامعیت کا حرف صادق آتا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، جدید و قدیم فلسفہ، علوم عمرانی، موسیقی، شعروادب سب پر ایسی عالمانہ اور مجتہدانہ نظر تھی کہ اس باب میں برعظیم کے گنے چنے لوگ ہی ان کے حریف ہو سکتے ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی شعروادب کا ایسا عمدہ رچا ہوا ذوق اور حافظے کے خزانے میں ہزاروں بے نظیر و برمحل شعروں کا غدر مچاتا ہوا ایسا حیران کن اجتماع ہماری ادبی دنیا کا ایک نادر وقوعہ ہے۔ اپنے اعلیٰ شعری انتخاب کے سبب مظہر جانِ جاناں کی ''خریطۂ جواہر'' اور شبلی کی شعر العجم کے بعد غبار خاطر کے مکتوباتِ انشائی میں شعر اور خصوصاً فارسی شعر کے وجد آور نظم و اہتمام نے کئی نسلوں کے ذوقِ شعری کی تربیت اور آبیاری کی ہے۔ ابوالکلام کا تنہا یہی احسان ایسا ہے جو بھلایا نہ جا سکے گا۔ علاوہ ازیں انھوں نے خطابت اور صحافت کو بھی ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ دیا۔ آخر الہلال کے رجزیہ آہنگ اور صاعقہ بار اُسلوب کو کیسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے جس نے برطانوی استعمار کے قلعے میں دراڑیں ڈال دی تھیں اور جس نے برعظیم ہندو پاکستان میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کا ولولہ بیدار کیا تھا۔ مولانا صرف نام کے آزاد نہ تھے، واقعی مردِ آزاد، مردِ حر تھے، سرو و سوسن کی طرح کس شان سے زندگی گزار دی:

آزادہ رواں را خطراز دَورِ جہاں نیست
رہزن بہ کجا قافلۂ ریگِ رواں زد!

ہوا کے جھونکے کی طرح کچھ عرصہ شعر گوئی کے چمن سے بھی گزرے۔ جم کے شعر کہتے تو اس اقلیم میں بھی اپنا دائمی نقش ثبت کرتے۔ آخر ان کے اس طرح کے شعر کیوں کر بھلائے جا سکتے ہیں:

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

ہر موجِ معانی کہ زِجیحونِ دلم خاست
تا ساحلِ لب آمدہ، برتافت عناں را

حق یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد ہمارے لیے ایک نام نہیں، ایک تاریخ، ایک علامت ہیں۔ ان کی شخصیت نے مختلف علمی رستوں میں حائل کئی سنگِ راہ ہٹائے اور متعدد اہم سنگِ میل نصب کیے۔ جد وجہاد کی یہ داستان دراصل کوہ کنی، سنگ زِدائی اور راہ نمائی کی ایک ایسی ایقان افروز اور عشق انگیز کہانی ہے، جس کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان کے بعض اجتہادات خصوصاً سیاسی تفکرات ومزعومات سے اختلاف بھی کیا گیا اور اس کی آج بھی گنجایش ہے مگر اس کے بیان کا یہ محل نہیں۔

(۲)

ایک ایسی شخصیت جس میں جامعیت اور ہمہ گیری کی ایسی شان ہو جس کی جانب اوپر اشارہ کیا گیا، اس اَمر کی متقاضی ہے کہ اس کی زبان سے نکلے ہر قول اور اس کے قلم کی ہر جنبش کو محفوظ کر لیا جائے تا کہ ایک ایسا وقت آئے کہ اس سرمائے کی کامل جمع آوری کے بعد اس کا اور اس کے کارناموں کا بے لاگ اور ہمہ گیر تجزیہ کیا جا سکے۔ پاکستان کے ممتاز دانش ور اور ابوالکلام آزاد سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے ادیب جناب ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنے آپ کو کم وبیش ابوالکلامیات کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ ایک سچے نقاد اور ادبی پرکھ کرنے والے ادیب کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ کسی اہم لکھنے والے کی ہر تحریر، وہ متقدم ہو یا متاخر، محفوظ کر لینے کے

لایق ہے تا کہ اس کے اُسلوب اور فکری ارتقا کی سچی اور مکمل تصویر پیش کی جاسکے۔ آزاد کے احوال و آثار سے ان کی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ وہ کم و بیش چالیس بیالیس برس سے ان کی فکر سے وابستہ اور ان کی غیر مدوّن تحریروں کی جمع و تدوین میں مشغول ہیں اور اب تک حواشی، تعلیقات اور ضروری توضیحات کے ساتھ مولانا کی دسیوں تحریریں کتابی شکل میں چھاپ چکے ہیں۔ ان کے عشق کا ایک مظہر ''ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان'' کا قیام ہے جو ان تحریروں کی طبع و اشاعت کا ایک اہم مرکز بن چکا ہے۔ یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ دونوں کے ادبی ناموں کا سابقہ ''ابو'' ہے۔ ابوالکلام سے ابوسلمان تک یہ اتحادِ لفظ و معنی بہر حال ایسی چیز نہیں جس سے صَرفِ نظر کیا جا سکے۔

(۳)

پیشِ نظر کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مضامین و مقالات اور شذرات پر مشتمل ہے جو اپنے زمانے کے نہایت پُر ارزش علمی مجلّہ ''الندوہ'' میں شایع ہوتے رہے۔ ان میں ایک مقالہ ''مرحوم علامہ شبلی نعمانی...... حیات علمی و ادبی پر ایک سرسری نظر'' ایسا بھی ہے جو البلاغ کے ۱۹۱۵ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا، شاہ جہان پوری صاحب نے اسے بھی اپنے مقدماتی مباحث میں شامل کر لیا ہے۔

ماہنامہ ''الندوہ'' ندوۃ العلماء لکھنؤ کا علمی ترجمان تھا اور ندوے کی روحِ رواں علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ ابوالکلام اس کے معاون مدیر بننے کی ذمہ داری قبول کریں۔ سبب یہ تھا کہ طرفین میں کئی برس پہلے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ نیز شبلی آزاد کے جاری کردہ نیرنگ عالم (گلدستہ)، المصباح اور لسان الصدق وغیرہ کے ذریعے ان کے غیر معمولی علمی ذوق اور دقیقہ رس مزاج سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ ''خدنگ نظر'' میں ابوالکلام کے شایع ہونے والے مضامین بھی ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ وہ ایک موقع پر آزاد سے کہہ چکے تھے، ''تمھارا ذہن و دماغ تو عجائبِ روزگار میں سے ہے!'' مختصر یہ کہ آزاد نے شبلی سے اپنی غیر معمولی عقیدت اور مؤخر الذکر کے اصرار کے پیشِ نظر اکتوبر ۱۹۰۵ء میں الندوہ کے معاون مدیر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی اور قریباً چھ سات ماہ تک اس کی ادارت کے فرایض انجام دیتے رہے۔ آخری پرچہ مارچ ۱۹۰۶ء میں مرتب کیا اور گمانِ غالب ہے کہ اپریل کا شمارہ بھی انھی کی کاوش سے مرتب ہوا ہو۔ الندوہ کی نائب ادارت

کے زمانے میں آزاد کے متعدد مقالے اور شذرے اس ماہنامے میں شائع ہوئے۔ ادارت سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کے بعض مقالے الندوہ کی زینت بنتے رہے۔ مثلاً ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی'' اور ''ندوۃ العلما کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود'' وغیرہ۔ مراد یہ ہے کہ شبلی اور ان کے علمی کارناموں سے نیز ان کے غیر معمولی شعری ذوق اور متعدد دیگر اوصاف ومحاسن سے گرویدگی کے باعث آزاد کی ان کے علمی مجلے سے بھی گہری ذہنی مقاربت رہی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آزاد کے منفرد اُسلوبِ تحریر کے خدوخال متعین ہونے لگ گئے تھے اور مستقبل میں الہلال کے عہد ساز پرچے کا آغاز ہونے والا تھا، لہٰذا الہلال سے قبل کی تحریروں میں الندوہ میں آزاد کے شائع شدہ مقالات وشذرات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تحریریں اگرچہ زیادہ تر ۱۷ سے ۲۲ سال تک کی عمر میں منصۂ ظہور میں آئیں مگر ان میں وہ اٹھان دکھائی دیتی ہے جو الہلال میں خاص پختگی کو پہنچ کر بعدازاں البلاغ کی تحریروں اور غبارِ خاطر میں اپنے ترفع کی انتہائی منزلیں طے کرلیتی ہے۔ یہ مضامین دراصل آزاد کے اس رفیع الشان اُسلوب کا، جو سادگی اور پرکاری کا بے مثل جامع ہے اور فی نفسہٖ ناقابلِ تقلید ہے، نقشِ اوّل ہیں۔

پیشِ نظر کتاب میں شامل آزاد کے ان مضامین سے بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں کیسی بالغ نظری سے نوازا تھا اور وقت کی علمی رفتار کا کیسا بالیدہ شعور بخشا تھا۔ یہ تحریریں آزاد کی وسعتِ مطالعہ، وسیع النظری، دردمندی اور اٹوٹ علم دوستی کی مظہر ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اسلام ماضی میں اہلِ عالم کے لیے کس قدر فیض رساں رہا ہے اور آج ملّتِ اسلامیہ کو کیسے علماء مطلوب ہیں۔ مثلاً ان کے مقالے ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی'' ہی کو دیکھ لیجیے، یہ مقالہ زوال آمادہ مسلم ملّت کے لیے ایک تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے، مسلم ملّت کے عروج کے بعد زوال پذیر ہونے اور اہلِ یورپ کے ذریعے مسلمانوں کے علمی خزائن کی تحفیظ واحیا کی کوششیں اس عبرت زا مقالے کا موضوع ہیں۔ یورپ عربی زبان اور علم عربی سے کب متعارف اور ان کی جانب کب متوجہ ہوا، صرف ونحو اور لغت وادب سے متعلق کون کون سی قابلِ ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں مرتب ہوئیں، ان کا ذکر مذکورہ مقالے میں ملے گا۔ صلیبی جنگوں کا مثبت اثر یہ ہوا کہ یورپ کو مسلمانوں کے علوم اور ثقافت وتمدن سے براہِ راست تعارف اور فیض اندوزی کا موقع ملا۔ اسی مقالے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مغرب سے مشرق کی طرف اوّلین قدم مذہبی پیشواؤں کا تھا جو یورپی عوام الناس کے برعکس

تعلیم یافتہ تھے۔ اس اوّلین پیش قدمی کا ایک باریک پہلو وہ بھی ہے جس کی نشان دہی حکیم الامت حضرتِ اقبال نے کی تھی اور جس میں گویا استشراق کی پوری روح کھنچ آئی ہے:

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر ان کی
تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسیا کے سفیر

(ضربِ کلیم)

گیارھویں صدی سے مغرب کی توجہ مسلم علوم کی جانب ہوئی اور چودھویں صدی تک مسلم فلسفے کی تمام کتابیں لاطینی میں ترجمہ ہوچکی تھیں۔ بعض لغت کامل پچاس برس کی محنت سے تیار ہوئے، آزاد کے اس مضمون سے اہلِ یورپ کے ناقابلِ تسکین علمی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کے دیگر قابلِ ذکر مقالات میں ''یورپ میں گونگوں کی تعلیم''، ''المراۃ المسلمہ'' اور ''ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت'' ہیں، علاوہ ازیں ''علمی خبریں'' کے زیرِ عنوان فراہم کردہ معلومات بھی سو برس قبل کے برعظیم کے اہلِ علم کے لیے بہرحال نہایت تازہ اور چشم گیر تھیں گو کہ آج یہ معلومات بہت پرانی ہوچکیں۔ المراۃ المسلمہ میں فراہم کردہ معلومات کا سرچشمہ فرید وجدی مصری کا اسی عنوان کا مضمون ہے جسے آزاد نے اُردو ترجمے، تبصرے اور اضافے کے ساتھ تالیف کا درجہ بخشا ہے، اس مقالے میں دلائل کا اُسلوب اور معلومات کی پیش کش آج بھی قاری کے لیے خاصی قابلِ توجہ ہے۔

''ندوۃ العلما میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت'' کے زیرِ عنوان آزاد نے بڑی دردمندی سے ندوے کے لیے ایک بڑے کتب خانے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ اسی مقالے میں انھوں نے علاوہ اور باتوں کے امین رازی کے تذکرۂ شعراے فارسی ''ہفت اقلیم'' کا بھی ذکر کیا ہے جو مخطوطے کی شکل میں ندوے کی لائبریری میں موجود تھا اور اس مقالے کی تحریر تک غیر مطبوعہ تھا۔ ۱۵۶۰ فارسی شعراء، فضلاء اور امراء و ملوک کے ذکر پر مبنی یہ تذکرہ آج سے چارسو چھبیس برس پہلے ۱۰۰۲ھ میں لکھا گیا تھا۔ ''تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان'' (سیّد علی رضا نقوی) میں فاضل مدوّن نے متعدد قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے، مگر اس میں ندوے کے مخطوطے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ تذکرہ اوّلاً کلکتے سے تین جلدوں میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ایران سے شائع ہوا، تذکرے کا مؤلف امین رازی رَے میں متولد ہوا۔ جہانگیر کی اہلیہ نور جہاں بیگم کا والد اعتمادالدولہ

غیاث بیگ امین رازی کا چچا تھا۔

اس مجموعۂ مقالات کا ایک خاصا مفصل مضمون ''ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہ مقصود'' ہے۔ اپنے مباحث اور زبان و بیان کے اعتبار سے اسے بھی آزاد کی مؤخر تحریروں کا پیش رَو کہنا چاہیے، بہ ظاہر تو یہ ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی کی روداد ہے، مگر اس میں جگہ جگہ آزاد نے ادبی چاشنی کا جادو جگایا ہے۔ علامہ شبلی ندوے کے قیام سے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور ان مقاصد کے پسِ منظر میں ان کی کیسی وسعت نظر، روشن فکری اور کیا مجتہدانہ سوچ کارفرما تھی، اس کا بخوبی اندازہ اس روداد سے ہوتا ہے۔

ندوے کا ایک خاص امتیاز طلبہ میں عربی زبان سے ایک گہرے لگاؤ کی تولید بھی تھا۔ پھر صرف عربی زبان ہی میں قدرتِ اظہار نہیں بعض طلبہ کو بھاکا میں بھی مؤثر اظہارِ خیال کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ اسلام کے لافانی افکار سے غیر مسلم بھی استفادہ کر سکیں۔ اس روداد میں آزاد نے ایک نوجوان طالب علم سیّد امداد حسین کا بھی ذکر کیا ہے جو عربی اور سنسکرت دونوں پر قادر تھا۔ اس نے نہ صرف بھاکا میں نہایت مؤثر تقریر کر کے سماں باندھ دیا، بلکہ سورۂ الرحمٰن کے ایک رکوع کی تلاوت کر کے بھی سامعین کے قلوب کو مسخر کر لیا۔ آزاد نے اپنے سحر کار قلم سے سیّد امداد حسین کا اَنمٹ نقش ہمارے دلوں پر ثبت کر دیا ہے:

> ''سیّد امداد حسین سورۂ الرحمٰن کا پہلا رکوع اپنی مؤثر آواز اور جگر دوز لہجے میں تلاوت کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ کیا یہ صاعقہ اثر آواز جو ہمارے دلوں کو دو نیم اور آنکھوں کو دجلہ ریز کر رہی ہے، وہی صدائے جاں نواز ہے جو کبھی ریگستان عرب کے ٹیلوں اور تودہ ہائے ریگ پر بجلی بن کر چمکی، کبھی غارِ حرا کی تاریکی میں تجلیِ حق بن کر نور افشاں ہوئی، کبھی فاران کے قلہ ہائے بلند پر ابرِ رحمت بن کر برسی، کبھی مشرق و مغرب کے ظلمت کدے پر آفتاب بن کر طلوع ہوئی اور اب ایک لٹے ہوئے کارواں اور برباد شدہ قافلے کے لیے رہنمائی کا سہارا اور امید کی روشنی ہے۔''

اس رپورتاژ نما تحریر میں آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ عہدِ جدید کی ضرورت نے کس قسم کے علمائے اسلام کی طلب پیدا کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۰ء کی اس تحریر میں جو ضرورت محسوس کی گئی

تھی وہ آج کے نہایت پر آشوب عہد میں شدید تر اور سنگین تر ہوگئی ہے، اس روداد میں دہلی مرحوم کا ذکر جس تاثیر آمیز اور حسرت آثار رنگ میں کیا گیا ہے اور حکمت کے موتی جس حسن اور سلیقے سے جا بجا ٹنکے نظر آتے ہیں وہ خود آزاد کے مؤخر اُسلوب کے نقش اوّل قرار دیے جاسکتے ہیں۔ دیکھیے کس سہولت سے کیسی پتے کی بات کہہ گئے ہیں:

الف: ''انسانی غلطیوں میں سب سے زیادہ نقصان رساں اور عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ عموماً آلات و وسایط کو مقصود بالذات سمجھ لیتا ہے اور دور بین بنانے میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔''

ب: ''وہ سیکڑوں نالے جو جمع ہو کر سمندر کا مقابلہ کرتے، الگ الگ رہنے کی وجہ سے قریب ہے کہ خشک ہو جائیں، زنجیر کے حلقے اگر بکھرے ہوئے پڑے ہوں تو بے فایدہ بوجھ ہے۔''

ڈاکٹر شاہ جہان پوری کی اس تدوین کردہ کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف آزاد کے مقالات کی جمع آوری نہیں، ان میں موجود مباحث اور توضیح طلب مقامات کا ایک عمدہ اور ناقدانہ اشاریہ بھی ہے۔ چناں چہ ان مقالات کے دوش بدوش آپ کو خود فاضل مرتب کے ایسے مقالات بھی ملیں گے جو علامہ شبلی، ندوۃ العلما، سیرۃ النبی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام) کی تالیف، الہلال کا لب ولہجہ اور شبلی، شبلی اور آزاد کے تعلقات از ابتدا تا انتہا جیسے امور پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً ان مقالات سے علم ہوتا ہے کہ بقاے ندوہ کی جنگ میں آزاد کی کیا خدمات تھیں، شبلی کے خلاف قائم جارحانہ محاذ اور ہنگامہ خیز طوفان کی شدت کو کم کرنے میں آزاد کے آتش نوا قلم نے کیا کیا جولانیاں دکھائیں، الہلال نے مسلمانانِ برعظیم ہند و پاکستان میں قرآنی ذوق کی تولید و رشد میں کیا کردار ادا کیا۔ الہلال میں شایع شدہ علامہ شبلی کی نظمیں کس طرح الہلالی فکر اور تحریک کی مؤید بنیں۔ علاوہ ازیں ان مقالات میں آپ کو مرتب کے بعض ناقدانہ خیالات سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ مثلاً اپنے مضمون ''ابوالکلام اور علامہ شبلی...... آخری دور'' میں انھوں نے دلایل کے ساتھ سیّد سلیمان ندوی کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں آزاد کے خیالات علامہ شبلی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھے۔ ڈاکٹر شاہ جہان پوری کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ امور میں خود آزاد کی منفرد سوچ اور

گہرے تفکر نے ان کا رستہ متعین کر دیا تھا۔ ابوالکلام کی فضیلت خداداد تھی:

زخیلِ دُرد کشاں غیرِ ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے

ڈاکٹر شاہ جہان پوری آزاد کی تحریروں کے مافیہ اور ان کی مختلف اشاعتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یوں تو اس امر پر ان کی ابوالکلام آزاد کے سلسلے کی متعدد تدوینات شاہد ہیں مگر زیرِ نظر مضامین میں صرف ''الندوہ اور ابوالکلام'' نامی مضمون ہی سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں بدلائل بعض نقادوں کے مزعومات کی نفی کی ہے اور حقایق کو اجاگر کیا ہے۔

یہاں ضمناً ڈاکٹر شاہ جہان پوری کے مقالے ''ابوالکلام اور علامہ شبلی ...... آخری دور'' کا جس کے بعض قابلِ قدر مشمولات کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں، ایک اور حوالے سے ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مقالے میں آزاد کے اپنے ''صدیق مکرم'' مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام ایک مکتوب کا تفصیلی حوالہ دیا ہے جو'' کاروانِ خیال'' میں شامل ہے۔ اس مکتوب میں، جو ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا، آزاد نے اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی کی فارسی شاعری کی بڑی تحسین کی ہے اور بجا طور پر کی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں شبلی پر ختم ہوئی۔ غالب جو کچھ ہے تغزل و مدح کے میدانوں تک محدود ہے لیکن مولانا (شبلی) نے فارسیت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کیے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں۔'' اس میں کیا شک ہے کہ علامہ شبلی نے اپنی فارسی شاعری میں قومی نظم نگاری کی طرح ڈالی، لیکن آزاد کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں شبلی پر ختم ہوئی، حیران کن ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جب یہ بات کہی گئی، اقبال کو فوت ہوئے دو برس ہو چکے تھے اور ان کی ملّی اور قومی فارسی شاعری کا بے مثال رجز برعظیم کی سرحدوں سے نکل کر یورپ میں بھی گونج رہا تھا۔ ایسے میں علامہ شبلی کی فارسی شاعری کو ہندوستان میں فارسی شاعری کا نقطۂ اختتام بتانا حیرت انگیز ہی نہیں، تاسف خیز بھی ہے۔ اگر اس اختتام کا اعلان ضروری تھا تو نقطۂ اختتام شبلی نہیں اقبال ٹھہرتے ہیں:

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

آگے چل کر اسی مکتوب میں آزاد لکھتے ہیں، ''اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا (شبلی) تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اُسلوبِ شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔ اس معاملے کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں۔ خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔''

مجھے معلوم نہیں آزاد کا اشارہ کن ایرانی قومی شاعروں کی طرف ہے۔ خیال ہے کہ یہ اشارہ تحریک مشروطہ کے انقلابی شعرا کی طرف ہوگا۔ رہے ایران کے ملک الشعراء بہار (۱۸۸۶ء۔ ۱۹۵۱ء)، تو گمان ہے کہ اپنی گوناگوں سیاسی اور دیگر مصروفیات کے باعث آزاد کو بہار کے دیوان کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع نہیں مل پایا ہوگا، ورنہ وہ بہار کی شاعری کو یوں رَد نہ کرتے، بلکہ ان کی غیر معمولی قدرتِ کلام کی داد دیتے۔ آزاد شبلی کی قومی شاعری کی داد دیتے ہیں، لیکن مشروطیت کے باب میں تخلیق ہونے والی بہار کی شاعری ان کی نگاہ سے بوجوہ اوجھل رہی جس کا ایک ایک لفظ آتش و شہاب سے ترشا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جس نے ایران کے ملی شعور کی بیداری میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ تحریک مشروطہ کے ضمن میں بہار کی شاعری نے ایران کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ بہار کی قدرتِ کلام کا یہ عالم ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں صنفِ قصیدہ میں ایسا کمال پیدا کیا کہ ان کے عمر رسیدہ معاصرین شبہ کرتے تھے کہ بہار اپنے والد ملک الشعراء صبوری کا کلام اپنے نام سے پڑھتا ہے۔ گو کہ ملک الشعراء بہار کے قصاید میں معنی آفرینی کی وہ سطح تو نظر نہیں آتی جو منوچہری، فرخی، انوری یا خاقانی کو نصیب تھی مگر یہ قصاید زبان و بیان پر ان کے عبور اور کہیں کہیں لطیف نکتہ آفرینی کے گواہ ضرور ہیں۔ ''تشبیب و بہاریہ''، ''در وصفِ انگور'' جیسے منظومات میں ان کی ندرتِ بیان اور نزاکتِ احساس دیکھی جاسکتی ہے۔ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حوادث و وقایع پر بھی بہار نے بڑے لطیف، طنزیہ اور دردمندانہ انداز میں لکھا۔ علاوہ ازیں اتحاد عالم اسلامی کی آواز بلند کرنے والوں میں بہار کا شمار السابقون الاوّلون میں کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں ۱۹۰۸ء میں کہی گئی ''اتحاد اسلام'' نامی نظم قابلِ ملاحظہ ہے جس کا جوشِ بیان اور ولولۂ خطابت دیدنی ہے۔ اسی طرح ''از ماست کہ بر ماست'' نامی نظم میں جو ۱۹۱۲ء میں کہی گئی بہار نے مسلمانوں کے زوال کا سبب خود انھی کو قرار دیا ہے:

اسلام گرامروز چنیں زار وضعیف است
زیں قوم شریف است
نہ جرم زعیسیٰ نہ تعدّی زکلیساست
از ماست کہ برماست

''از ماست کہ برماست'' کا ٹیپ کا مصرع آج بھی اہلِ ایران کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح بہار نے ''خویش را احیا کنید'' جیسی متعدد بے مثال نظمیں کہیں۔ چوں کہ مولانا آزاد قصیدے سے زیادہ غزل کے قتیل تھے اس لیے بہار کے یہاں انھیں لطف کا زیادہ سامان میسر نہ آیا ہوگا۔ واضح رہے کہ بہار کی غزل کا لہجہ بھی متقدمین سے جدا ہے اور بعض مقامات پر اپنے اندر عجب طنطنہ رکھتا ہے۔ بعض جگہ انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد پر نہایت رواں، دل سوزانہ تبصرے کیے ہیں۔ چند شعر درج کرنے میں ہرج ہی کیا ہے:

کن حذر زاں دم کہ دستِ عاشقِ دلمردہ ای
ہمچو قاتل درمیانِ رہگذر گیرد ترا

میان ابرو و چشمِ تو گیر و داری بود
من این میانہ شدم کشتہ، این چہ کاری بود

من نگویم کہ مرا از قفس آزاد کنید
قفسم بردہ بہ باغی و دلم شاد کنید
دعویٰ چہ کنی داعیہ داران ہمہ رفتند
شو بارِ سفر بند کہ یاران ہمہ رفتند
آن گردشتا بندہ کہ در دامنِ صحرا ست
گوید چہ نشینی کہ سواران ہمہ رفتند
یک مرغ گرفتار در این گلشن ویران
تنہا بہ قفس ماند و ہزاران ہمہ رفتند

شحنہ با شیخ بہ جنگ است بیا تا من و تو
اندریں فرصت کم عیش تمامی بکنیم

تو اوّل و تو ثانی در خوبی و رعنای
ای ثانیِ بی اوّل وی اوّلِ بی ثانی

مجھے یقین ہے کہ اگر اس طرح کے شعر آزاد کی نظر سے گزرتے تو وہ بہار کی بہار آفرینی کی داد ضرور دیتے۔

مجھے احساس ہے کہ شبلی کی ملّی شاعری کے ذکر میں بات کہیں سے کہیں نکل گئی لیکن میرے نزدیک اس تفصیل کی ضرورت بہ ہر حال تھی تاکہ بہار کی شاعری کے اصل خد و خال واضح کر دیے جائیں، اور پھر اس سب کا محرک بھی تو حضرت شاہ جہان پوری کا مضمون ہی ٹھہرا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد و ابو سلمان کے مضامین کا یہ ملا جلا مجموعہ کئی حوالوں سے شبلیات و آزادیات کے باب میں بعض نئی معلومات کا نقیب کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری لائقِ تبریک ہیں کہ ان کی مساعی سے آزاد کے افادات کم و بیش سو برس بعد کتاب کی صورت میں ظہور کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی
استاد ادبیات اُردو و پاکستان شناسی
تہران یونیورسٹی، ایران

تہران، ۱۲/۱۲/ اسفند ۱۳۸۵/ بمطابق ۳/ مارچ ۲۰۰۷ء

مقدمہ:

(۱)

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد

تعارف اور ملاقات کا ابتدائی دور

۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء

حضرت علامہ شبلی سے مولانا آزاد کی واقفیت، مراسلت، ملاقات اور تعلقات کے کئی دور ہیں۔ جہاں تک واقفیت اور آغازِ مراسلت کا پتا چلتا ہے یہ ۱۹۰۱ء کے واقعات ہیں۔ اس وقت تک مولانا ابوالکلام آزاد گلدستہ ''نیرنگ عالم'' (۱۸۹۹ء) اور المصباح (۱۹۰۱ء) کے اجرا و بندش کے تجربات سے گزر چکے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ''لسان الصدق'' (۵۔۱۹۰۳ء) کی بندش کا واقعہ بھی پیش آچکا تھا۔ اس پسِ منظر میں مولانا نے لکھا ہے کہ حضرت شبلی سے گذشتہ پانچ برس سے خط وکتابت جاری تھی۔ حضرت مرحوم سے مولانا کی اوّلین ملاقات کا زمانہ بھی یہی ہے۔

مولانا بیان فرماتے ہیں:

> ''بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت مولانا مرحوم حیدر آباد میں ''ناظم علوم وفنون'' تھے اور تقریباً پانچ سال سے میری خط وکتابت ان سے جاری تھی۔''

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق سے کئی باتوں کا ذکر ضروری ہے! پہلی بات تو مولانا آزاد ہی کے الفاظ میں:

> ''میں چوں کہ ان کی تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے ان کی اپنے دل میں بڑی عزت و وقعت رکھتا تھا اور طبیعت میں شوق تھا کہ ایسے لوگوں کی معیت و صحبت کا موقع حاصل ہو۔''

یہ علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے ابتدائی تعارف اور تاثر کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب مولانا سے مراسلت اور ملاقات ہوئی تو یہ تاثر اور گہرا اور راے پختہ ہوگئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شبلی کی خدمت میں سب سے پہلا خط تقریباً ۱۹۰۱ء میں لکھا تھا۔ اس وقت مولانا کو جدید علوم کی کتابوں کے مطالعے کا شوق ہوا تھا۔ پہلے انھوں نے ان کتابوں کی تلاش کی جو انگریزی، عربی، فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی تھیں۔ پھر مصر، شام کی عربی کتب کی تلاش ہوئی۔ علامہ شبلی کو انھوں نے اسی سلسلے میں خط لکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

> ''اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون کون سے ہیں اور کہاں کہاں سے ملیں گے؟ یہ پہلا خط ہے جو میں نے مولانا کو لکھا۔ انھوں نے دو سطروں میں یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجیے۔''

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۸ء، ص ۳۵۷)

اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں اس وقت مراسلت کا موقع ملا جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ ترقی اُردو کو اس کی مستقل حیثیت میں انجمن ترقی اُردو کی شکل دی گئی تھی۔ اس کا ذکر آیندہ سطور میں آرہا ہے۔ اس کے بعد جو وقت بھی آیا مولانا آزاد علامہ شبلی کے قریب ہوتے گئے۔ مراسلت کے زیادہ موقع پیش آتے گئے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بھی قایم ہوا اور تعلقات پختہ ہوتے گئے۔

اواخر دسمبر ۱۹۰۱ء ندوۃ العلماء کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا۔ اس کے لیے حالات کو سازگار بنانے کے لیے ندوے کے بعض کارکنان پانچ چھ مہینے پہلے سے سرگرم کار تھے۔ اس کا دل چسپ تذکرہ مولانا آزاد نے اپنی کہانی بہ روایت مولانا ملیح آبادی میں کیا ہے (دیکھیے: آزاد کی کہانی ان کی اپنی زبانی، ص ۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۷ تا ۲۲۲ و دیگر صفحات)۔ مولانا آزاد اس جلسے کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ ندوے کی حمایت میں اس موقع پر بعض رسایل بھی لکھے تھے۔ مولانا خود فرماتے ہیں:

> ''۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کا کلکتے میں جلسہ ہوا اور بہت سے علما جمع ہوئے۔ میں اس وقت آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور ندوے کے معاملات، اس کے جھگڑوں، مباحثوں میں پوری طرح دل چسپی لیتا تھا۔ میں اس زمانے میں مجامع عامہ میں

تقریر کرنا شروع کر چکا تھا۔ مقامی مشاعروں میں اور ملک کے مشہور گل دستوں میں میرا کلام مقبول ہو چکا تھا اور اُردو مضمون نگاری بھی کرنے لگا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے تھے۔ ایک ضخیم کتاب بھی لکھنی شروع کر دی تھی۔ ندوہ اور اس کے مخالفین کے جھگڑوں اور ندوے کی حمایت میں متعدد تحریریں لکھی اور شایع کی تھیں۔''

(آزاد کی کہانی......ص ۲۱۱)

اسی سلسلے میں مولانا مزید لکھتے ہیں:

''......ندوۃ العلماء کے جلسۂ کلکتہ کے مبادیات شروع ہوئے اور ندوہ اور مخالفین ندوہ کے متوازی کیمپ قایم ہو گئے۔ ساتھ ہی رسایل و مضامین بھی شایع ہونے لگے۔ ندوے کے سفرا میں ایک مخلص مولوی نظام الدین جھجھری تھے۔ وہ مخالفین کے تازہ رسایل و مضامین دکھلاتے تھے اور میں ان کے جوابات لکھ کر دے دیتا تھا اور پھر ندوے کی استقبالی کمیٹی انھیں چھاپ کر شایع کر دیتی تھی۔ اس قسم کے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالے شایع ہوئے اور غالباً مذہبی رسایل گذشتہ کے بعد نئی قسم کی چیزوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اشاعت تک نوبت آئی۔'' (ایضاً: ص ۲۷۴)

ندوۃ العلماء کا یہ سالانہ جلسہ جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں آیا ہے، اس کے صدر مولانا عبدالحق حقانی دہلوی تھے۔ (ایضاً: ص ۲۱۹)

ملک کے دور دراز کے شہروں سے بہت سے علما اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور کئی کئی دن کلکتہ میں مقیم رہے تھے۔ مولانا آزاد کی ان سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں رہیں۔ مولانا نے اپنی کہانی میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ ان کا بیان ہے:

''ندوے کے اجلاس میں جو علما باہر سے آئے تھے، جلسے کے اوقات کے بعد بھی ان کا اجتماع مسجد میں، یا حاجی بخش الٰہی کے مکان میں رہا کرتا تھا۔ میں وہاں برابر جایا کرتا اور جب ان لوگوں کا یہ خیال دور ہو گیا کہ میں ایک محض ناقابلِ التفات کم سن لڑکا ہوں تو مجھے اپنی قوتِ بیانیہ اور بحث وجدال کے لیے خوب موقع

ہاتھ آ گیا۔'' (ایضاً:ص ۲۱۹)

مولانا آزاد نے اس زمانے کی کئی بحثوں کا، ان کے فریقِ مجادلہ کے ناموں اور مواقع کی صراحت کے ساتھ اپنی کہانی میں ذکر کیا ہے۔

لیکن کوئی ایسا اتفاق پیش آیا تھا کہ حضرت علامہ شبلی کلکتہ کے اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

ندوے کے حوالے سے مولانا آزاد نے ایک صاحب احمد حسن فتح پوری کا ذکر اپنی ابتدائی صحافتی زندگی اور تصنیف و تالیف کے شوق کے سلسلے میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں ایک قابل اور مستعد آدمی تھے۔ یہ تحفہ احمدیہ کان پور، جسے مولانا محمد علی مونگیری بانی و ناظم اوّل ندوۃ العلماء نکالا کرتے تھے، بند ہو جانے کے بعد نکلنے والے رسالے تحفۂ محمدیہ کے ایک عرصے تک ایڈیٹر رہے تھے اور کلکتہ منتقل ہو جانے کے بعد پھر اسے ''تحفہ احمدیہ'' کے نام سے نکالا تھا۔ مولانا ابوالکلام سے ان کی شناسائی ہو گئی تھی، اس لیے مولانا کو اس میں مضمون نگاری کا بہت موقع ملا۔ انھوں نے کلکتہ ہی سے احسن الاخبار بھی نکالا تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد ایک ملازمت کے سلسلے میں دارجلنگ چلے گئے تھے۔ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ چوں کہ مولانا ابوالکلام کو ان سے خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس لیے ان کے انتقال کا دل پر بہت اثر ہوا اور ایک دل دوز نثری مرثیہ ان کی رحلت پر لکھا تھا۔ اس کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا سیّد احمد حسن کا نام پبلک کے لیے کوئی نیا نام نہیں ہے۔ یہ ایک عرصے تک تحفۂ محمدیہ کان پور کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، جس نے ایک عرصے تک کرسچین دنیا کا نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ جاری رکھا تھا اور ایک قانونی زور نے جسے تبدیل نام کے بعد مولوی صاحب کے ہاتھوں تک پہنچایا تھا(۱)۔
>
> ندوۃ العلماء کے یہ پُر زور ممبر رہے اور ہمیشہ تحفہ احمدیہ کے کالم ندوے کی تائید میں مضامین کے لیے کھلے رہے۔ ندوۃ العلماء کلکتہ کی کشش نے انھیں کلکتہ پہنچایا اور انھوں نے کلکتہ کا مشہور اخبار احسن الاخبار جاری کیا۔''

(لسان الصدق: کلکتہ، ماہ دسمبر ۱۹۰۳ء، ص ۱۵)

۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اُردو کو انجمن ترقی اُردو کے نام سے ایک

مستقل انجمن کی شکل دے دی گئی تھی اور اس کے ناظم حضرت علامہ شبلی قرار پائے تھے اور اُردو کے علمی ذخیرے کو وسیع کرنے کی ایک صورت یہ قرار پائی تھی کہ انگریزی، عربی، فارسی کے ذخیرۂ علمیہ سے نئی اور علمی کتابوں کے تراجم اور علمی موضوعات پر تصنیف و تالیف کے منصوبوں پر عمل کیا جائے۔

اسی سال کے آخر میں لسان الصدق (کلکتہ) کا اجرا ہوا۔ لسان الصدق کے خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گئے یعنی ترقی اُردو اور اصلاح رسوم، اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ لسان الصدق علامہ شبلی سے تعارف کا ایک قوی ذریعہ ثابت ہوا۔ مولانا آزاد کے ذوق و مستعدی اور ان کی ادارت میں ایک ادبی و علمی رسالے کو دیکھ کر انھوں نے مولانا آزاد کو انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا اور لسان الصدق کو انجمن کا ترجمان بنالیا تھا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> ''اس زمانے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اُردو قایم ہو چکی تھی اور مولانا شبلی مرحوم اس کے ناظم تھے۔ انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے ان سے خط و کتابت کی تھی اور انھوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا شایق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا...... لسان الصدق کے خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گئے، یعنی ترقی اُردو اور اصلاح رسوم، اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کی دل چسپی دیکھ کر اسے اپنا آرگن قرار دے دیا تھا اور مولانا (شبلی) مرحوم، انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دل چسپ باتیں ہوتی تھیں، انھیں سب سے پہلے اس میں اندراج کے لیے بھیج دیتے تھے اور تمام ممبران انجمن کے نام ایک اطلاع شایع کر دی تھی کہ اس پرچے کو ضرور منگوائیں۔ اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہو گئی تھی۔''

(آزاد کی کہانی......ص ۳۰۴)

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ لسان الصدق میں انجمن سے متعلق خبریں، انجمن کی رپورٹ، انجمن کے منصوبے اور اس کے نتایج پر تبصرہ، انجمن کی کارگذاری اور حضرت علامہ شبلی مرحوم کی علمی سرگرمیوں کا شروع ہی سے ذکر آتا رہا اور جب تک علامہ حیدرآباد میں رہے اور انجمن کی سرگرمیاں

جاری رہیں اور حضرت علامہ کا ان سے تعلق رہا، تقریباً اسی زمانے تک لسان الصدق جاری رہا اور جب حضرت علامہ حیدر آباد کے صیغۂ علوم وفنون سے سبک دوش ہو کر لکھنؤ آگئے تو لسان الصدق اس سے پہلے بند ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ تقریباً دو برس تک اُردو ادب کی ترقی اور اُردو زبان میں بہترین علمی و ادبی اضافے کی پر جوش تحریک میں حضرت علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی شرکت اور مقاصد کے سفر میں دونوں کی رفاقت رہی تھی، لیکن ابھی تک دونوں کی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

لسان الصدق کی اشاعت ہی کے زمانے میں ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے علمی ترجمان الندوہ کا اجراعمل میں آیا تھا۔ الندوہ کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء میں شایع ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنی کہانی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مولانا شبلی سے ملاقات:

یہ دور جس کا ذکر کیا ہے، مولانا آزاد کا شبلی سے تعارف اور مراسلت کا زمانہ تھا۔ ملاقات کا زمانہ مولانا آزاد نے ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء لکھا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا:

> ’’مولانا شبلی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا۔ جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا، تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں میں خود ہوں۔‘‘

(آزاد کی کہانی......ص ۲۱۳)

یہ زمانہ لسان الصدق کی اشاعت کا زمانہ ہے، اس لیے کہ لسان الصدق کے ایڈیٹر کا اتنا کم عمر ہونا حالی مرحوم کی حیرت کا باعث ہوا تھا اور یہی امر حضرت شبلی کے لیے بھی تعجب کا موجب بنا کہ لسان الصدق جیسے سنجیدہ، علمی ادبی رسالے کا ایڈیٹر اتنا کم عمر بھی ہو سکتا ہے۔

وسعتِ مطالعہ کا اثر:

اس پہلی ملاقات کے بعد مولانا آزاد کے وسعت مطالعہ کے مظاہر سامنے آئے تو حضرت

شبلی کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ مولانا آزاد بیان فرماتے ہیں:

''اس کے بعد جب مولانا شبلی مرحوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی اور میں نے محصّل کا ذکر کیا تو ان کو بہت ہی استعجاب ہوا۔ اس وقت تک مولانا کی نظر سے وہ نہیں گزری تھی اور اس کے انطباع کی بھی انھیں خبر نہ تھی۔ لیکن اس حسنِ ظن کی وجہ سے جو امام صاحب سے تھا مثل حکمتِ مشرقیہ شیخ (الرئیس) کے، اس کا بھی ان کو نہایت اشتیاق تھا۔ پہلے تو انھوں نے عرصے تک اسے تسلیم ہی نہیں کیا کہ جس چیز کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ انھی کی مطلوبہ محصل ہے۔ لیکن جب میں نے اس کے مباحث پر بہ طور تقریر بہت سے مطالب بیان کیے اور پھر دوسرے دن انھیں مطبوعہ نسخہ بھی دے دیا تو میری نسبت انھیں بہت اچھا خیال پیدا ہوا اور استغراب کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اگر چہ ان کے توقعات محصل سے پورے نہ ہوئے۔''

(آزاد کی کہانی......ص ۲۲۸)

ایک اور صحبت میں مولانا نے فرمایا:

''جب چند دنوں میں گفتگو و صحبت سے انھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہوگیا، تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔ بار بار کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ تم اگر کسی طرح حیدر آباد آسکو، تو الندوہ اپنے متعلق کرلو، اور وہاں مزید مطالعہ و ترقی کا بھی موقع ملے گا۔

ایک دن میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال نکال کے دیکھ رہے تھے۔ اس میں خدنگ نظر کا ایک مجموعہ نکل آیا۔ اس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ اس میں ایک مضمون ایکس ریز کی ایجاد و حقیقت پر تھا۔ انھوں نے کہا، جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو کیوں اس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو؟ کم سے کم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو۔

سب سے زیادہ مولانا شبلی پر میرے شوقِ مطالعہ اور وسعتِ مطالعہ کا اثر پڑا۔ اس

وقت تک میرا مطالعہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ عربی کی تمام نئی مطبوعات اور نئی تصنیفات تقریباً میری نظر سے گزر چکی تھیں اور بہتیری کتابیں ایسی بھی تھیں کہ مولانا ان کے شائق تھے اور انھیں معلوم نہ تھا کہ چھپ گئی ہیں، مثلاً محصل امام رازی، جس کا ذکر آچکا ہے۔"

(آزاد کی کہانی......ص۱۲_۲۱۱)

اسی زمانے میں چند اور ایسے مواقع پیش آئے جن سے حضرت شبلی مرحوم بہت متاثر ہوئے اوران کی رائے مولانا آزاد کے بارے میں بہت اچھی ہوگئی۔ایک واقعے کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"پٹنہ کے ایک شخص، علی محمود جن کا انتقال ہو چکا ہے، اس وقت بمبئی میں تھے اور وہ بھی برابر مولانا سے ملنے کے لیے جایا کرتے۔ ایک دن میں اس ہوٹل میں گیا جہاں مولانا ٹھہرے ہوئے تھے، تو دیکھا کہ ایک بحث بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔علی محمود سے شاید مولانا نے کہا تھا کہ فن مناظرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں کی گفتگو کس قدر بے اُسلوب ہوتی ہے اور انھوں بتلایا تھا کہ رشیدیہ اس میں اچھا متن ہے، وہ لے کر آئے تھے۔ایک اور مولوی نظام الدین پنجاب کے تھے، وہ بھی پہنچ گئے تھے اور اس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ رشیدیہ کے بعض مطالب، مولانا علی محمود کو سمجھانا چاہتے ہیں، لیکن مولوی مذکور بار بار الجھ پڑتا ہے۔اور ہر چند وہ سمجھاتے ہیں، لیکن کج بحثی بڑھتی جاتی ہے۔ میں بھی ایک دو موقع پر بول اٹھا اور پھر مولوی نظام الدین کو مخاطب کر کے میں نے بعض باتیں جو مابہ النزاع ہو رہی تھیں، کہیں۔ اس پر مولانا شبلی میری طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ اپنی تقریر پوری کرو! میں نے اس حصۂ کتاب پر ایک اچھی خاصی بسیط تقریر کر ڈالی۔ اس وقت مجھے درسیات خوب مستحضر تھیں۔ نیا نیا پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوا تھا۔ اعتراضات اوران کی بحثیں بھی بار بار منجھ چکی تھیں۔ میں نے بڑی زوردار تقریر کی اور اگرچہ کچھ بھی نہ تھی، لیکن مولانا شبلی مرحوم اس درجے متاثر ہوئے کہ بار بار

تعریف کرتے اور کہتے کہ تمہارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔ تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔"

(آزاد کی کہانی......: ص۱۳-۳۱۲)

الندوہ کی سب ایڈیٹری:

اس کے ساتھ ہی الندوہ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے ان کا اصرار بہت بڑا گیا۔ دو تین ہفتے کے قیام بمبئی کے بعد مولانا شبلی حیدرآباد روانہ ہوگئے۔ یہ ۱۹۰۴ء کے اواخر یا ۱۹۰۵ء کے اوایل کا واقعہ ہے۔ اب مولانا نے حضرت مولانا شبلی کی پیش کش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا اور اس وقت کے جو حالات تھے، ان میں یہی فیصلہ کیا کہ اسے قبول کر لینا چاہیے اور حضرت علامہ شبلی کی جو صحبت میسر آتی ہے اس سے ضرور فایدہ اٹھانا چاہیے۔ گذشتہ بیان کے تسلسل ہی میں فرماتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا مرحوم کی رائے میری نسبت اچھی قایم ہوئی اور پھر ان کی شفقت و بزرگی کی وجہ سے ہمیشہ بڑھتی ہی گئی۔ دو تین ہفتے کے بعد وہ حیدرآباد واپس چلے گئے اور وہاں سے برابر خط بھیجتے رہے کہ میں حیدرآباد آؤں۔ اس زمانے میں جیسا کہ کسی دوسرے موقعے پر کہوں گا، میرے خیالات اور خیالات کی وجہ سے حالات ایسے ہو رہے تھے کہ گھر کی زندگی سے جو کئی سال پہلے دل برداشتگی ہوئی تھی، وہ اب تک باقی تھی، اور اس لیے خیال ہوتا تھا کہ یہ اچھا موقع ہے ایک ایسے شخص کی صحبت ہاتھ آتی ہے، چلا جانا چاہیے لیکن بعض اور وابستگیاں، اس وقت کی زندگی کی ہوس پرستیوں سے ایسی پیدا ہوگئی تھیں کہ قدم روک لیتی تھیں۔

اس اثنا میں مولانا مرحوم نے استعفا دے دیا اور مجھے لکھا کہ اب میں بقیہ عمر ندوے کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں اور اعظم گڑھ ہو کر لکھنؤ جاؤں گا۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ میں اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہیں

مولانا کا خط مجھے ملا تھا۔ اعظم گڑھ سے انھوں نے پھر خط لکھا اور اصرار کیا کہ اب زیادہ اچھا موقع ہے لکھنؤ میں آ کر رہو تو حیدر آباد سے بھی بڑھ کر یہ بہتر ہوگا۔
اس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا، لیکن لکھنؤ میں مولوی حفیظ اللہ سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر کی علالت کی خبر سن کر پھر اعظم گڑھ چلے گئے ہیں اور ان کا تار آ چکا ہے کہ اگر ہو سکے تو خود اعظم گڑھ جاؤ، چناں چہ اعظم گڑھ گیا (۲) عجیب اتفاق جس دن پہنچا اسی دن ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہاں سے ہم ایک ساتھ لکھنؤ واپس آئے اور میں ندوے ہی میں ٹھہر گیا اور الندوہ کی ایڈیٹری انھوں نے میرے متعلق کر دی۔ تقریباً سات آٹھ مہینے وہاں قیام رہا۔"

(آزاد کی کہانی......: ص ۱۴-۳۱۳)

الندوہ سے تعلق کی وجہ:

مولانا ابوالکلام نے الندوہ کی ادارت کیوں قبول کی تھی؟ اس پر مولانا ہی کے بیان سے روشنی پڑتی ہے۔ علامہ شبلی سے ملاقاتوں میں ان کی رائے مولانا ابوالکلام کے بارے میں روز بہ روز اچھی ہوتی گئی اور ان کی شفقت بھی ان کی بزرگی کی وجہ سے بڑھتی گئی۔ ابوالکلام کی رائے حضرت علامہ کے بارے میں شروع سے بہت اچھی تھی اور لسان الصدق کے زمانے میں یہ رائے پختہ ہو گئی تھی۔ اب جب کہ انھوں نے ابوالکلام کو زبانی اصرار کے بعد خط لکھا کہ اب وہ خود بھی لکھنؤ میں قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں، وہ (ابوالکلام) بھی لکھنؤ آ جائیں اور الندوہ کی ادارت کریں، ابوالکلام اس پیش کش کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"بمبئی میں قیام و ملاقات کے دو تین ہفتے کے بعد وہ حیدر آباد واپس چلے گئے اور وہاں سے برابر خط بھیجتے رہے کہ میں حیدر آباد آؤں۔ اس زمانے میں...... میرے خیالات اور خیالات کی وجہ سے حالات ایسے ہو رہے تھے کہ گھر کی زندگی سے جو کئی سال پہلے دل برداشتگی ہوئی تھی، وہ اب تک باقی تھی اور اس لیے خیال ہوتا تھا کہ یہ اچھا موقع ہے ایک ایسے شخص کی صحبت ہاتھ آتی ہے، چلا جانا چاہیے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ والد سے بعض خیالات میں اختلاف کی بنا پر گھریلو زندگی

سے جو دل برداشتگی ہوگئی تھی اور طبیعت کا جو اطمینان اور سکون ختم ہوگیا تھا، ضروری تھا کہ کوئی مامن اور بزرگ و شفیق ہو جس کی صحبت اور سرپرستی میں دل کا کھویا ہوا سکون اور جمعیت خاطر میسر آسکے۔ علامہ شبلی سے ملاقاتوں میں انھوں نے محسوس کرلیا تھا کہ ان کی بزرگانہ صحبت میں یہ مقصد پورا ہوسکتا ہے اور علمی ذوق کی تسکین بھی میسر آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم کا دور ختم ہو چکا تھا اور مطالعہ و نظر کے جس مقام پر تھے، تربیت حاصل کرنے کے خیال سے بے پروا ہو چکے تھے۔

محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے اس میں ایک نکتے کا اضافہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''علامہ شبلی پر گوناگوں علمی، تعلیمی اور قومی کاموں کے ساتھ الندوہ کی ادارت کی مکمل ذمے داری کا بوجھ بھی تھا۔ اس کو کم کرنے اور مولانا آزاد کی علمی تربیت کے خیال سے باصرار انھیں لکھنؤ بلایا۔ مولانا آزاد نے بھی اپنے علمی ذوق و شوق کی وجہ سے اس پیش کش کو منظور کرلیا۔''

مولانا ابوالکلام نے حضرت علامہ شبلی کی صحبت سے بہت فیض اٹھایا تھا اور اس کا خود مولانا نے اعتراف کیا ہے۔ لیکن دوسری بات شبلی نے کہی، نہ ابوالکلام کے قلم سے نکلی اور کسی اور کے بیان سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حضرت سیّد صاحب، مولانا عبدالسّلام، مولانا مسعود علی، ضیاء الحسن علوی وغیرہم حضرت علامہ شبلی سے جتنے قریب و عزیز تھے، معلوم ہے، اور ابوالکلام سے اتنے قریب اور واقف تھے کہ اس دور کا اور الندوہ میں قیام کی اصل حقیقت کا اتنا واقف کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ اس ماحول کی حضرت شبلی اور ابوالکلام کی کوئی بات ان کے حوالے کے بغیر تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

ضیاء الحسن علوی نے پہلی بات کو اس طرح بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''علامہ (شبلی) بمبئی سے واپس ہوئے تو الندوہ کے کام کے متعلق مشورت ہوئی کہ بغیر کسی مددگار کے یہ کام اب دشوار ہوگیا ہے۔ علامہ کو پسند نہ تھا کہ ہم تعلیم کی راہ سے بھٹکیں اور ابھی سے زیادہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو جائیں۔ جو بات علامہ نے فرمائی، وہ میرے دل کو لگی، یعنی ہمارے دوست مولانا ابوالکلام آزاد کا تقرر اس جگہ پر ہوگیا۔''

علوی صاحب نے کچھ اور بھی لکھا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان کو تنخواہ بھی ملتی تھی

لیکن انھیں اس کی بالکل پروا نہ تھی۔ اگر ان کا یہ مقصد ہوتا تو اس کی براری کے لیے باپ کی مسند ارشاد و تعلیم بہت بڑا ذریعہ تھا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''اس میرے یار (ابوالکلام) کو روپے کی طلب اور طمع تو تھی نہیں، گھر بیٹھتا تو کھانے کو بہت تھا اور...... خاندانی مسند ارشاد و تعلیم پر بیٹھ کر دستِ غیب سنبھالتا تو پیرِ مغان تو بن ہی جاتا، مگر اس کو مولانا کے پاس رہ کر انھوں نے ایک وظیفہ اپنی تعلیمی ترقی کے لیے سمجھا اور علمی عیاشی اور یار باشی میں وقت کٹنے لگا۔''

(ابوالکلام آزاد: مرتبہ عبداللہ بٹ، لاہور، ۱۹۴۲ء، ص ۱۰۳)

زمانۂ ادارت میں قیام:

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے حوالے کے ساتھ یہ بات بھی لکھی ہے کہ الندوہ کی ادارت کے زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا قیام گولا گنج کی اسی عمارت میں تھا جہاں ندوہ کا دفتر تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

''......ایسے متعدد اشخاص تھے جنھوں نے مولانا آزاد کو (ان کے) آغاز شباب میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ رسالہ ''الندوہ'' کے معاون مدیر کی حیثیت سے پرانے ندوہ میں (جو گولا گنج کی اس عمارت میں تھا جس کو اب خاتون منزل کہتے ہیں......) مقیم تھے اور علامہ شبلی کی علمی صحبتوں سے استفادہ کرتے تھے۔''

(پرانے چراغ: ص ۴۴)

اسی طرح الندوہ سے تعلق کا خاتمہ کب ہوا، یہ بات بھی صاف نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام کا مرتبہ آخری پرچہ مارچ ۱۹۱۶ء کا ہے جو روایت کے مطابق مارچ کے پہلے ہفتے میں شایع بھی ہوگیا ہوگا۔ اس لیے اس کی اشاعت کے انتظار میں ٹھہر جانے کی بات ہو تو سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اس کے بعد ۴ رمئی تک تو وہ ضرور ٹھہرے ہوئے تھے، مگر کیوں؟

اس سوال کا جواب باقی ہے۔

حواشی

۱۔ احمد شاہ شایق نے ''امہات المومنین'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ تحفۂ احمدیہ کان پور میں اس کے رد میں ایک مضمون شایع ہوا تھا۔ امہات المومنین کے مصنف نے اس کے کسی جملے پر عدالت میں ہتک عزت کا مقدمہ دایر کر دیا۔ عدالت نے مصنف کے حق میں فیصلہ کر دیا جس کے نتیجے میں تحفۂ احمدیہ (کان پور) بند ہو گیا۔ اس رسالے کی جگہ مولانا محمد علی مونگیری بانی و ناظم اعلیٰ ندوۃ العلماء نے ''تحفۂ محمدیہ'' کے نام سے نیا پرچہ جاری کر دیا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی احمد حسن فتح پوری تھے۔ کلکتے آنے کے بعد اس رسالے کا اس کے پہلے نام (تحفۂ احمدیہ) سے احیاء کیا جو کچھ عرصے نکلتا رہا تھا۔

۲۔ علامہ شبلی حیدر آباد میں تھے کہ ان کی (دوسری) بیوی کے بطن سے بیٹا پیدا ہوا (۱۹۰۴ء)۔ مہدی افادی کے نام خط میں اپنی خوشی اور دل بستگی کا اظہار فرماتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد کی ذمے داری سے سبک دوش ہو کر آئے تو لکھنؤ میں اہل و عیال کے ساتھ قیام کیا۔ یہاں بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اہلیہ کو اعظم گڑھ پہنچا دیا۔ لیکن خود لکھنؤ میں قیام رکھا۔ بیٹے کے غم نے انھیں نڈھال اور بیمار کر دیا تھا۔ ۳ ر ستمبر ۱۹۰۵ء کو خط بنام مولانا حمید الدین فراہی میں اہلیہ کی سخت بیماری اور شفا سے مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اسی ماہ کے آخر تک حالت مزید بگڑ گئی۔ اطلاع ملی تو اعظم گڑھ گئے۔ انھی دنوں میں مولانا آزاد لکھنؤ پہنچنے والے تھے۔ ہدایت کر دی تھی کہ اگر وہ آجائیں تو انھیں اعظم گڑھ بھیج دیا جائے! چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ اعظم گڑھ سے لکھنؤ آئے تو مولانا آزاد ان کے ساتھ تھے۔ اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

حضرت علامہ کی اہلیہ کے انتقال کی تاریخ کا میں پتا نہیں چلا سکا۔ اگر مرحومہ کی تاریخ انتقال معلوم ہو جاتی تو اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا کہ الندوہ سے ضابطے کا تعلق کب پیدا ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق مولانا آزاد ستمبر ۱۹۰۵ء کے وسط تک لکھنؤ پہنچ گئے تھے اور ۴ ر مئی ۱۹۰۶ء تک وہ ندوہ میں موجود تھے۔ البتہ بمبئی جانے کے لیے بالکل آمادہ تھے۔ مولانا محمد یوسف رنجور جعفری عظیم آبادی کے نام ۴ ر مئی کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ لکھنؤ تشریف لاتے ہیں، دیدہ و دل فرش راہ! میرا ارادہ تھا اور قطعی ارادہ کہ پرسوں بمبئی چلا جاؤں اور وہاں ایک ماہ رہ کر امرتسر کا رُخ کروں۔ لیکن اگر آپ تشریف لاتے ہیں تو قیام ضروری ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ٹھہر جاتا ہوں، آیئے اور ضرور آیئے، اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ تین سال کی غیبت کبریٰ لکھنؤ کی بہ دولت عشرۂ مبارک میں ختم ہو جائے۔''

(۲)

الندوہ اور ابوالکلام

(۱۹۰۵-۶ء)

جیسا کہ عرض کیا، مولانا ستمبر ۱۹۰۵ء میں کسی وقت لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ مولانا نے اپنے پہنچنے کی تاریخ سے یقیناً حضرت شبلی کو مطلع کر دیا ہوگا اور وہ ان کے انتظار میں تھے۔ اچانک اہلیہ کی شدید علالت کی خبر آئی اور وہ اعظم گڑھ چلے گئے۔ اور یہاں کہہ گئے کہ ابوالکلام آ جائیں تو انھیں اعظم گڑھ بھیج دیا جائے اور پھر اعظم گڑھ پہنچ کر بھی خط لکھوایا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں مولانا کا کتنی شدت سے انتظار تھا۔ چناں چہ جوں ہی مولانا لکھنؤ پہنچے اور حضرت علامہ کے بارے میں معلوم کیا، انھیں بتلایا گیا کہ وہ اعظم گڑھ چلے گئے ہیں اور انھیں وہیں بلایا ہے۔ مولانا آزاد بھی اسی وقت یا دوسرے روز اعظم گڑھ روانہ ہو گئے اور چند دن کے بعد حضرت علامہ کے ساتھ ہی لکھنؤ لوٹے۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء سے انھوں نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اس دور کے حضرت علامہ شبلی کے دو خط مولانا ابوالکلام کے نام یادگار اور مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) میں درج ہیں۔ الندوہ میں مولانا آزاد کا پہلا مضمون نومبر میں فرید وجدی مصری کی کتاب المراۃ المسلمہ پر تبصرے کی پہلی قسط تھی، جو نومبر میں شایع ہوئی تھی۔ یقین ہے کہ اس کتاب پر تبصرے کا فیصلہ حضرت علامہ سے مشورے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ تبصرہ لکھ کر انھیں دیکھنے کے لیے دیا کہ وہ اس پر ایک نظر ڈال لیں۔ حضرت علامہ کے ایک رقعے سے اس بات کا پتا چلتا ہے۔ مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) میں مولانا آزاد کے نام شبلی کا القاب و آداب اور سلام سے مبرا پہلا خط دراصل یہی پرچہ ہے، جس پر ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء تاریخ درج ہے۔ پرچہ نویس فرماتے ہیں:

”مضمون واپس ہے الندوہ میں درج ہونے کے لیے دے دیجیے“ ......الخ

(مکاتیب شبلی: ص ۲۶۳)

دوسرا خط الندوہ کے بارے میں ہدایت پر مشتمل، مولانا آزاد کے ایک خط کے جواب میں بھوپال سے بھیجا گیا تھا۔ ۲۸/ اکتوبر کا یادگار ہے۔ القاب و آداب تو اس میں بھی نہیں لیکن خط کا خاتمہ ''سلام'' پر ہوا ہے۔ حضرت علامہ لکھتے ہیں:

''خط پہنچا ایک مضمون آج بھیجا ہے''......الخ۔ (ایضاً ص ۲۶۳)

الندوہ میں مولانا آزاد کے مضامین:

اگرچہ لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام کے قیام کا پتا مئی کے آغاز تک چلتا ہے لیکن الندوہ میں ان کے مضامین صرف نومبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۶ء میں نظر آتے ہیں۔ ان میں تین قسطوں پر مشتمل المراۃ المسلمہ پر ایک تبصرہ ہے، جو نومبر، دسمبر ۱۹۰۵ء اور فروری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔ دوسرا مستقل عنوان ''علمی خبریں'' تھا، جو دسمبر ۱۹۰۵ء اور جنوری و مارچ ۱۹۰۶ء میں نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا کے دو مضمون اور شائع ہوئے۔ یہ تینوں مضمون فروری ۱۹۰۶ء کے ایک ہی شمارے میں چھپے ہیں:

۱۔ ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت ص ۱ تا ۶

۲۔ تیسرا مضمون المرأۃ المسلمہ ص ۶ تا ۲۴

۳۔ القضاء فی الاسلام ص ۲۵ تا ۳۲

المرأۃ المسلمہ کی تیسری قسط ہے اور اسی پر رسالے کی مقررہ ضخامت (۳۲ صفحات) پوری ہو جاتی ہے:

مارچ ۱۹۰۶ء میں مولانا کا ایک مضمون تیرہ صفحات پر مشتمل یورپ میں گونگوں کی تعلیم کے موضوع پر ہے۔ اس دور کے بعد جب کہ الندوہ سے مولانا کا ادارتی تعلق نہیں رہا تھا، ان کے دو مضمون اور شائع ہوئے:

۱۔ مسلمانوں کا ذخیرہ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۲۷ تا ۲۹

۲۔ ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود اپریل ۱۹۱۰ء ص ۱ تا ۳۹

اب ہم ان مضامین کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

ا۔ المرأۃ المسلمہ:

مولانا ابوالکلام کے مضامین میں، جس نے الندوہ میں سب سے پہلے جگہ پائی تھی، فرید وجدی کی کتاب المرأۃ المسلمہ پر تبصرہ تھا۔ یہ تبصرہ تین قسطوں میں شایع ہوا تھا۔ یہ مضمون طویل بھی ہے اور اہم بھی ہے! قاسم امین بک نامور مصری مصنف کی کتابیں المرأۃ (عورت) اور المرأۃ الجدیدہ (نئے زمانے کی عورت) شایع ہوئیں اور جس آزاد خیالی اور بے باکی سے اس نے قلم اٹھایا تھا، اس سے آزاد خیال یا مغربی تہذیب کے شایقین میں ایک جوش اور اس کے اختیار کے لیے سرگرمی اور بے باکی کی ایک لہر دوڑ گئی، لیکن جو اسلامی تہذیب کے دل دادہ تھے یا مغربی تہذیب کے اختیار میں اتنی دور تک جانے کے لیے تیار نہیں تھے، ان کے ذہنوں میں اس آزادی کے نتیجے میں خواتین کی پاکیزگی اور عورتوں کے تقدس کی تباہی کے خطرات تھے، وہ سخت بے چین ہوئے۔ فرید وجدی مصر کے دوسرے مصنف تھے جو آزادی کی اس تحریک کے نتایج سے خوف زدہ ہوئے۔ ان کے خیال میں مشرقی تہذیب میں اصلاح کی ضرورت تھی اور اس سلسلے میں دوسری تہذیبوں سے استفادہ بھی کیا جا سکتا تھا لیکن اپنی تہذیب کو قطعاً ترک کر دینا اور دوسری تہذیب کلیتہً اختیار کر لینے کا ان کے خیال میں کوئی جواز نہ تھا۔ مشرقی تہذیب کا اپنا ایک حسن ہے اور خوبیوں سے مبرا نہیں اور مغربی تہذیب میں اگر کوئی خوبیاں ہیں تو ان سے استفادے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی تہذیب کلیۃً اختیار کی جائے تو اوّلاً ہمیں اپنی تہذیب کی خوبیوں سے وسعت بردار ہونا پڑے گا ثانیاً اختیار کی جانے والی تہذیب کی خرابیوں سے ہم اپنی زندگی کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ انھوں نے غور و فکر کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے قاسم امین بک کے جواب میں ایک کتاب لکھی، جسے عربی دنیا میں بہت پسند کیا گیا۔ ان کے خیالات نہایت متوازن اور مدلّل تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی ان لوگوں میں سے تھے جو جدید عربی لٹریچر پر بھی نظر رکھتے تھے۔ فرید وجدی کی کتاب ''المرأۃ المسلمہ'' خواہ کسی نے حاصل کی ہو لیکن وہ ان کی گفتگو کا موضوع ضرور بنی ہوگی۔ اس پر تبصرے کے فیصلے میں دونوں شریک رہے ہوں گے۔ اور الندوہ میں اس کی قسط وار اشاعت اوّلاً اُس کے مطالب اور ان کی افادیت سے اتفاق اور ثانیاً الندوہ میں علامہ شبلی کی رضا مندی کے بغیر تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ مطالب کی افادیت سے اتفاق اور

اشاعت کی اہمیت کے اعتراف کو محض فرض نہیں کرلیا گیا ہے، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ یہ سلسلہ ان کے نزدیک الندوہ کے بہترین مضامین میں شمار ہوا۔ مولانا شبلی نے اپنے پسندیدہ اور قابل التفات مضامین کی جو فہرست بنائی تھی اس میں سترھواں مضمون ''المرأۃ المسلمہ پر ریویو'' ہے (حیاتِ شبلی: ص ۴۴۲) حضرت سیّد صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں ...... ''المرأۃ المسلمہ'' کے نام سے ...... فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردے پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا، جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے۔ یہی وہ سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا۔'' (حیاتِ شبلی: ص ۴۴۴)

ان بیانات سے نہ صرف شبلی کی پسندیدگی کا پتا چلتا ہے بلکہ حضرت سیّد صاحب کی اچھی رائے اور اس جانب علمی دنیا کا التفات بھی معلوم ہوجاتا ہے۔

مولانا آزاد کا یہ تبصرہ نومبر اور دسمبر ۱۹۰۵ء اور فروری ۱۹۰۶ء میں الندوہ کی تین اشاعتوں میں چھپا تھا۔ آخری قسط کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ تبصرے کے چند مباحث اور بھی ہیں جو آیندہ شایع ہوں گے۔

لیکن اس کے بعد نہ اس سلسلے کی کوئی قسط چھپی اور نہ اس موضوع پر الندوہ میں کوئی مضمون ہی شایع ہوا۔ مولانا آزاد کا یہ تبصرہ، جو المرأۃ المسلمہ کے نام سے چھپا تھا، الندوہ میں اس کی اشاعت پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔ کتابی صورت میں اس کا پہلا ایڈیشن ''وکیل بک ایجنسی'' امرتسر سے اس کی اشاعت الندوہ کے قریبی زمانے میں ''مسلمان عورت'' کے نام سے شایع ہوا تھا۔ ۱۹۴۰ء خصوصاً ۱۹۴۲ء کے بعد ابوالکلام کے مطالعے کا جو دور براعظم ہند پاکستان میں شروع ہوا تھا، اس زمانے سے اب تک اس کتاب کی دونوں ملکوں سے بیسیوں اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت میں آج تک فرق نہیں پڑا۔

ہفتہ وار الکلام پٹنہ میں مولانا محمد یونس خالدی کا ایک مضمون ''امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے افاداتِ علمیہ'' کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا:

''راقم الحروف نے آخر ۱۹۵۲ء میں ''مضامین الندوہ'' کے جمع و ترتیب اور

اشاعت کا ارادہ کیا۔ اس میں ''المرأۃ المسلمہ'' کی وہ تین قسطیں بھی تھیں ......میں نے اس اشاعت کے لیے ۹رنومبر ۱۹۵۲ء کو اجازت چاہی۔ اس کے جواب میں ۱۲رنومبر ۱۹۵۲ء کو محترم محمد اجمل صاحب نے تحریر فرمایا، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ یہ مضامین پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھے گئے تھے، ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں میری رائے بدل گئی ہے اور بہت سی باتیں اب میں صحیح نہیں سمجھتا، لہٰذا ان کے چھپوانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

(کلام۔پٹنہ: ۷رمارچ ۱۹۵۸ء، ص ۱۲)

اسی مضمون میں ان تحریرات کی اشاعت کے مقصد کے بارے میں خالدی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ (مولانا کا) ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کا کارنامہ ہے جب کہ مولانا کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس لیے مولانا آزاد کے اندازِ نگارش کے تدریجی ارتقا کے مطالعے کے وقت اس کتاب کا سامنے ہونا بہت ضروری ہے۔'' (ایضاً)

میرے خیال میں اندازِ نگارش کے تدریجی ارتقا کے مطالعے ہی کے لیے نہیں بلکہ مولانا کے ذہن اور افکار کے ارتقائی مطالعے کے لیے بھی یہ نہایت ضروری ہے۔

الندوہ میں المرأۃ المسلمہ پر تبصرے کے تین نمبر شایع ہوئے، جن کے مجموعی ۴۶ صفحات ہیں لیکن یہ تبصرہ مکمل نہیں ہے۔ مولانا کے خود بیان کے مطابق ایک اہم بحث باقی تھی۔ تیسرے نمبر کے اختتام پر مولانا لکھتے ہیں:

''ہمارا ارادہ تھا کہ ریویو کو اس نمبر پر ختم کر ڈالیں، مگر ابھی ایک ضروری بحث باقی ہے، یعنی یورپ میں درحقیقت متمدن عورتوں کا کیا حال ہے؟ آزادی ان کو ترقی کی طرف لے جارہی ہے یا تنزل کی طرف؟ مگر اس مضمون کو یہاں ختم کر دیتے ہیں۔ آیندہ نمبر میں ایک مستقل عنوان سے اس پر نظر ڈالیں گے۔''

مضمون کا یہ تیسرا نمبر فروری ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد مارچ کا شمارہ بھی مولانا کی ادارت میں نکلا، لیکن اس میں اس سلسلے کی کوئی بحث نہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

ا۔ یہ تبصرہ مولانا نے لکھ کر نہیں رکھ لیا تھا بلکہ وقت کے وقت لکھتے تھے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ

۲۔ مولانا نے تبصرہ لکھ تو لیا ہو لیکن اسی زمانے میں چوں کہ وہ لکھنؤ چھوڑنے کا فیصلہ بھی کر چکے تھے اس لیے اپنے جانے کے بعد الندوہ میں اس کی اشاعت مناسب نہ سمجھی ہو۔

۳۔ اگر تبصرہ کر لیا تھا تو ساتھ لے گئے اور نہ کیا تھا تو امرتسر جانے کے بعد اسے مکمل کیا اور وہیں وکیل بک ایجنسی سے اس کی کتابی اشاعت کا انتظام کر دیا۔

کتابی شکل میں جو تبصرہ شایع ہوا وہ زبان و بیان کی اصلاح اور ترتیب و تدوین کی درستگی کے بعد اور الندوہ میں مطبوعہ تبصرے سے چند گنا زیادہ طویل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ الندوہ میں تبصرے کی تینوں قسطوں کی ضخامت جو ۴۶ صفحوں تک پہنچی تھی اور کتاب کے ۱۶/۳۰×۲۰ سایز کے ۶۵ صفحوں میں آئی تھی، کتابی شکل میں تبصرے کے دیگر پہلوؤں کی تکمیل و احاطے کے بعد ۲۴۸ صفحوں تک دراز ہو گئی ہے۔

مرحوم محمد یونس خالدی کے مقالے کے مطالعے سے پتا چلا کہ کتابی اشاعت کے وقت مضمون میں تبدیلیاں جو کی گئیں ان کا مقصد یہ تھا کہ مضمون کی اصلی نوعیت ''تبصرہ'' کا اس پر گمان نہ ہو، بلکہ اصل کتاب ''المرأۃ المسلمہ'' کا ترجمہ معلوم ہو۔ یہ تبدیلیاں خوب سے خوب تر کی جستجو کے عمل کے سوا اور کچھ نہیں! الندوہ اور کتاب کے متن دونوں سامنے ہوں تو اس امکان کا شبہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں دو باتیں اور عرض کروں گا:

۱۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ المرأۃ المسلمہ کا ترجمہ مولانا آزاد نے پہلے کر لیا تھا، اس کتاب پر تبصرہ علامہ شبلی کے کہنے پر کیا تھا۔ ان کے خیال میں وکیل بک ایجنسی امرتسر میں ترجمہ چھپا تھا، تبصرہ نہیں۔ تبصرہ الندوہ میں چھپا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''المرأۃ المسلمہ'' پر مولانا نے تبصرہ ہی لکھا تھا اور الندوہ میں چھپا تھا، وہی تبصرہ تکمیل کے بعد وکیل بک ایجنسی سے شایع ہوا۔ البتہ جو حصہ الندوہ میں اشاعت سے رہ گیا تھا، امرتسر ایڈیشن کے لیے وہ مکمل کر لیا گیا تھا۔

۲۔ یہ بیان بھی نظر سے گزرا ہے کہ امرتسر سے کتاب پہلے چھپی تھی۔ یہ بات بھی اس طرح نہیں ہے۔ الندوہ میں تبصرہ اور امرتسر کی کتاب ایک ہی چیز ہے۔ البتہ تبصرے کی تکمیل کے بعد کتاب کی شکل میں اشاعت کے وقت الندوہ میں مطبوعہ حصے پر نظر ثانی کی گئی اور اصلاح اور بعض معمولی ترامیم کے بعد اسے شامل کیا گیا۔ ایک ترمیم یہی ہے کہ الندوہ کے پہلے نمبر میں مضمون کا جو تمہیدی حصہ ہے، اسے الگ کر کے کتاب کا مقدمہ بنا دیا ہے۔ اہم مباحث کے جلی عنوان اور بعض ذیلی عنوان

قایم کردینے میں بعض الفاظ بدل دیے ہیں، بعض کا املا بدل دیا ہے، بعض حوالے درست کردیے ہیں، الندوہ میں بعض حوالے چھوٹ گئے تھے انھیں مکمل کردیا گیا، لیکن مضمون وہی رہا ہے اور کہیں ایسا احساس نہیں ہوتا کہ کتاب پر تبصرے کو کتاب کا ترجمہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت:

یہ مضمون الندوہ کے شمارۂ فروری ۱۹۰۶ء میں اڈیٹوریل کے طور پر شایع ہوا تھا۔ یہ اپنے موضوع پر ایک مستقل زندہ و جاوید مقالہ ہے اور ایک سو سال کے بعد بھی مقالے کی اہمیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ سائنس کے موجودہ دور میں عوام کی تربیت کے لیے کتب خانوں کی اہمیت جس قدر واضح ہوگئی ہے، اس کا تذکرہ بھی تحصیل حاصل ہے۔قوم کے مختلف علمی و عملی طبقات کے لیے ان کے اصناف اور عمروں کے لحاظ سے مختلف سطح کی اور علوم وفنون کی تقسیم کے لحاظ سے بھی ہر شہر میں اور اس کے ہر علاقے اور ہر محلے میں لائبریریوں کے قیام کی اہمیت واضح ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا تو لائبریریوں کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یونیورسٹی کی سطح کے بعد بھی مختلف علوم وفنون کی تحقیقی لائبریریوں کے قیام کی ضرورت ختم نہیں ہوجاتی، اہمیت بڑھ جاتی ہے۔تعلیم کے بارے میں کسی قوم کا نقطۂ نظر اور ملک کی پالیسی معلوم کرنے کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ اس میں لائبریریوں کی تعداد معلوم کرلی جائے۔ اس کے اور بھی طریقے ہیں، مثلاً تعلیم کا بجٹ معلوم کرلیا جائے اور دفاع کے بجٹ سے اس کا موازنہ کرلیا جائے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں بدصورت شکل بدصورت اور حسین شکل حسین ہی نظر آتی ہے۔ ایشیائی، افریقی ممالک میں یہ تناسب اتنا افسوس ناک ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا ابوالکلام نے مضمون میں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ پہلے تو کتب خانے کے قیام کی عمومی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کتب خانہ بانکی پور (خدا بخش لائبریری، پٹنہ) اور اس کے بانی کی علمی فیاضی کا ذکر کیا ہے۔ پھر ندوۃ العلماء میں کتب خانے کے قیام کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے اور ندوہ کے قیام کے بعد اس سلسلے میں جن اصحابِ ذوق وایثار نے سبقت کی اور اپنے ذاتی کتب خانوں کے عطیات سے ایثار اور فیاضی کا ثبوت دیا ان کا ذکر کیا ہے، ان کے ذخیروں کے نوادرِ علمیہ پر سرسری روشنی ڈالی ہے اور اہلِ علم اور اصحاب وسایل کو ندوۃ العلماء میں ایک معیاری

کتب خانے کے قیام کی اہمیت پر توجہ دلائی ہے اور اس میں تعاون کرنے کی ترغیب دی ہے۔ یہ مضمون اپنی ضرورت اور نوعیت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ علامہ شبلی کے ایما و مشورے سے لکھا گیا ہوگا۔ ندوے میں کتب خانے کے قیام کی ضرورت اور اہمیت پر حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں بھی لکھا ہے۔ مولانا آزاد نے اپریل ۱۹۱۰ء میں ''ندوۃ العلماء کا جلسہ دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود'' میں بھی پرزور الفاظ و اُسلوب میں اس مسئلے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام کے خیالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا کے یہ خیالات صرف اسی زمانے میں قایم نہ ہوئے تھے، بلکہ ۱۹۰۲ء میں جب وہ احسن الاخبار میں مضمون نگاری کرتے تھے اور انجمن اصلاح قایم کی تھی تو اس کے تحت ایک ریڈنگ روم اور لائبریری بھی قایم کی تھی۔ مولانا نے اس کا ذکر اپنی کہانی میں کیا ہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے ہندوستان کی قدیم لائبریریوں کے جدید انتظامات اور نئی لائبریریوں کے قیام میں جو دلچسپی لی تھی وہ ہندوستان کی بہت بڑی خدمت اور اہم ضرورت تھی، اس میں خود ان کے ذوق کی تسکین کا سروسامان بھی تھا۔

۳۔ القضاء فی الاسلام:

فروری ۱۹۰۶ء کے الندوہ کا ایک اہم مضمون ''القضاء فی الاسلام'' ہے۔ یہ مضمون نہایت جامع ہے۔ الندوہ کے صرف آٹھ صفحوں میں سما گیا ہے لیکن موضوع کی اہمیت، اس کی تاریخ، اس کی ضرورت و پسِ منظر اور اہمیت، اس کے آداب و شرایط اور قاضی/جج کی خصوصیات اور اطراف پر محیط ہے۔ اس کے دایرہ و مباحث کی طرف مولانا نے اشارہ کردیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''اس مضمون میں ہم قانون کے حصہ قضائت سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور دکھلانا چاہتے ہیں کہ حضرت بانی اسلامؐ نے کس جامعیت کے ساتھ اس مسئلے پر نظر ڈالی اور کس خوبی اور شایستگی سے اس کے قواعد و قوانین ضبط کیے۔ اس بنا پر اس مضمون کے تین حصے ہوں گے:
>
> ۱۔ مدعی اور مدعا علیہ کے فرایض
>
> ۲۔ ثبوت و دعوے کا طریقہ
>
> ۳۔ شہادت کے اصول''

چناں چہ اگلے صفحات میں انھی پہلوؤں کی تفصیل نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔
الندوہ کا یہ شمارہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ تمام صفحات ابوالکلام کے تین مضامین نے گھیر لیے ہیں۔ ''ندوۃ العلماء میں ایک کتب خانے کی ضرورت''، صفحہ ۱ تا ۶، ''المرأۃ المسلمہ'' کی تیسری قسط، صفحہ ۶ تا ۲۴، تیسرا مضمون ''القضاء فی الاسلام'' ہے، جو صفحہ ۲۵ سے ۳۲ تک پھیلا ہوا ہے۔

۴۔ علمی خبریں:

الندوہ کے دستور العمل کے مطابق ''علمی خبریں'' اس کے مشمولات کا گویا ایک خاص باب تھا۔ الندوہ کی مکمل جلدیں تو پیشِ نظر نہیں کہ روایت کے استمرار کے بارے میں کچھ عرض کروں کہ کس دور میں اس باب کا کس درجے اہتمام رہا لیکن ابوالکلام کے دور کے پانچ نمبروں میں سے تین نمبروں میں علمی خبروں کا اہتمام نظر آتا ہے۔

اس عنوان کو دیکھ کر محترم قاری یہ گمان نہ کریں کہ جگہ کو بھرنے کے لیے اخبارات یا کتب و رسایل سے نقل و اقتباس کا ایک بے مقصد کام انجام پایا ہوگا۔ ان میں کبھی معلومات اور کبھی کچھ عجائب و غرائب ہوتے ہوں گے۔ لیکن دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ یہ تو ایک نہایت مفید، معلومات افزا اور فکر انگیز باب تھا اور کبھی تو دیکھتا ہوں کہ ان علمی خبروں کی اہمیت اور افادیت علمی اور تحقیقی مقالوں پر بھی بھاری ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ محض نقل و اقتباس کا کام نہیں، ان میں تالیف کے عمل نے ان کے حسن کو نکھار دیا ہے اور ان پر تبصرے کی تحریر نے ان کے محاسن اور افادیت کے پہلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے۔ اس سلسلے کے بعض اندراجات کی حیثیت ''علمی شذرات'' کی سی ہے، جس کے الفاظ اور جملے دل پر عبرت کا ایک نقش اور ذہن پر غور و فکر کی ایک لکیر چھوڑ جاتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۰۵ء کی ''علمی خبریں'' ہمارے سامنے ہیں۔ اس میں اوّلاً ''انگلستان میں جنون'' کے عنوان سے ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۳ء میں جنون میں مبتلا ہونے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد بتائی گئی ہے۔ اس میں سابق کے مقابلے میں تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔ اس کے اسباب میں شراب نوشی اور معاشرت میں غلیظ رجحانات کو بتایا گیا ہے۔ شراب میں الکحل کی آمیزش اس کا اہم عنصر ہے، جس کی مضرتوں نے معاشرے کو اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ ساتھ ہی الکحل کی حقیقت اور اس کے خواص پر روشنی ڈالی ہے اور اس شہرت کی نفی کی ہے کہ الکحل میں فواید کا عنصر اس کے نقصانات سے زیادہ ہے۔

علمی خبروں کے دوسرے اندراجات کتابوں کے متعلق ہیں۔

ا۔ ایک تحریر ہے کہ کتاب ''الفہرست ابن ندیم'' جو نہایت اہم اور گراں قیمت کتاب ہونے کی وجہ سے ہر صاحبِ ذوق خریدنے سے قاصر تھا، اب اس کی نقل مصر کے ایک تاجر نے چھپوانی شروع کردی ہے اور دوسری کتاب ''الاصابہ فی معرفتہ اسماء الصحابہ'' جس کو پہلی بار ایشیاٹک سوسایٹی بنگال، کلکتہ نے شایع کیا تھا اب اسے مصر کی ایک کمپنی شایع کر رہی ہے۔

۲۔ سالِ رواں ۱۹۰۵ء میں انگلستان نے اشاعت علوم و معارف پر ۹۹۷، ۲۸، ۱۶۲ گنی خرچ کی ہیں۔

۳۔ یورپ کی ایک انجمن یادگار الیاس ولکنس نے نوادر علمیہ میں تاریخ طبرستان اور بابرنامہ شایع کیا ہے۔

۴۔ ایک روسی مسلمان مصنف، جس نے اسلام کے بارے میں متعدد کتابیں پہلے تصنیف کی تھیں اور شایع ہوئی تھیں اب اس کی نئی تصنیف ''حقوق المراۃ فی الاسلام'' مصر سے شایع ہو رہی ہے۔

جنوری ۱۹۰۶ء میں علمی خبروں کے ضمن میں اللغتہ العامہ، جس نے اسپرنٹو کے نام سے دنیا میں شہرت حاصل کرلی ہے، اس کی ایجاد، پسِ منظر تخلیق، اسپرنٹو کی حقیقت، اس کی افادیت، اس کے اصول و قواعد، اس کے لٹریچر اور ان اہل علم و اصحاب کا مختصر تعارف کرایا ہے اور ان کی کارگذاریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اب اگرچہ اُردو میں بھی اس کے درس و تعلیم کی چند کتابیں میسر آجاتی ہیں لیکن ایسا علمی اور تحقیقی مضمون آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ حال آں کہ اب سے سو برس پہلے تو ایسے قیمتی معلوماتی مضمون کا تصور بھی دشوار تھا۔ لیکن ابوالکلام کے ذوق علمی کی بہ دولت الندوہ کے شایقین کو اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس نمبر میں یہی ایک مضمون ہے جو علمی خبروں کے صفحات میں شایع ہوا تھا۔

ان علمی خبروں کے خاتمے پر ''ابوالکلام آزاد دہلوی'' کا نام ''ندوہ۔ لکھنؤ'' کی صراحت کے ساتھ اس طرح درج ہے جیسے کہ الندوہ میں مصنفین کے نام درج کرنے کا طریقہ تھا۔ اس سے ہمارے اس خیال کو اور تقویت ملی کہ یہ اخبارات و رسایل اور جراید و کتب سے صرف نقل کر دینے کا عمل نہیں بلکہ تالیف و تدوین کا ایک نہایت اہم اور مفید کام ہے جو الندوہ کے اس باب میں انجام پایا ہے۔

اس بحث کو ہم مولانا شروانی کے بیان قاطع پر ختم کرتے ہیں۔ حضرتؒ ایک پیغام میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''تیس سال پہلے کا الندوہ علمی و تحقیقی مضامین کا خزانہ تھا اس میں کوئی مضمون سرسری یا سطحی شایع نہ ہوتا تھا...... خبریں بھی وہی شایع ہوتی تھیں جو علمی شان لیے ہوتیں۔''

(بہ حوالہ ''مولانا ابوالکلام آزاد: مؤلفہ ضیاء الدین اصلاحی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۶)

۵۔ یورپ میں گونگوں کی تعلیم:

مولانا ابوالکلام کے قلم سے یہ مقالہ مارچ ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں صفحہ ۲۷ تا ۳۹، تیرہ صفحات پر محیط ہے۔ اس مضمون میں گونگوں کی معذوری اور ناقدری پر دنیا کے ابتدائی ماتم سے لے کر موجودہ دور میں ان کی کامرانیوں اور فتح مندیوں تک کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

> ''انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں اگرچہ علوم وفنون موجودہ قالب اختیار کر چکے تھے، علم کی روشنی یورپ سے نکل کر دور دور تک پہنچ چکی تھی، قرونِ وسطیٰ کی بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو گئیں تھیں، لیکن اس مسئلے پر جب کبھی توجہ ہوئی تو اس درجے ناممکن سمجھا گیا کہ کسی عالم نے اپنی کوششیں اس کے لیے وقف نہیں کیں۔ لیکن صدی کے آخری حصے میں یکا یک قدرت نے انسان کے اس بے انتہا مظلوم طبقے پر رحم آمیز نگاہ ڈالی اور اس کی علمی لذتوں سے محرومی کا طول طویل زمانہ ختم ہوا۔ یورپ میں جا بجا اس امر کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس بے زبان فرقے کو جہالت اور محتاجی کی حالت سے نجات دلائی جائے۔ لاکھوں روپے اس کام کے لیے وقف کیے گئے، بیسیوں انجمنیں اس مقصد سے قایم ہوئیں، یہاں تک کہ آج ان کوششوں کے نتایج حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں اور دنیا حیرت کی نگاہوں سے اس اعجاز کامیابی کو دیکھ رہی ہے، گونگے بول رہے ہیں، مخاطب کا مفہوم سمجھتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہیں، لکھتے پڑھتے

ہیں، دنیا کی روزمرّہ ترقی میں ہماری طرح حصہ لیتے ہیں، تجارت میں وہ نظر آتے ہیں، ہر قسم کی علمی ملازمتیں وہ کرتے ہیں، ان کے خاص خاص اخبارات نکلتے ہیں، جس کے ایڈیٹر اور مضمون نگار اسی طرح کے فاضل افراد ہوتے ہیں، ان کی خاص انجمنیں ہیں جن کے ممبر، سیکرٹری گونگے ہی ہوتے ہیں۔ غرض کہ علم و تمدّن کی روشنی سے اس طرح اپنے ضمیر کو منور کرتے ہیں کہ دنیا کی کوئی علمی لذت اور تمدّنی دل چسپی ان سے اپنا دامن نہیں سمیٹ سکتی۔''

میں نے اس مضمون کا یہ طویل اقتباس اس غرض سے دیا ہے کہ میں یہ کہہ کر چھوٹ جاؤں کہ گونگوں کی تاریخ کی ابتدائی بدتر حالت سے علمی دور کی موجودہ بہتر حالت تک مختلف ادوار میں جو ترقیاں حاصل ہوئی ہیں اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اس مضمون میں چھوٹ گیا ہو۔ ایک طرف تو ایک مرض کی حیثیت سے گنگ کی فزیکل حالت پر تحقیق کی گئی کہ یہ گنگ عارضی ہے یا پیدائشی؟ پھر ان اسباب کی تشریح اور علاج کی تجویز و تجربات کی صبر آزما طوالت تھی۔ صدیاں تو نطق و سماعت کے تعلق کو دریافت کرنے میں گزر گئیں، دوسری طرف گونگوں کے لیے زبان کی جستجو تھی، اس زبان کے لیے حروف والفاظ کی شکل و ساخت کا مسئلہ تھا۔ اس کی تعلیم کی مشکلات تھیں۔ چوں کہ یہ ایک فرد کا مسئلہ نہ تھا، لاکھوں انسانوں کا مسئلہ تھا۔ یہ کسی ایک ملک کا مسئلہ نہ تھا بلکہ کرۂ ارضی پر پھیلی ہوئی انسانیت کے ہر خطے کا مسئلہ تھا۔ ان مسایل پر قابو پانے کے لیے وسایل اور افراد کی ضرورت اور پھر ان کی تعلیم و تربیت کی دشواریاں تھیں۔ تحقیق کا یہ سلسلہ بھی کسی ایک علم یا فن کے میدان کا نہ تھا۔ ایک فن کا دوسرے سے اور دوسرے کا تیسرے سے رشتہ جڑا ہوا تھا۔ ہر دایرے میں، تحقیق کے ہر دور میں ہزاروں اصحاب علوم و فنون کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں تھیں۔ ہر محقق اور مفکر کی اہمیت تھی، کسی ایک شخص نے کسی ایک وقت اور ایک تجربہ گاہ میں یہ مسئلہ حل نہیں کرلیا تھا۔ تحقیق کا یہ سلسلہ کہاں تک دراز ہوا اور کب اور کس نے اس تحقیق کے فیضان عام کا دروازہ کھولا، اس پہلے شخص کی شخصیت پر مؤرخوں کا اتفاق ہونا تو مشکل ہے، جس نے انسانیت کی خدمت کے اس میدان میں پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اور اگر اس میدان میں تگ و دو کا سلسلہ ابھی جاری ہے اور انسان تحقیق کی آخری منزل پر پہنچ نہیں گیا ہے تو آخری محسنِ انسانیت کا فیصلہ بھی کیوں کر ہوسکتا ہے۔ اس بیان کا بس اسی بات پر خاتمہ کر دینا چاہیے کہ یورپ کی خدمات اس میدان میں بے مثال

اور لایقِ ستایش ہیں اور اس سلسلے میں ابوالکلام کا یہ مضمون بہت بلند پایہ اور تحقیقی ہے۔

اور اسی طرح اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا ابوالکلام نے الندوہ کے نائب مدیر کی حیثیت سے جو چھ ماہ گزارے تھے ان میں علمی دنیا سے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا تھا۔ یہ بات اس مقام سے گزر چکی ہے کہ میں ان کے علم وفضل کا دعویٰ کروں اور الندوہ میں ان کی خدمات کا اعتراف کرواؤں۔ حضرت علامہ شبلی کی ستایش اور حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی کے اعتراف کے بعد کسی تیسرے شخص کے بیان وشہادت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی علم وفضل کی ایک نادرِ روزگار شخصیت تھے۔

ادارتی تعلق کے بعد:

الندوہ کی ادارت کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام کے قیام لکھنؤ کی مدت کا ستمبر ۱۹۰۵ء کے اواخر سے مئی ۱۹۰۶ء کے اوایل تک کا پتا چلتا ہے۔ الندوہ سے ضابطے کا تعلق انھی سات مہینوں کے اندر تلاش کرنا چاہیے۔ عام طور پر رواں مہینے کے پرچے کی اشاعت کے بعد اگلے نمبر کی تیاری کی طرف توجہ دی جاتی ہے، اس لیے یقین ہے کہ مولانا آزاد نے اکتوبر سے کام کا آغاز کیا ہوگا۔ اسی ماہ میں علامہ شبلی کے دو خطوں میں ''الندوہ'' کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں۔ ۲۱/اکتوبر ۱۹۰۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''مضمون واپس ہے۔ الندوہ میں درج ہونے کے لیے دے دیجیے۔ عبدالصمد طالب علم ندوہ جس نے میرا مضمون لکھا ہے، وہ لکھ دے گا...... یہ پرچہ جس میں عرنی کی لایف ہے اور جس میں آپ کا یہ مضمون بھی درج ہوگا، بہت جلد تیار ہوجائے۔ دیر ہوگی تو ذمہ داری آپ پر ہے۔''

(مکاتیب شبلی (حصہ اوّل)، ص: ۲۶۳)

ابوالکلام کا یہ مضمون جو علامہ شبلی نے واپس کیا، الندوہ میں درج کرلینے کی اجازت دی اور کتابت کے لیے عبدالصمد نامی طالب علم کو دینے کی ہدایت کی۔ یقیناً یہ فرید وجدی کی کتاب ''المرأۃ المسلمہ'' پر تبصرہ ہے جو انھوں نے ابوالکلام سے کروایا تھا اور نومبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں درج ہوا ہے اور یہی ان کا پہلا مضمون ہے جس نے الندوہ میں جگہ پائی ہے۔ (۱)

علامہ شبلی کا دوسرا خط ۲۸ر اکتوبر کا یادگار ہے۔ اس وقت وہ بھوپال گئے ہوئے تھے۔ وہیں سے انھوں نے لکھا:

''خط پہنچا۔ ایک مضمون آج بھیجا ہے، منشی محمد علی کے نام۔ صحت کے ساتھ لکھوایا جائے! عنوان آپ خود تحریر کیجیے۔''

اسی خط میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''ایک جلسہ ہوا، میں بیمار تھا۔ تاہم آدھ گھنٹے سے زیادہ تقریر کی۔ شاید لوگوں نے پسند کیا ہو!''

القاب وآداب سے دونوں خط مبرا ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الندوہ میں مولانا آزاد نے اکتوبر ۱۹۰۵ء سے کام شروع کر دیا تھا۔ الندوہ کا آخری نمبر، جس میں ان کے مضامین ہیں، مارچ ۱۹۰۶ء کا شمارہ ہے۔ اگر چہ لکھنؤ میں ان کی موجودگی کا پتا مئی کے پہلے ہفتے تک چلتا ہے اس لیے اگر اپریل تک الندوہ سے ان کا تعلق رہا ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ مئی میں الندوہ سے ان کا ضابطے کا تعلق ختم ہو گیا لیکن ندوۃ العلماء کے مقاصد علمیہ ودینیہ سے ان کا تعلق کبھی ختم نہ ہوا۔ وہ اس کی علمی، تعلیمی اور اخلاقی واصلاحی تحریک سے ہمیشہ وابستہ رہے، اس لیے انھوں نے اس کے ترجمان ''الندوہ'' کو بھی فراموش نہ کیا۔ اس زمانے میں ان کے دو اہم مضمون شایع ہوئے:

۱۔ مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی (ا) یہ مضمون اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شایع ہوا تھا اور

۲۔ ''ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود۔'' اپریل ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا۔

۱۔ مسلمانوں کا ذخیرہ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی:

مولانا ابوالکلام کا یہ مضمون الندوہ کے شمارہ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون کے شروع میں مولانا کا ایک تمہیدی نوٹ ہے جسے اس مضمون کا پیش لفظ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں مولانا نے مضمون لکھنے کے مقصد اور اس کے دائرۂ بحث پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلے تو انھوں نے مسلمانوں کو شرم دلائی ہے کہ جس میدان میں زمانہ ان کے قدِ ہمت کا منتظر تھا، اس میں اغیار اُن

سے بازی لے گئے۔ اس کے بعد مولانا نے اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے عربی تاریخ وادب کا جو بیش بہا سرمایہ قریب تھا کہ ضایع ہو جائے، یورپ کی سرپرستی سے وہ محفوظ ہو گیا اور ان کی کوششوں سے عربی زبان اور علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ہمارے علما کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا۔ مولانا آزاد نے اس مضمون کی وضاحت کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ پہلے حصے میں یہ دکھلایا ہے کہ یورپ کو عربی زبان اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی اور عربی صرف ونحو اور لغت وادب میں کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں مرتب ہوئیں اور شایع کی گئیں؟

۲۔ مضمون کے دوسرے حصے میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شایع ہوئیں! الندوہ میں اس مضمون کا پہلا حصہ چھپا ہے، دوسرے حصے کے شایع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

جہاں تک عربی زبان وادب، صرف ونحو اور لغات وامثال کی طرف یورپ کی توجہ اور تحقیق کی تاریخ کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنے مضمون کی دو سطروں میں فیصلہ کر دیا ہے کہ ”گیارھویں صدی کے اوایل سے مسلمانوں کے علوم وفنون پر یورپ کی توجہ ہوئی اور چودھویں صدی کے اواخر تک فلسفے کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو گئیں۔“ اور جہاں تک تفصیل کا تعلق ہے تو یورپ کے محققین کے کارناموں اور عربی زبان، صرف ونحو اور لغات وضرب الامثال میں ان کی تصنیفات اور خدمات علمیہ کے تذکرے سے یہ مضمون بھرا ہوا ہے۔ دوسرے علوم میں ان کے کارناموں کے تذکرے کا تو ابھی آغاز بھی نہیں کیا۔ زیر نظر دایرے میں معلومات کی تفصیلات مولانا کے مضمون میں پڑھ کر لطف اندوز ہوں۔

۲۔ ندوۃ العلماء کا جلسۂ دہلی اور مسلمانوں کی شاہراہِ مقصود:

۱۹۱۰ء میں مارچ کی آخری تاریخوں میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ دہلی میں زیرِ صدارت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں منعقد ہوا تھا۔ یہ اجلاس بڑا شان دار اور کامیاب تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی روداد لکھی تھی جو الندوہ کے اپریل کے شمارے میں چھپی ہے۔ نوع کے اعتبار سے

تو یہ روداد آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا احوال ہے لیکن ندوہ کی تاریخ، اس کے مقاصد، اس کی خدمات اور براعظم ہند پاکستان میں اس کی دعوت کے مستقبل پر ایک پر جوش، اثر انگیز، بلند پایہ اور مستقل مضمون ہے۔ اجلاس کے فیصلوں پر شان دار تبصرہ اور بہترین توقعات کا اظہار ہے۔ ابوالکلام نے اس کی جزئیات تک سمیٹ لیں اور مقررین کی تقریروں پر بہ شمول خطبۂ صدارت کے ان کی جامعیت اور عدم جامعیت تک کا فیصلہ کر ڈالا ہے۔ ندوے کی کامیابیوں اور کارگزاریوں پر تبصرے میں بعض دیگر باتیں بھی آگئی تھیں جو، دوسروں کے لیے کوئی پسندیدہ تذکرہ نہ تھا۔ یہ بات کہ ندوہ قدیم (دارالعلوم دیوبند) اور جدید (مدرستہ العلوم علی گڑھ) میں اعتدال ووسط کی راہ ہے، خواہ کتنے ہی خوبصورت لفظوں اور دل آویز اُسلوب میں کہی جاتی دونوں کے لیے پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس میں دونوں کے نقش کی ناتمامی اور نصب العین کی پستی کا مطلب ضرور نکلتا تھا اور یہ بات دونوں کے رہبروں اور کارکنوں کے لیے گوارا ہی نہیں تھی۔

ندوہ دارالعلوم اور مدرستہ العلوم دونوں کے نزدیک بچہ تھا، جس نے اپنے بزرگوں کو ٹوکنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی اس گستاخی کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کی بات تھی۔ دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد نے تو برداشت کرلیا، لیکن کالج کے اصحابِ اخلاص ضبط نہ کرسکے۔ اس کا شدید ردعمل ہوا۔ ماہنامہ البشیر (اٹاوہ) میں ایک زور دار تنقیدی مضمون شایع ہوا، جس کا عنوان تھا، ''علی گڑھ کالج پر ایک اور حملہ۔'' اس عنوان سے تنقید نگار کی رنجش ہی کا پتا نہیں چلتا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ندوے کی یہ پہلی گستاخی نہ تھی بلکہ وہ پہلے بھی اس قسم کی کوئی شرارت کر چکا تھا۔ اب اس نے ایک اور نالایقی کا ثبوت دیا تھا۔ اب اسے معاف نہیں کیا جاسکتا تھا، ضروری تھا کہ اسے سزا دی جائے۔ لیکن اب ندوہ بچہ نہیں تھا، ایک جوانِ رعنا تھا اور اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب اسے کسی مدرسے یا کالج کے بزرگ کے غور و پرداخت یا سرپرستی کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بات اٹاوہ کے بزرگ بھی جانتے تھے اس لیے وہ اپنے ہی اوپر غصہ اتار رہے تھے اور کالج کے ارباب اہتمام و انصرام کو مشورہ دے رہے تھے کہ انھیں آخری فیصلہ کرلینا چاہیے۔ یہ تذکرہ علامہ شبلی کی زبان ہی سے سنیے۔ ابوالکلام ہی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کی رپورٹ جلسہ سالانہ ندوہ پر البشیر نے ایک اشتعال انگیز آرٹیکل لکھا ہے جس کی سرخی ''علی گڑھ کالج پر ایک اور حملہ'' ہے۔

اخیر میں لکھا ہے کہ:

''اگر یہ رپورٹ صحیح ہے تو ارکانِ کالج کو اپنا کام بالکل بند کردینا چاہیے اور قطعاً ایک آخری فیصلہ کرنا چاہیے۔''

ارکان کالج کو توجہ دلائی ہے کہ

''ندوہ وغیرہ سے قطعاً علاحدگی اختیار کریں، پرچہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''

(مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) مکتوب مورخہ ۱۲رجون ۱۹۱۰ء، ص ۲۶۱)

اگلے خط مورخہ ۲۴رجون میں یہ اطلاع دی ہے کہ:

''آپ پر البشیر نے جو آرٹیکل لکھا تھا، عبدالسلام نے اس کا جواب لکھ کر وکیل وغیرہ میں بھیج دیا ہے۔''

میرے خیال میں یہ رودادِ جلسہ مولانا آزاد کے ان بے شمار مضامین میں سے بہترین مضمون ہے جو انھوں نے ندوہ کی حمایت میں لکھے تھے اور الہلال میں شایع ہوئے تھے۔ مولانا نے دہلی کے اسی جلسے میں ایک پرزور تقریر بھی کی تھی، لیکن انھوں نے اپنی تقریر کا اس رپورٹ میں ذکر نہیں کیا۔ لیکن حضرت صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے ایک مکتوب گرامی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیاتِ شبلی'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس مقالے میں کسی جگہ اس پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

حواشی

۱۔ حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی'' لکھا جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا۔ اس کے بعد المراۃ المسلمہ کے نام سے...... (حیات شبلی: ص ۴۴۳)

حضرت سیّد صاحب کو اس بیان میں تسامح ہوا۔ ابوالکلام کا پہلا مضمون ''المراۃ المسلمہ'' ہے۔ جو نومبر ۱۹۰۵ء میں شایع ہوا تھا اور ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون......'' اس کے پورے تین سال کے بعد اکتوبر ۱۹۰۸ء میں چھپا تھا، جب کہ الندوہ سے مولانا آزاد کے ادارتی تعلق کے خاتمے پر ڈھائی برس کی مدت گزر چکی تھی۔ (ا۔س۔ش)

(۳)

الندوہ اور مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی

افادات حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی

''اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے۔ اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا۔ مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانے تک ان کو اپنے پاس ندوے میں رکھا۔ وہ ان کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے۔ یہیں انھوں نے مولانا حمیدالدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے جن کو قرآنِ پاک کے ساتھ عشقِ کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔

مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ'' لکھا، جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا (۱)۔ اس کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم امین بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصّل تبصرہ لکھا، جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے۔ یہی سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا۔ اسی قسم کے ایک خط کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں، ''آزاد کو تو آپ نے مخزن (۲) وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے معلومات یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔'' (مہدی ۱۹)

الندوہ میں ان کے مضامین نے ان کے نام کو ہر طرف پھیلا دیا اور اخباروں اور رسالوں سے ان کی مانگ شروع ہوگئی۔ آخر کار وہ ۱۹۰۶ء میں ''وکیل'' امرتسر میں چلے گئے، اور قریباً دو سال

وہاں رہے ہوں گے، اسی اثنا میں ان کے بڑے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یٰسین صاحب آہ کا عراق میں، جہاں وہ سیر وسیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے، انتقال ہوا (۳)۔ اور اس کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا خیر الدین صاحب نے، جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزار ہا مرید تھے، وفات پائی (۴)۔ رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا۔ اب انھوں نے امرتسر چھوڑ کر پہلے بمبئی میں اور پھر کلکتہ میں قیام کیا اور ہدایت وارشادِ خلق میں مصروف ہوئے۔ آخر ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ''الہلال'' نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں، لیکن اتحادِ اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمرہی جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے'' (۵)۔

> ''۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے، مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا، جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر عمادی صاحب کے سپرد ہوا، (سلیمان ۲۲) اور جون وجولائی ۱۹۰۸ء کے دونمبر ان کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالہ کردیا گیا، اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا۔''

(حیاتِ شبلی: ص ۴۵-۴۴۳)

الندوہ میں وقتاً فوقتاً جو مضامین نکلے ان میں سے قابلِ ذکر مضامین کی فہرست ۱۹۰۶ء میں خود مولانا (شبلی) نے ایک موقع پر دی ہے، جو یہ ہے:

> ''علوم القرآن، فلسفۂ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا؟ علوم جدیدہ، ابن رشد، فن بلاغت، تذکرہ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، فن نحو کی مروجہ کتابیں، مسایل فقہیہ پر ضروریاتِ زمانہ کا اثر، موبدانِ مجوس، ذوالنون مصری، فارسی شاعری اور عرفی شیرازی، مسلمانوں کی بے تعصبی، پردہ اور اسلام، ابن جوزی کی کتاب مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو، جمہرۃ البلاغہ، سوانح امام بخاری اور ان کی تصنیفات، المرأۃ المسلمہ پر ریویو۔'' (۶) (ایضاً: ص ۴۴۴)

حواشی

۱۔ الندوہ میں مولانا آزاد کا پہلا مضمون ''المرأۃ المسلمہ'' پر تبصرہ تھا جس کی پہلی قسط نومبر ۱۹۰۵ء میں شایع ہوئی تھی۔ ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم......'' مولانا کا تین سال بعد کا مضمون تھا۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شایع ہوا تھا۔

(ا۔س۔ش)

۲۔ رسالہ مخزن لاہور سے (سر) شیخ عبدالقادر ۱۹۰۱ء سے نکالتے تھے، مولانا ابوالکلام کے ابتدائی مضمون اسی میں نکلے تھے، خود میرے بھی ابتدائی مضمون اسی میں چھپے تھے۔ (علامہ سید سلیمان ندوی)

۳۔ ابوالنصر غلام یاسین آہ کا انتقال کلکتہ میں ہوا تھا۔ مانک تلہ قبرستان میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہیں۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کے لیے عبدالرحمٰن نامی مشہور سیاح ممالک اسلامیہ کے ساتھ نکلے تھے۔ عراق میں بیمار پڑے، رفیقِ سفر نے حقِ رفاقت ادا نہیں کیا، تنہا چھوڑ دیا۔ عراق میں ہندوستانی قونصل خانے کے ایک رکن قصبہ نہٹور ضلع بجنور کے سیّد سجاد حیدر یلدرم نے کوشش کر کے انھیں ہندوستان واپس بھجوا دیا۔ پہلے بمبئی میں علاج ہوا، افاقہ نہ ہوا تو ان کے والد انھیں کلکتہ لے گئے، لیکن جاں بر نہ ہو سکے۔ شاید ستمبر ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ سیّد مقبول حسین وصل بلگرامی نے اپنے رسالے ''عالم گیر'' بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ان کے انتقال پر ایک شذرہ لکھا تھا۔

(ا۔س۔ش)

(۴)

ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالکلام آزاد

بقاے ندوہ کی جنگ میں مولانا کا حصہ

(۱۹۰۶-۱۴ء)

(۱)

پچھلے صفحات میں جو کچھ عرض کیا ہے وہ شبلی ابوالکلام تعارف و تعلقات اور تاثرات کے ضمن میں تھا۔ یا ''الندوہ'' سے مولانا آزاد کے ضابطے کے تعلق کے حوالے سے تھا۔ لیکن ان دونوں کے تعلقات کا تذکرہ اسی مقام پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سے آگے تعلقات کا دوسرا دور آتا ہے۔ یہ دور ایک بزرگ و خرد کے تعلقات کا تھا۔ ایک طرف بے پایاں شفقت تھی اور دوسری جانب عقیدت و احترام اور سعادت مندی کا اظہار تھا۔ یہ ابوالکلام کی انفرادیت تھی کہ ان کا رویہ روایتی شاگرد کے بجاے برابری کا نظر آتا ہے۔ یہ حضرت شبلی کی عظمت ہے کہ انھوں نے اپنے اس خرد کی عزتِ نفس کا ہمیشہ خیال رکھا اور ابوالکلام کی یہ سعادت مندی تھی کہ انھوں نے اپنے بزرگ کے علمی مقام کا ہمیشہ اعتراف و احترام کیا۔ اور اب ۱۹۰۶ء کے بعد، اس دور میں جب کہ دونوں کے درمیان الندوہ کی ادارت اور اس میں نیابت کا کوئی تعلق نہ رہا تھا اور اسی دور کے دوسرے حصے میں جب الہلال کا اجرا عمل میں آچکا تھا، اس کی شہرت اور اس کے ساتھ ہی ابوالکلام کی مقبولیت بھی آسمان کو چھو رہی تھی اور ان کا شمار نام ورانِ ملت کی صفِ اوّل میں ہوتا تھا، ابوالکلام کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

شبلی و ابوالکلام کے تعلقات کی اس پائیداری کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ دونوں بے غرض اور ذاتی مفاد و مصالح سے نا آشنا تھے اور دونوں ایک دوسرے کے فضائل و

کمالات کے قدر دان اور ذوق علمی اور مطالعہ ونظر کی وسعت و گہرائی کے معترف تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دونوں ہم ذوق و ہم فکر تھے۔ ادب، مذہب، تاریخ، تعلیم، سیاست میں دونوں کا نقطۂ نظر یکساں یا قریب قریب تھا۔ ندوۃ العلماء دونوں کی توجہ کا مرکز تھا، سیرۃ نبوی کے منصوبے میں ابوالکلام شبلی کے مشیر و معاون تھے اور الہلال کی تعلیمی، سیاسی، اصلاحی تحریک میں شبلی آزاد کے ممد و معاون تھے۔ بلکہ الہلال کی سیاسی تحریک کے فروغ اور اس کے رنگ کو نمایاں کرنے میں آزاد کی تحریروں ہی کا نہیں شبلی کی تاریخی و سیاسی منظومات کا حصہ بھی ہے۔ آزاد کے تاریخی سیاسی مقالات میں ان کے اُسلوب، طرزِ فکر اور حسنِ استدلال نے جو کام کیا تھا انھی مسایل میں رائے کو ہموار کرنے اور ذوق و جذبات کی تربیت میں شبلی کا حصہ صاحبِ الہلال سے کم نہیں تھا۔

ابوالکلام کا تعلق الندوہ سے صرف ملازمت ہی کا نہ تھا۔ بہ قول ضیاء الحسن علوی کے، روپے کی تو انھیں طلب اور طمع نہ تھی بلکہ ندوۃ العلماء اور اس کی تحریک جدید سے دونوں کو دل چسپی تھی۔ یہ دل چسپی الندوہ کے تعلق سے نہ پیدا ہوئی تھی اور نہ اس تعلق کے خاتمے کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔ خود ابوالکلام کے بیان کے مطابق ۱۹۰۱ء میں ندوہ کے سالانہ جلسۂ کلکتہ سے ان کی دل چسپی کا آغاز ہوا تھا اور بعد کے دور میں نہ صرف شبلی کے انتقال تک بلکہ ۱۹۱۴ء کے بعد بھی ندوۃ العلماء، اس کے بزرگوں، خردوں سے ہمیشہ ان کے خلوص و مروّت کے تعلقات رہے۔ الندوہ سے ادارتی تعلق کے بعد بھی نہ تو انھوں نے شبلی سے راہ و رسمِ التفات ختم کی اور نہ الندوہ کو فراموش کیا۔ شبلی مرحوم سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں اور مراسلت کا سلسلہ بھی مرحوم کی وفات تک دراز رہا۔ مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) میں مکتوب نگار کے چالیس خط یادگار ہیں۔ پہلا خط ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء بہ زمانۂ قیام لکھنؤ کا اور آخری خط وہ تاریخی تار ہے جو وفات سے چار دن قبل سیرتِ نبوی کی اسکیم کے آیندہ انتظام کے لیے بلاوے کا تھا۔ اس مراسلت میں ابوالکلام کا حصہ چار خطوں تک ہے جو شبلی کے ذخیرہ علمی میں محفوظ رہے تھے۔ یہ خطوط ۲۶ر اگست ۱۹۰۸ء تا ۲۰ر اکتوبر ۱۹۱۰ء کے یادگار ہیں۔

۱۹۰۵ء میں حضرت علامہ شبلی نے حیدرآباد سے قطع تعلق کر لیا تھا اور نصف ثانی میں لکھنؤ پہنچ کر معتمدی کا چارج سنبھال لیا تھا۔ اس عہدے پر کئی سال پہلے ان کا تقرر کیا جاچکا تھا لیکن مختلف موانع کی بنا پر وہ اس کا چارج نہ لے سکے تھے۔ اب انھوں نے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے اسے تاریخ ندوۃ العلماء کے ایک نئے دورِ انقلاب کا آغاز قرار دیا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے

طویل اور معرکہ آرا مضمون میں، جو الہلال کی آٹھ قسطوں میں ۲۱؍جنوری سے یکم اپریل ۱۹۱۴ء تک شایع ہوا، ندوۃ العلماء کی ۱۹۰۵ء میں اس حالت پر نظر ڈالی ہے جب علامہ شبلی کی معتمدی کا دور شروع ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:

''دارالعلوم کی اس وقت کی حالت کا اگر اندازہ کرنا چاہتے ہو تو ایک مریضِ جاں بہ لب کے بستر کو دیکھو یا کسی لٹے ہوئے اور برباد قافلے کو! اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر پرانی دہلی کے ان کھنڈروں کی سیر کرو جن کی بہت سی دیواریں گر چکی ہیں اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عن قریب گرنے والا ہے۔''

اس تمثیل کے بعد مولانا ابوالکلام راست بیانی سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''افلاس و فقر، بے نوائی اور شکستہ حالی، کس پرسی و محتاجی، خرابہ کار اور بربادی محنت کا ایک ویرانہ تھا یا جس کے اندر تباہی و ہلاکت کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ ایک ظاہری صورت ضرور قایم تھی۔ مدرسہ تھا، مدرس تھے، طالب علم تھے، لیکن نہ تو روپیہ تھا، جس سے تمام کام زندہ رہتے ہیں اور نہ کوئی تعلیمی روح تھی جو بہت سے مادی نقصانوں کی بھی تلافی کر دیا کرتی ہے۔''

(الہلال: ۱۸؍مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۲۰۹)

مولانا آزاد نے محض استعارات اور اشارات ہی سے کام نہیں لیا بلکہ مالی حالت اور ندوے کی بعض ضرورتوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جن کو پورا کرنے کا کوئی سروسامان موجود نہ تھا۔ منشی محمد علی محرر دفتر نے اطلاع دی کہ ''تحویل بالکل خالی ہے۔ اور سو روپے ریاست حیدرآباد کے اور پچیس روپے دیگر ذرایع سے کل سوا سو روپے دارالعلوم کا مایۂ حیات تھا۔'' خرچ ڈھائی سو روپے تھا جو چندوں سے پورا ہوتا تھا۔ ''نگران کا بھی یہ حال تھا کہ کبھی روزی اور کبھی روزہ!'' فراہمیٔ زر کا کام نہایت مشکل ہو گیا تھا۔ شبلی مرحوم کی کوششوں سے تمام حالات و مشکلات پر قابو پا لیا گیا۔ گورنمنٹ ندوے کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا تھی، اس کے زیرِ اثر امرا مخالف تھے، عام لوگوں کو توجہ نہ تھی۔ علامہ شبلی نے سب سے پہلے اور ۱۹۰۵ء کے ختم ہونے سے قبل بھوپال سے پچاس روپے مقرر کروائے، گورنمنٹ کے شکوک دور کیے، بالآخر پانچ سو روپے ماہوار ایڈ مع ایک وسیع و بہترین قطعۂ زمین کے دیا گیا۔ دارالعلوم کی تاسیس کا عظیم الشان جلسہ ہوا اور لیفٹنٹ

گورنر نے بنیاد کا پتھر رکھا۔ ریاست رام پور سے سالانہ ایک رقم مقرر ہوئی۔ اس سے عام پبلک میں ایک نئی توجہ پیدا ہوگئی اور لوگ یک مشت رقمیں بھی بھیجنے لگے۔ اخبارات میں بھی اب ندوے کے کاموں کا تذکرہ کیا جانے لگا۔

سب سے اہم سوال دارالعلوم کی تعمیر کا تھا، جس کے لیے اقلاً ایک لاکھ روپیہ مطلوب تھا۔ مولانا شبلی نے تعمیر دارالعلوم کے لیے ایک اپیل شایع کی۔ ''یہ اپیل ریاست بہاوٗل پور کے خاندانِ شاہی تک پہنچی اور خدا تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی توفیق عطا فرمائی کہ پچاس ہزار روپے کے گراں قدر عطیے کا صرف بہاوٗل پور ہی سے اعلان ہوگیا۔ اسی طرح بورڈنگ ہاوٗس کی تعمیر کا انتظام بھی ہوگیا۔ مولانا شبلی نے جب اس کو لیا تھا تو سوا سو روپے ماہوار آمدنی تھی اور خزانہ بالکل خالی تھا۔ لیکن اب ایک ہزار روپے تک ماہوار آمدنی پہنچ گئی اور دارالعلوم اور بورڈنگ ہاوٗس کی عمارت کے لیے ستّر اسّی ہزار روپیہ جمع ہوگیا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی نے ندوے کے لیے سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ جس چیز کو لوگ بھلا چکے تھے، اسے پھر ان کے سامنے کر دیا اور جس کے لیے مایوسی کا فیصلہ ہوگیا تھا اس کے لیے امیدیں مرکر پھر زندہ ہوگئیں۔
>
> ایسا ہونے کے لیے صرف ایک ہی شاخِ عمل کافی نہیں ہے بلکہ مسلسل اور غیر منقطع کاموں کا ایک پورا سلسلہ چاہیے۔ دارالعلوم ندوہ کے متعلق جو کچھ ہوا وہ اس قسم کے کاموں کے لیے ایک عمدہ تجربہ ہے۔
>
> ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس، مدراس کے جلسے کے بعد بالکل موقوف ہوگئے تھے کیوں کہ نہ تو کام کرنے والے تھے اور نہ لوگوں ہی کو اس قسم کی دل چسپی باقی رہی تھی۔ مولانا شبلی نے کوشش کی کہ سالانہ جلسوں کا سلسلہ پھر شروع ہو۔
>
> سب سے پہلے بنارس میں اس کی تحریک کی گئی اور برسوں کے بعد ندوۃ العلماء کے انعقاد کا غلغلہ ہوا۔ پھر دوسرا جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ تیسرا دہلی میں اور پانچواں دارالعلوم کی نئی عمارت میں، جس کی صدارت کے لیے سیّد رشید رضا مصر سے آئے۔ گو علماے ندوہ نے کہا کہ ہمیں ان کی قابلیت معلوم نہیں۔ دارالعلوم کے

سنگ بنیاد نصب کرنے کا جلسہ بھی اسی سلسلے میں شامل ہے۔
ان جلسوں سے ملک میں ندوہ کی صدائیں دوبارہ بلند ہوگئیں اور اس کے متعلق عرصے کی خاموشی سے جو افسردگی پھیل گئی تھی، دور ہوگئی۔''

(ایضاً:ص ۱۰۔۲۰۹)

اس کے بعد مولانا آزاد نے ندوۃ العلماء میں شعبہ وار ترقیات اور علامہ شبلی کی رہنمائی میں اس کی کارگزاریوں پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ تعلیمی حالت، ۲۔ ادب وتفسیر، ۳۔ درجۂ تکمیل، ۴۔ علوم عصریہ وزبان انگریزی، ۵۔ تصنیف وتالیف، ۶۔ جماعت خدام اسلام (ایضاً: ۱۸؍مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۱۲۔۲۱۱)، ۷۔ کتب خانہ (ایضاً: ۲۵؍مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۲۳۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے ندوہ کی ''حیاتِ بعد الممات اور عروج بعد از زوال'' قرار دیا ہے اور اس کا سہرا حضرت علامہ شبلی کے سر باندھا ہے۔

مولانا آزاد نے صرف یہی ایک مقالہ نہیں لکھا بلکہ ''ایک عظیم الشان دینی تحریک کی انتہائی تخریب'' کے عنوان سے دو قسطوں میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی اسٹرائک کے مالہٗ وما علیہ پر ایک فکر انگیز مقالہ لکھا جس میں ان کے خیالات کی شدت کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسے ندوے کی عظیم الشان تحریک کے لیے انتہائی تخریب کا عمل قرار دیا ہے۔ یہ ندوے کی وہی تحریک ہے جسے اوّل الذکر مقالے کے آغاز ہی میں ''مسلمانانِ ہند کے قومی کاموں میں سے ایک عظیم الشان اور مایۂ امید واٰمال کام'' بتلایا ہے۔ (الہلال: ۲۱؍جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۴۱) ثانی الذکر طلبہ کی اسٹرائک والے مضمون کے آخر میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ:

۱۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو بہ ذریعۂ مجالس وجراید ندوے کی حفاظت واصلاح کے لیے متحد صدا بلند کرنا!

۲۔ فوراً ایک کمیشن کا تقرر جو لکھنؤ جائے اور دار العلوم کے مقاصد کی تحقیق کرے۔ اس سلسلے میں مولانا نے ملک کے دس زعما کے نام بھی پیش کیے کہ مجوزہ کمیشن میں یہ نام ضرور ہونے چاہییں۔

۳۔ ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد جو ندوے کے مسئلے کا آخری فیصلہ کردے۔

(ایضاً: ۴؍مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۱۷۴)

مولانا کے نزدیک یہ مسئلہ ندوے کی بقا اور موت کا مسئلہ تھا۔ اسی پر انھوں نے الہلال کے اگلے شمارے (۱۸ مارچ ۱۹۱۴ء) کا مقالہ افتتاحیہ لکھا اور اس کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ''اصحابِ درد وکار'' کو متوجہ کیا کہ وہ اس مسئلے کے حل اور ندوے کو اس کی تباہی سے بچانے کے لیے فوری قدم اٹھائیں۔ اس سلسلے میں مولانا نے طلبہ کو اپنے موقف کی وضاحت کا موقع دیا اور ان عاقبت نااندیشوں کو بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کا موقع دیا، جن کی غلط روی نے معاملے کو اس حد تک پہنچایا تھا۔ مولانا کے پرزور، حقایق سے معمور اور فکر انگیز مقالات نے ملک کو اس مسئلے کی طرف متوجہ کر دیا اور انجمن ہائے اصلاح ندوہ، جلسوں، اخبارات میں مراسلات و مضامین کی اشاعت کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ بالآخر مولانا کی تجویز کے مطابق ۱۰ رمئی کو دہلی میں ایک جلسے کا اعلان کر دیا گیا۔ الہلال نے کئی ہفتے تک اس اعلان کو مشتہر کیا اور جیسا کہ مولانا نے چاہا تھا کہ یہ نمایندہ جلسہ ندوے کے مسئلے کا آخری فیصلہ کر دے، زعماے ملت نے جمع ہو کر ایک فیصلہ کر دیا۔ اگرچہ اس جلسے کے بعد بھی بے چینی ختم نہیں ہوئی اور سازشوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن جلسے کے فیصلے سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اور اس طرح اکابرین ملت کی کوششوں سے ''ایک عظیم الشان دینی تحریک'' عاقبت نااندیشی اور تخریب کے انتہائی اعمال کے نتائج سے دوچار ہونے سے بچ گئی۔

ہمارے پاس کوئی ایسی ترازو نہیں کہ ندوے کو تباہی سے بچانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے حصے کا وزن کر کے بتلا دیں۔ لیکن ان کے حصے کی اہمیت اور اس کی سحر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت سیّد صاحب علیہ الرحمۃ کی رائے اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوے کے انقلاب اور اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا۔ انھوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف ندوہ، ندوہ کا شور برپا ہو گیا۔''

(حیاتِ شبلی: اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء، ص ۶۵۲)

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے لکھا ہے:

''ندوہ مولانا کی دل چسپی کا خاص مرکز تھا اور الہلال کا تقریباً ایک تہائی حصہ

ندوے یا مباحثِ ندوہ ہی پر مشتمل ہے۔۱۹۱۴ء کا تو شاید ہی کوئی شمارہ اس ذکرِ جمیل سے خالی ہو۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد: رام پور، ۱۹۶۸ء، ص۱۱۳)

حضرت مولانا سیّدابوالحسن علی ندوی نے بھی اسی حق کی گواہی دی ہے۔فرماتے ہیں:

"یہ ندوے کی وہ تاریخی اسٹرائک ہے، جس نے سارے ملک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور وہ اس وقت کے تعلیم یافتہ حلقوں کا ایک زندہ اور سنجیدہ مسئلہ بن گیا۔ ملک کے متعدد کثیرالاشاعت اور آزاد خیال پرچوں نے، جو نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول تھے، اس اسٹرائک کو ایک قومی و ملی مسئلہ بنادیا۔ ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور، مسلم گزٹ لکھنؤ، الہلال کلکتہ کے صفحات گویا علامہ شبلی کی حمایت اور طلبہ کی ہمدردی کے لیے وقف تھے۔ سب سے بڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کے آتش ریز اور طوفان خیز قلم نے ہلچل مچارکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالمِ اسلامی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا ہے اور ملت اسلامی کا عروج وترقی ندوے کی اصلاح پر موقوف ہے، جس کی راہ میں چند استبداد پسند اور قدامت پرست علما حایل ہیں۔ ملک میں جابجا جلسے ہورہے تھے، جس میں ندوے کی اصلاح اور طلبہ کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔"

(پرانے چراغ: مولانا سیّدابوالحسن علی ندوی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص۱۸۱)

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

مولانا ابوالکلام آزاد نے جس جوش وولولے کے ساتھ ندوے کے مسئلے میں حصہ لیا تھا اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ چوں کہ حضرت شبلی سے مولانا آزاد کو عقیدت ہے، ندوے کے مسئلے میں ان کی اس درجے دل چسپی اور یہ جوش وخروش اسی عقیدت کا شاخسانہ ہے۔ ندوۃ العلماء کے اچھے برے سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ بات فریق مخالف نے پروپیگنڈے کے نقطۂ نظر سے پھیلائی ہو کہ ان کو مسئلہ ندوہ کے معاملے میں غیر مخلص ثابت کرکے ان کی رائے کے وزن کو کم کردیا جائے لیکن واقعی کسی کی سنجیدہ رائے ہو یا پروپیگنڈا، بہ ہر صورت یہ بات اپنے

اندر کوئی سچائی نہ رکھتی تھی۔ مولانا نے علامہ شبلی کا نام لیے بغیر اس غلط فہمی یا بدگمانی کی صاف تردید کر دی ہے۔ مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

''مجھے اوروں کے دلوں کی خبر نہیں، لیکن بااین ہمہ خود میرے دل کو تو کامل طمانیت تھی اور الحمد للہ کہ بغیر کسی تنزلزل کے اب تک وہ طمانیت قایم ہے۔ میں اس تحریک میں جو کچھ حصہ لے رہا تھا، اس کو کسی شخص یا جماعت کی طرف داری سے تعلق نہ تھا بلکہ صرف اپنے یقین اور بصیرت کے ماتحت جو کچھ سچ دیکھتا تھا، لکھتا تھا۔ غلط فہمیاں آج پھیلائی جا سکتی ہیں اور نیتوں کو شک اور بدگمانی کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر کل تک انھیں قایم رکھنے پر کوئی قادر نہیں اور خدا کا ہاتھ سب سے زیادہ زبردست ہے۔ وہ جس طرح نیتوں کے کھوٹ کو فلاح نہیں دیتا اسی طرح غلط فہمیوں اور بے جا شکوک کو بھی زندگی اور طاقت نہیں بخشتا۔ میرے لیے یہ یقین اور اعتقاد کافی ہے کہ اگر میں ندوے کی اصلاح کی خواہش میں کسی فردِ واحد کی حمایت یا کسی جماعت کی ذاتی عداوت کے لیے کر رہا ہوں تو میری ہلاکت خود میرے کام کے اندر ہی سے پھوٹ نکلے گی اور میری آواز کو بھی سچی آوازوں کی سی عمر نصیب نہ ہوگی۔''

(الہلال: ۱۳/۲۰ مئی ۱۹۱۴ء، ص ۳۸۱)

بلاشبہ مولانا آزاد کو حضرت علامہ شبلی سے بہت عقیدت تھی۔ وہ ان کے فضایل علمی کے بہت مداح تھے۔ وہ ان کی جامعیت علوم وفنون کے بھی قایل تھے۔ لیکن وہ اس بات کے بھی قایل تھے کہ حضرت شبلی مرحوم نے ندوے کی معتمدی کی ذمہ داری سنبھالی تھی تو ندوہ ایک بے روح لاشہ تھا اور ۱۹۰۶ء کے بعد جو زندگی کے آثار اس میں پیدا ہوئے تھے وہ صرف علامہ شبلی کی مسیحائی اور ان کی توجہ اور محنت کا نتیجہ تھا اور صرف ندوے سے محبت کا تقاضا ہے کہ ندوے سے حضرت شبلی کے تعلق کو توڑ کر اسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے اور اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسئلے کا ایسا حل تلاش کیا جائے کہ ندوہ علامہ شبلی کی رہنمائی اور سرپرستی سے محروم نہ ہو۔ پھر مولانا آزاد نے جو کچھ لکھا تھا وہ بہ دلایل تھا اور ان دلایل کو رَد کر دینے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت علامہ شبلی کے موقف کی حمایت ندوے کی حمایت اور اس کی بقا سے محبت کا لازمہ تھا۔

پھر ایسا بھی نہ تھا کہ حضرت علامہ شبلی کو انھوں نے معصوم اور تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ قرار دیا ہو۔ مولانا آزاد نے شبلی کو بھی ان کے تساہل اور بروقت قدم نہ اٹھانے کا ذمے دار قرار دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صاف صاف لکھا ہے کہ ندوے میں ''حزب الافساد'' کے نشوونما پانے میں سب سے زیادہ حصہ مولانا شبلی ہی کا ہے۔ اگر وہ بروقت توجہ کرتے اور جرأت کا ثبوت دیتے تو تخم فساد نشوونما نہیں پا سکتا تھا۔ مولانا کی تحریر یہ ہے:

> ''سب سے اوّل تو میں افسوس کے ساتھ اس کا سبب مولانا شبلی کی کم زوری خیال کروں گا۔ کیوں کہ وہی ایک شخص تھے جو سب سے زیادہ ان کاموں کا درد رکھتے تھے اور ضرور تھا کہ وہی سب سے زیادہ کم زوری اور عدم استعمالِ وسایل کار کے جواب دہ بھی ہوں۔ انھوں نے نہ تو کبھی اپنی پوری قوت کا استعمال کیا اور نہ وہ وسایل اختیار کیے جن سے ندوے کی مجلس انتظامی کے اندر ہی ایک قوی حزب الاصلاح پیدا ہو جاتی! جو لوگ عمدہ خیال رکھتے تھے، نہ تو ان سے کبھی انھوں نے مراسلات کیں، نہ خاص مشورہ وصحبت کا سلسلہ قایم کیا اور نہ ہی باہر سے لوگوں کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش کی۔ برخلاف اس کے وہ لوگ پوری سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اور سعی و کوشش کا دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔''

(الہلال: یکم اپریل ۱۹۱۴ء، ص ۶۔۵)

حضرت علامہ شبلی فرشتہ نہ تھے، وہ خامیوں سے پاک اور کم زوریوں سے مبرّا نہ تھے۔ ان کے ارادت مندوں کی کمی نہ تھی لیکن ابوالکلام کی طرح ان کے ذوق ومزاج پر تنقید کی نظر شاید ہی کسی نے ڈالی ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرتِ نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے...... ایک مرتبہ...... میں نے کہا، ''آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے: ''قرآن اور سیرت محمدیہ'' اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط وترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقایع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں

ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو، وہ اس کی ابتدا ہمیشہ شک اور تردد سے کیا کرتے تھے اور جب تک یقین کے لیے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس چیز نے ان کی عملی زندگی کو بھی (یعنی کاروبار و انتظامات کی زندگی کو) بہت نقصان پہنچایا۔ اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ کر سکے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اس مطالعے کو پیش کرنے کے بعد اس کی صحت پر ندوۃ العلماء کے معاملات میں ان کے مشکوک و مذبذب رویے سے استدلال کیا ہے۔ اور یہ بھی ان کا مشاہدہ تھا۔ فرماتے ہیں:

''ندوے کے معاملے میں جو الجھاؤ لوگوں نے ڈالے، وہ ان کے اسی ضعفِ یقین و عدم جزم و صلابتِ ارادہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا۔''

(تذکرہ (مرتبہ مالک رام): دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۵۔۲۰۴)

مولانا آزاد نے ان مواقع کی بھی نشان دہی کی ہے، جب خرابیاں راہ پا رہی تھیں اور انھوں نے حضرت شبلی مرحوم کو توجہ دلائی تھی کہ وہ اسی وقت ان کا تدارک کر دیں، لیکن حضرت مرحوم کو توقع تھی کہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں، سب کی اصلاح کر دیں گے۔ لیکن شبلی مرحوم کا یہ خیال درست نہ تھا۔ شبلی کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں، ندوے کی تحریک کو نقصان پہنچ رہا تھا اور وہ اس سے بے پروا تھے۔ خود ابوالکلام کے نام خطوط میں سازشوں کی تفصیلات موجود ہیں لیکن اصلاح کا کوئی قدم اٹھتا اور تدارک کی کوئی راہ کھلتی نظر نہیں آتی تھی۔

حضرت علامہ شبلی ۱۹۰۵ء میں معتمد کی حیثیت سے لکھنؤ تشریف لائے اور ذمہ واریوں کو سنبھالا تو ان کے خلاف ایک مولویانہ اندازِ فکر موجود تھا۔ وہ مولویت کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان کا طرزِ زندگی، ان کا اندازِ فکر، ان کی آزاد خیالی، ان کی شاعری، ان کی تاریخی و سوانحی اور ادبی و تنقیدی تصنیفات بعض کے نزدیک گویا یہ مولویانہ کام ہی نہ تھے۔ ان کا دین کی خدمت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کی صحبت طلبہ کے لیے مضر تھی۔ سب سے زیادہ ناخوشی اس بات سے تھی کہ شبلی بے غرض تھے اور مخالفین کے پاس نہ کوئی ایسی تلوار تھی جو انھیں کاٹ سکے اور نہ کوئی ایسی طاقت تھی جو انھیں جھکا سکے۔ ایک وجہ شکایت و رنج یہ تھی کہ پورے ملک میں ان کی قابلیت کا

ڈنکا بج رہا تھا۔ بہاوّل پور، بھوپال، رام پور، حیدرآباد میں ان کی علمی شخصیت کا اعتراف موجود تھا اور خالص مذہبی اور نام نہاد دینی درس گاہوں، خانقاہوں اور ان کے مولویوں اور سجادہ نشینوں کے سوا تمام علمی و تعلیمی اداروں اور یونی ورسٹیوں اور ان سے وابستہ اور آزاد اہلِ علم اور اصحابِ فکر و رائے میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ پھر انھوں نے دو سال کے عرصے میں ندوۃ العلماء کی نشست ثانیہ کا جو سروسامان کر دیا تھا اور ندوۃ العلماء کے مخلصین کا جو حلقہ پیدا کر دیا تھا اور جس آسانی کے ساتھ مجلس انتظامیہ اور ارباب بست وکشاد کے فیصلوں پر اثر انداز ہو جاتے تھے اس نے ندوہ کے اندر کے بعض افراد کو مشتعل کر دیا تھا۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک ندوہ کے معاملات میں حضرت علامہ شبلی نے بہت سی اور غیر متوقع کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

خاص طور پر مارچ ۱۹۰۶ء میں ندوے کے سالانہ اجلاسِ بنارس اور علمی نمائش کے اہتمام میں کامیابی، مارچ ۱۹۰۷ء میں جلسہ عطائے اسناد، لکھنؤ، نومبر ۱۹۰۸ء میں لیفٹننٹ گورنر یوپی کی ندوے میں آمد اور اس کے ہاتھوں سنگِ بنیاد کا قیام اور حکومت کی طرف سے ایک معقول ماہانہ امداد اور قطعۂ زمین کے عطیے کے اعلان اور سالانہ جلسے کی شان دار کامیابی اور اس کے ساتھ ہی حضرت علامہ مرحوم کی نیک نامی اور ان کے اسمِ اعظم کی سحر انگیزی نے ان لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔ اب ان کے لیے شبلی نعمانی کا وجود بالکل ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا اور انھوں نے شبلی سے آخری جنگ کے لیے گویا ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ خود حضرت علامہ مرحوم مولانا آزاد کو اپنے خط مورخہ ۵ر دسمبر ۱۹۰۹ء میں اطلاع دیتے ہیں:

> ”اب کے مولوی خلیل الرحمٰن وغیرہ نے جلسۂ انتظامیہ میں میری علاحدگی کی تجویز پیش کی، اس لیے کہ جب سے میں ندوہ میں آیا لوگوں کی توجہ کم ہوگئی اور ندوہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ کیوں! آپ بھی اس رائے سے متفق ہیں یا نہیں؟ افسوس ہے کہ ان کے ووٹ نہیں آئے! ورنہ بمبئی میں آ کر ٹھکانا ملتا اور خوب صحبت رہتی!“

(مکاتیب شبلی۔ ا: اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء (چہارم)، ص ۲۶۴)

بھلا ندوہ کو نقصان اور لوگوں کی توجہ کی کمی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ شبلیؔ آئے تھے تو سوا سو روپے ماہانہ آمدنی تھی، ڈھائی سو روپے ماہانہ خرچہ تھا اور تحویل خالی تھی۔ اب پانچ سو روپے نقد ماہانہ گورنمنٹ سے آتے ہیں۔ حیدرآباد کے سو روپے بدستور آتے تھے۔ پچاس روپے بھوپال

سے اور پانچ سو روپے سالانہ شاید رام پور سے مل جاتے تھے اور ستر اسی ہزار روپے ندوے کے اکاؤنٹ میں دار العلوم اور دارالاقامہ کی تعمیر کی مَد میں موجود تھے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت افزا رویہ شبلی کا تھا! انھوں نے ایک فتنہ انگیز بات سنی ہی نہیں، ایک سنگین واقعہ ان کے سامنے پیش آیا اور انھوں نے قطعاً اس کی پروانہ کی۔ ان کے نزدیک یہ ایک مزاح تھا۔ انھوں نے اس کی سنگینی کا ذرا خیال نہ کیا، اس کا تدارک کیوں کر کرتے۔ حال آں کہ اس سے نہ اس وقت اور نہ آج کوئی انکار کرسکتا ہے کہ یہ ایک فتنہ تھا، جس نے سر اٹھایا تھا اور ضروری تھا کہ اسی وقت اسے کچل دیا جاتا۔

۲۰/دسمبر کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''رفیع الدین کی کامیابی سے میں بھی خوش ہوا اور منافقوں سے تو غریب اچھا کام کرے گا۔''

۲/مئی ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''دیوبند والوں نے ندوہ کو سخت نقصان پہنچانا چاہا، لیکن حکیم اجمل خاں صاحب نے مداخلت کی۔ تاہم وہ ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں۔ ڈھاکا تک استغاثہ ہوا ہے اور لطف یہ کہ مستغیثوں کے وکیل مولوی حفیظ اللہ صاحب ہیں۔''

اس مقام پر میں نے دو الگ الگ اقتباسوں کو ایک تبصرے کے لیے درج کر دیا ہے۔ پہلے اقتباس میں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ندوہ کی انتظامیہ میں منافق موجود ہیں۔ یہ بات شبلی کو معلوم تھی لیکن ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے انھوں نے کیا انتظام کیا؟ اس بات کا پتا نہیں چلتا۔ دوسرے اقتباس میں ریشہ دوانی کرنے والی ایک جماعت اور ایک فرد ہے۔ جماعت ''دیوبندی'' اور فرد خود ندوہ کا سابق ''صدر مدرس!''

دیوبند ایک مکتبِ فکر کا مرکز تھا۔ اس کا ایک دارالعلوم تھا۔ اس کا ایک نظامِ فکر و عمل تھا۔ ندوۃ العلماء کی تاریخ سے ۲۵، ۳۰ سال زیادہ پرانی اس کی تاریخ تھی۔ اور اس وقت تک وہ اپنے مقاصد کے سفر کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اس کے مقاصد میں ندوۃ العلماء کہیں اس کے راستے میں نہ آتا تھا۔ دیوبندیوں کا اپنے ادارے کے مقاصد کے لیے تگ و دو کرنا اور حصولِ مفاد کے اعمال بجالانا، خواہ ان سے ندوہ کے مفاد کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جاتا، ندوے کے خلاف ریشہ دوانی میں ہرگز شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ''مولوی حفیظ اللہ صاحب'' ۱۹۰۸ء میں ندوہ سے الگ ہو چکے تھے، اب وہ

ڈھاکا یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ان پر ضابطے کی کوئی ذمے داری نہ تھی۔ان کا شکوہ لاحاصل تھا۔یہاں سوال دیو بند والوں کے دفاع یا مولوی حفیظ اللہ صاحب کی وکالت کا نہیں، مسئلہ حضرت علامہ شبلی کے اقدام وتدارک کا ہے! حکیم اجمل خاں نے جو کچھ کیا سو کیا، خود حضرت علامہ شبلی نے حفظِ مفاداتِ ندوہ کے لیے کیا کیا؟ جواب یہ ہے کہ کچھ نہیں!

۷ ار نومبر ۱۹۱۰ء کے خط میں مخالفین کے عزایم والزامات کی جو تفصیلات نقل کی ہیں انھیں پڑھ کر تو حیرت ہوتی ہے کہ اسلام نے ان کی راج پوتی حمیت کو کس طرح مٹا دیا تھا کہ مخالفین کی اخلاق سے گری ہوئی باتیں سن کر بھی بے قابو نہ ہوئے۔تفصیل میں نہیں جاتا، خط کی اوّل وآخر کی چند سطریں نقل کرتا ہوں۔مخالفین کی اخلاق سے گری ہوئی باتیں پڑھیے اور حضرت شبلی کے ضبط و تحمل کی داد دیجیے۔فرماتے ہیں:

> ''آج کل سخت نرغہ ہے۔ سہارن پوری، شاہ جہان پوری، پھلواروی، کاکوروی، سب یک جا جمع ہیں۔ رپورٹیں تیار ہو رہی ہیں، مضامین لکھے جا رہے ہیں، قرارداد جرم مرتّب ہو رہی ہے، بلکہ ہو چکی ہے۔ اقرار نامۂ عقاید تیار ہو گیا ہے، جس کا مجھ سے اعتراف کرایا جائے گا اور ان سب کاموں کے چیف ایڈیٹر شاہ صاحب ہیں...... فردِ جرم بہت بڑی ہے...... اور سب پر مستزاد الحاد اور زندقہ! جن عقاید کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامت اوّلیاے حق (بھی ہے)......''

اور بہت سے الزامات جرایم کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:

> ''بھائی حقیقت یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے۔کہاں تک صبر کروں۔بار بار قلم اٹھاتا ہوں اور پھر رکھ دیتا ہوں۔طلبہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں، انھیں بڑی مشکل سے روکتا ہوں کہ فساد سے کیا حاصل ہے۔ دیکھیے کیا انجام ہوتا ہے؟''

اس ظلم کا انجام کیا ہوتا؟ یہ ہوا کہ ایک فتنہ کھڑا کر دیا گیا، شبلی کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری ہوا، ان سے ان کے عقاید کی باز پرس کی گئی اور ان کی اشاعت سے ندوے کی اصلاح کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے اور دنیا کو اپنا تماشا دکھانے کی پوری کوشش کی گئی۔اگر ندوے کی اصلاح کی تحریک

اتنی آگے نہ بڑھ چکی ہوتی اور حزب الافساد کی فتنہ انگیزیوں سے پردہ نہ ہٹ چکا ہوتا، تو نہ صرف ندوۃ العلماء کی عظیم الشان تحریک کا خاتمہ ہو چکا ہوتا، بلکہ شبلی کی علمی موت واقع ہو چکی ہوتی اور ان کی موت کے ساتھ ہی سیرت نبوی کی تالیف کا تاریخی منصوبہ بھی دفن ہو جاتا، نہ دارالمصنفین کا نقش ظہور پذیر ہوتا اور نہ اس کا مایۂ ناز سلسلۂ خدمات علمی و دینی کا کوئی نشان تاریخ ملتِ اسلامیۂ ہند کے صفحات میں نظر آتا!

حضرت شبلی مخالفین کے ہجوم کو ظلم اور ظلم بھی حد سے بڑھا ہوا قرار دیتے ہیں لیکن اس ظلم کو مٹانے کی کوئی تدبیر نہ خود کرتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں بلکہ رفع ظلم کے عمل کو فساد قرار دیتے ہیں۔ حال آں کہ فساد ان فتنہ پروروں نے پھیلایا تھا۔ شبلی مرحوم کا رویہ اس کے فروغ کا موجب بنا تھا اور اس کے نتائج نے نہ صرف انھیں پریشان کر دیا تھا بلکہ ندوے کی عظیم الشان تحریکِ اصلاح کے مٹا دینے کا سروسامان کر دیا تھا۔ مخالفین کی تمام کارروائیاں علی الاعلان تھیں۔ شبلی کو خلوت میں بات کرنے اور ندوے کو تباہی سے بچانے کے لیے اپنی کوششوں کو منظم کرنے میں بھی تذبذب تھا۔ اس تذبذب کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا کہ پورے ملک کو اس فتنے نے ہلا کر رکھ دیا۔ اگر ابوالکلام، حکیم اجمل خاں نہ ہوتے، مولانا محمد علی آخر آخر میں اپنا رویہ نہ بدلتے، دیگر سنجیدہ حضرات میدان میں نہ نکلتے تو ندوے کی قسمت کا فیصلہ تو ہو ہی چکا تھا۔

بہ ہر حال مولانا ابوالکلام میدان میں نکلے، لیکن اس میں شبلی سے محض عقیدت نہ تھی، ندوہ کے حفظ و بقا کا مسئلہ خود اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے اپنا سب کچھ لٹایا جا سکتا تھا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آنا چاہیے تھا۔ ابوالکلام نے یہی کیا۔ اس میں شبلی کے علمی مقام اور ان کی عزت و آبرو کا تحفظ بھی تھا۔ ابوالکلام کے سامنے اگر یہی مقصد ہوتا تب بھی اس کے لیے جواز تھا۔ ابوالکلام نے شبلی کی کوئی بے جا طرف داری نہ کی تھی۔ وہ ندوہ اور اس کی تحریکِ اصلاح کے مخلص و موید تھے اور انھوں نے اس کے تحفظ و بقا کی تحریک میں اپنی جان لڑا کر ایک اہم ملی و اسلامی فریضہ انجام دیا تھا۔ انھوں نے ندوے کو انتہائی تخریب اور تباہی سے بچا لیا تھا لیکن اس فتنے کے ختم ہوتے ہوئے شبلی گور کنارے پہنچ گئے۔ تاریخ کے نئے دور میں اور کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے زندہ نہ تھے۔

تحریک اصلاح و بقائے ندوہ اور رفعِ اختلاف کے سلسلے میں جو جلسہ ۱۰ رمئی کو دہلی میں حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں کی کوشش سے ہونے والا تھا، اس کی مخالفت کی گئی، حتیٰ کہ جلسے کے دوران

اسے درہم برہم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن جلسہ ہوااور اپنے مقصد میں نہایت کامیاب ہوا۔ اس نے مسئلے کا فیصلہ کر دیا اور جو فیصلہ کیا تھا اسے ندوے کی قابض انتظامیہ کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ جلسے کے بعد مولانا آزاد نے ۱۳ اور ۲۰ رمئی ۱۹۱۴ء کے مشترکہ شمارے میں اس پر تبصرہ کیا ہے۔ مسئلے کی اہمیت اور حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنے کے لیے اس مضمون پر نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔ اس کے بعد ایک اور مضمون میں اس مسئلے اور اس کے اطراف پر نظر ڈالی ہے، اس کے بعد ان کے قلم سے کوئی تحریر نظر نہیں آئی۔ سلسلہ بحث اصلاح و بقاے ندوہ و تصفیۂ اختلافات کے باب میں آخری اہم تحریر حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں کے قلم سے یادگار ہے جو جلسہ اور اس کے بعد کے حالات پر تبصرہ اور بعض غلط فہمیوں یا غلط بیانیوں کے رفع و جواب میں ہے۔ اس پر اس بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام نے ندوے کی بقا اور اصلاح کے لیے جو بے غرضانہ کردار پیش کیا تھا اس کا اعتراف علامہ شبلی اور ان کے پورے حلقۂ اثر کو تھا اور ملک کے باخبر حلقوں میں یہ بات ہر کسی کو معلوم تھی کہ ندوے کے فتنہ و فساد کو رفع کرنے میں مولانا ابوالکلام کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی کا اعتراف، ہم پچھلے صفحات میں نقل کر آئے ہیں، جو اس امر میں قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔

اگر الہلال کے ان تمام مضامین، مقالات، افتتاحیہ اور شذرات و مراسلات کو جمع کرلیا جائے جو مولانا نے ندوے کے دفاع میں لکھے تھے تو ندوے کی ایک ضخیم اور نہایت دل چسپ سبق آموز اور عبرت خیز تاریخ وجود میں آجائے گی۔ لیکن یہاں اس طول کلامی کا مقصد صرف یہ تھا کہ مولانا ابوالکلام کے ندوے سے تعلق کو علامہ شبلی سے تعلقاتِ ارادت اور عقیدت کا رہینِ منت نہ سمجھا جائے۔ وہ ندوے کی تحریک کی اہمیت کی وجہ سے اس کے مؤید تھے۔ ندوے سے ان کا تعلق حضرت شبلی مرحوم سے راہ ورسم سے پہلے شروع ہوا تھا اور ان کے انتقال کے بعد خود مولانا آزاد کی زندگی کے آخری لمحوں تک قایم رہا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ ندوہ کا جو دور شبلی کی معتمدی اور ان کے تربیت یافتگان اور تلامذۂ خاص کے دور تک رہا تھا، وہ اپنی پیداوار کی قدر و قیمت کے لحاظ سے پلٹ کر نہیں آیا۔ مولانا ابوالکلام کے الفاظ میں:

> ”یہ ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی صورتیں تھیں جو اس کے دارالعلوم کے اوّلین دور کے نتایج قایمہ ہیں اور جو اپنی ممتاز خصوصیات کے اندر لوگوں کے لیے ایک

دعوتِ جالب اور پیغامِ جاذب تھے۔"

(الہلال: یکم اپریل ۱۹۱۴ء، ص ۵)

ندوہ اپنے مقاصد کی اہمیت اور تعلیمی خدمات کے دائرے میں ہندوستان کی ایک بڑی درس گاہ ہے اور اس کے پڑوسی ممالک میں بھی اس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ ندوہ مسلمانوں کی ایک قابلِ فخر تحریک اصلاح ملی کا مرکز ہے۔ وہ اپنی ایک شان دار تاریخ اور نیک نامی کی شہرت رکھتا ہے۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ندوہ سے مولانا آزاد کا تعلق ندوہ کے لیے تھا۔ اس کے تعارف کی تقریب خواہ کچھ ہوئی ہو اور وقتی طور پر کسی کی موجودگی کا ان پر کچھ اثر ہوا ہو لیکن ندوے سے ان کا تعلق نہ کسی کی وجہ سے تھا، نہ کسی کے لیے اور نہ وقتی تھا۔ وہ قیام ندوہ کے مقاصد کی اہمیت کا یہ تقاضا سمجھتے تھے کہ اس کو فتنہ و فساد کی نذر ہو جانے سے بچایا جائے۔ اسی لیے ندوے کے خطرات سے محفوظ ہو جانے کے بعد بھی اس سے ان کی دل چسپی ختم نہیں ہوگئی۔ ۶-۱۹۰۵ء میں ندوے کے جن بزرگوں، مثلاً علامہ شبلی نعمانی، حضرت نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا حکیم سیّد عبدالحی حسنی سے تعلقات پیدا ہوئے تھے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف ان کی زندگیوں میں نبھایا بلکہ ان کے بعد ان سے رشتے یا شاگردی کا تعلق رکھنے والے ان کے خردوں سے بھی اپنی زندگی میں ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا۔ حضرت شبلی کے شاگردوں کی پوری جماعت سے، جن میں مولانا مسعود علی ندوی، سیّد سلیمان ندوی، عبدالسّلام ندوی، عبدالباری ندوی وغیرہم، حضرت صدر یار جنگ رحمہ اللہ کے خلف سعید حضرت عبید الرحمٰن خاں شروانی اور ان خلف الرشید ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی سے ان کا ایسا ہی شفقت اور مولانا حکیم سیّد عبدالحی حسنی کے بعد ان کے اخلاف ڈاکٹر عبدالعلی حسنی اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہما اللہ تعالیٰ سے ان کا ہمیشہ محبت اور شفقت کا برتاؤ رہا۔ مولانا علی میاں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر اپنے یادگار مضمون میں ذکر کیا ہے۔ ۱۹۳۹ء کی مولانا سے ایک ملاقات کی گفتگو کے بارے میں لکھا ہے:

"مولانا (ابوالکلام) اس مجلس میں دیر تک ندوے کا، مولانا شبلی کا اور ندوے کی تحریک کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے رہے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس تحریک کے پورے طور پر کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے بعد پھر کوئی اس کے

آستانے پر آ کر پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں گیا۔''

(پرانے چراغ (حصہ دوم)، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۲۔۵۱)

حضرت مولانا علی میاں نے کئی بار ندوے میں ان کے تشریف لانے، اس کے طلبہ اور حضرت سیّد صاحب وغیرہم سے ملاقات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

''ایک مرتبہ اور بھی طلبہ کی دعوت پر مولانا طلبہ کی انجمن ''الاصلاح'' میں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ مولانا کے ساتھ مولانا عبدالقادر قصوری بھی تھے۔'' (ایضاً: ص ۵۳)

ایک مرتبہ مولانا علی میاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی دعوت پر دہلی تشریف لے گئے تا کہ ان کی موجودگی میں ''نزہۃ الخواطر'' کی بقیہ جلدوں کی اشاعت کے لیے توجہ دلائی جائے۔ دہلی میں ملاقات ہوئی، حضرت شیخ الاسلام نے مولانا علی میاں کا تعارف کرایا اور ''نزہۃ الخواطر'' کا ذکر کیا۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

''مولانا (ابوالکلام) نے اپنی واقفیت اور دل چسپی کا ذکر کیا اور فرمایا، ''اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہیے۔'' میں نے عرض کیا کہ کیا یاد دہانی کی ضرورت ہوگی؟ تو فرمایا نہیں! چناں چہ ایسے ہی ہوا۔ ادارے سے اس کے بقیہ حصے طلب کر لیے گئے اور پوری کتاب چھپ کر شائع ہوگئی۔'' (ایضاً: ص ۵۷)

ایک اور ملاقات کے بارے میں مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

''تیسری ملاقات نئی دہلی میں مولانا کی قیام گاہ پر ہوئی، جس میں مولانا عمران خاں صاحب ساتھ تھے۔ ہم لوگ ندوے کے ایک کام کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ مولانا نے اس سے بڑی دل چسپی لی اور مفید مشورے دیے اور بہت جلد اس کام کی تکمیل ہوگئی جس کے لیے ہم گئے تھے۔'' (ایضاً)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مولانا ابوالکلام پر یہ ایک یادگار مضمون ہے۔ اس کے خاتمے میں انھوں نے مولانا کے بارے میں لکھا ہے:

''وہ (مولانا ابوالکلام) ہندوستانی سیاست اور ہماری قدیم تہذیب و ثقافت کا ایک ستون تھے۔'' (ایضاً: ص ۶۰)

نوٹ:

اوپر کے ایک اقتباس میں بعض اشخاص کا ان کے ناموں کے بجائے ان کی وطنی نسبتوں سے ذکر آیا ہے۔ یہ ندوے کی تاریخ کی اہم شخصیات ہیں، لیکن آج کے بہت سے قارئین انھیں ان کی وطنی نسبتوں سے شناخت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی نسبتوں کے ساتھ ان کے ناموں کی وضاحت کر دی ہے۔

۱۔ سہارن پوری: مولانا خلیل الرحمٰن ابن مولانا احمد علی محدث سہارن پوری استاذِ حدیث علامہ شبلی نعمانی۔

۲۔ شاہ جہان پوری: مولانا مسیح الزماں خاں استاد و اتالیق نواب میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد دکن۔ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

۳۔ پھلواروی: مولانا شاہ سلیمان

۴۔ کاکوروی: شاید منشی اعجاز علی کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ شاہ صاحب: اسی اقتباس میں ''شاہ صاحب'' کے عرف سے اشارہ مولانا حافظ شاہ محمد حسین الٰہ آبادی کی طرف ہے۔

جیسا کہ متن کی عبارت سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات علامہ شبلی نعمانی کے مخالف تھے۔ ایسا نہ سمجھ لینا چاہیے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں اور وہ کسی درجے میں حالات کی خرابی کا ذمے دار حضرت شبلی کو سمجھتے ہوں یا ان کی کسی کم زوری کی وجہ سے دل میں کوئی رنجش پیدا ہو گئی ہو۔ ندوے کے تو سبھی مخلص تھے۔

ان حضرات خمسہ میں سے نمبر ۱، ۳، اور ۵ تو ندوے سے متعلق پہلے بنیادی جلسے میں شریک تھے جو ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کان پور میں ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ شبلی مرحوم کو سب یکساں نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ شاید بعض اپنی بزرگی کے زعم میں اور بعض اپنے علم و فضل کے مقابلے میں ان کو اہمیت نہ دیتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حسد کی وجہ سے ان کی عیب جوئی میں مصروف رہتے ہوں۔

(۲)

مولانا ابوالکلام نے اصلاح و بقاے ندوہ کی جو تحریک شروع کی تھی۔ اس نے ملک کے سنجیدہ طبقے کو بیدار کر دیا، اسے منظم کیا اور ندوے کو تخریب اور تباہی سے بچانے کے لیے متحد کیا۔ اور حزب اصلاح اور حزب فساد دونوں کو ۱۰ رمئی ۱۹۱۴ء کی عوامی عدالت دہلی میں لا کھڑا کیا۔ حزب فساد نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور اس سے بچنا چاہا اور اس نے بہت سے ہتھ کنڈے استعمال کیے لیکن ملک کی راے عامہ نہ صرف بیدار ہوگئی تھی بلکہ ان کے خلاف بھی ہوگئی تھی، اس نے اسے عوامی عدالت کے فیصلے سے بھاگنے نہیں دیا۔ ابوالکلام نے تحریک اس خوبی سے چلائی تھی کہ اس میں فریقین سے شبلی کے سوا کسی دوسرے شخص کا نام بھی نہ لیا تھا، نہ کسی ایک شخص پر کوئی الزام لگا کے اسے رسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے ان پر طرف داری کی کوئی تہمت بھی نہ لگا سکتا ہے۔ انھوں نے اس تحریک کو اصول کی بنیاد پر ایک متعین مقصد کے لیے چلایا تھا اور وہ تھا ایک اہم تحریک کو انتہائی تخریب کے انجام سے بچانا اور اس کی حیات کا سروسامان کر دینا۔ ۱۰ رمئی کا یوم حساب آیا اور تاریخ کا ایک اہم فیصلہ کر کے گزر گیا۔ ندوے کی موجودہ زندگی کی تاریخ میں ۱۰ رمئی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ بعد کی زندگی اسی تاریخی فیصلے کی رہینِ منت ہے۔

۱۰ رمئی کے جلسے کی تفصیل میں جانے کے بجاے اس کی کارگذاری کی جو روداد کم سے کم الفاظ میں حضرت سیّد صاحب نے ''حیاتِ شبلی'' میں مرتب کر دی ہے، قارئین کرام کو ہم اسی کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ سیّد صاحب لکھتے ہیں:

> ''بہر حال ۱۰ رمئی ۱۹۱۳ء کو دلی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اس کا ایسا معقول انتظام کیا تھا کہ ایسا ہنگامہ خیز اجلاس پوری دل جمعی کے ساتھ بیٹھا اور اس نے اپنا کام کیا۔ اس کانفرنس میں تمام ہندوستان سے لوگ آئے تھے اور ہر طرف سے موافق و مخالف سمٹ کر اس میں جمع ہوئے تھے، دونوں طرف کے ممبروں نے تقریریں کیں، اپنی اپنی رودادیں سنائیں، اور تجویزیں پیش کیں۔
>
> اس سلسلے کا ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ محمد علی مرحوم، جو حزبِ احرار کے دوسرے

دست و بازو تھے، وہ ابھی تک گومگو میں تھے، اور پوری مستعدی کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ تھے، میں اور مولوی مسعود علی صاحب ان سے کئی دفعہ ملے، اور ان کو طلبہ کے مطالبات کی حمایت کے لیے آمادہ کیا، انھوں نے کہا کہ جب تک طلبہ اسٹرائک نہ ختم کردیں میں ان کی حمایت نہیں کرسکتا۔ ہم دونوں نے کہا، اگر آپ ان کے مطالبات کی ذمے داری قبول کرلیں تو امید ہے کہ وہ ابھی اسٹرائک ختم کر دیں گے۔ یہ سن کر وہ خوش ہوئے، کیوں کہ اس سے پہلے بہت سے اکابر اس کے لیے کوشش کر کے ناکام ہوچکے تھے۔ غرض اسی وقت ہم نے اور انھوں نے مل کر طلبہ کو لکھنؤ تار دیا، وہاں سے محمد علی مرحوم کے نام جواب آیا کہ ''ہم بہ خوشی اپنی قسمت کی باگ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دیتے ہیں اور آپ کے حسب مشورہ اسٹرائک کو ختم کرتے ہیں۔'' یہ ایسی خوش خبری تھی کہ محمد علی مرحوم اپنی اس کامیابی پر اچھل پڑے اور فوراً تار لیے ہوئے جلسے میں آئے اور ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ اس تار کو پڑھ کر طلبہ کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کردیا۔

دوسرا واقعہ جس نے محمد علی مرحوم کو طلبہ کی حمایت میں اور زیادہ سرگرم بنادیا وہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تقریر تھی، وہ محمد علی مرحوم کی جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور منتظمین کی حمایت میں ایک مبسوط تقریر کی، میں پاس بیٹھا تھا، محمد علی مرحوم کا یہ حال تھا کہ صاحب زادہ صاحب مرحوم کے ہر ہر فقرہ پر وہ اور زیادہ مشتعل ہوتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ صاحب زادہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہہ اٹھے کہ ''اگر استبداد مجسم دیکھنا ہو تو ادھر دیکھو۔'' آخر صاحب زادہ صاحب کی تقریر کے بعد وہ پھر کھڑے ہوئے اور ایسی گرم اور پرزور تقریر کی کہ استبدادی منتظمانہ اصول کی جڑیں ہل گئیں۔ اس سلسلے میں خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام، مرزا حیرت دہلوی، سیّد جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری نے تائیدی تقریریں فرمائیں۔''

(روداد جلسۂ عام انجمن اصلاح منعقدہ دہلی بہ تاریخ ۱۰ر مئی ۱۹۱۴ء)

اصلاحی سب کمیٹی:

بہ ہر حال ان گرما گرم تقریروں کے بعد حاضرین کی کثرتِ رائے سے چند تجویزیں منظور ہوئیں اور ایک سب کمیٹی بنی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوے کے لیے ایک ایسا نیا دستور العمل بنائے جس میں کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔ اس دستور العمل کے بنانے کا کام حکیم صاحب مرحوم کے حسب منشا پیرزادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا، اور حکیم صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب، محمد علی مرحوم، مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسری، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، نواب علی حسن خاں مرحوم، حکیم عبدالولی صاحب مرحوم (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) وغیرہ ممبر منتخب ہوئے۔

اصلاحی سب کمیٹی نے اپنا کام فوراً ہی شروع کر دیا، پہلی کمیٹی میں محمد علی مرحوم نے اس بات پر زور دیا کہ یہ کمیٹی پچھلے واقعات کی تنقید سے تعلق نہ رکھے، بلکہ یہ پیشِ نظر رکھے کہ اب ایسے قاعدے بنائے جائیں اور جمہور کی قوت کو اتنا بڑھایا جائے کہ آیندہ کسی کو خود مختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔ غرض یہ قرار پایا کہ ۲۴رمئی کو ایک جلسہ بلایا جائے جس میں تمام ارکان جمع ہوں اور پورا خاکہ اس طرح مرتب کر لیا جائے کہ بار بار اجتماع کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ہر طرف کے توسط کے لحاظ سے دہلی کو پھر مقامِ جلسہ تجویز کیا گیا (مکاتیب شبلی بنام نواب علی حسن خاں) اور مجلسِ اصلاح ندوہ لکھنؤ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ اس تجویز کے مطابق ۲۴رمئی کو ایک جلسہ ہوا اور آیندہ کارروائی کی راہیں متعین کی گئیں اور پیرزادہ محمد حسین صاحب نے ایک نیا دستور العمل بنایا جس کو مجلسِ اصلاح نے چھاپ کر شایع کیا۔

علامہ شبلی کی زندگی کا یہ دور جس اضطراب میں گزرا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ انھوں نے تحریک کو مقصد سے ہم کنار کرنے کے لیے جس ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا وہ ان کی سیرت کی ایک مثال ہے۔ انھوں نے خود بھی ضبط کیا اور بعض مواقع پر ابوالکلام کو ضبط اور بعض باتوں میں حدود کی پابندی کی تلقین کی اور بے موقع اپنا نام لینے سے بھی منع کیا لیکن اب کہ انھیں اس خرخشے سے نجات مل گئی تھی اور ندوے کے مستقبل کی طرف سے انھیں اطمینان ہو گیا۔ سیرۃ النبیؐ کی تالیف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سیّد صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا نے اس اصلاحِ ندوہ کے سلسلے میں پورا اپریل و مئی اور جون کا ایک حصہ

دہلی میں بسر کیا، اصلاحی سب کمیٹی کے کاموں سے فرصت کر کے وہ وسط جون میں بمبئی روانہ ہو گئے اور سیرۃ النبیؐ جلد اوّل کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور ساتھ ہی دارالمصنفین کے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگے اور احباب و تلامذہ کو خطوط بھیجتے رہے کہ ندوہ کے پرانے دستور العمل کے نقایص اور پیرزادہ محمد حسین صاحب کے مجوزہ دستور العمل پر ناقدانہ مضامین لکھے جائیں۔"

حضرت علامہ ابھی اطمینان کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ مجلس انتظامیہ کے جلسے کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ انھوں نے معتمدی کے عہدے سے استعفا دیا تھا، انتظامیہ کی رکنیت سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ ایجنڈا جو بنایا گیا تھا اس کے آئینے میں بعض دلوں کا کھوٹ صاف نظر آرہا تھا لیکن انھوں نے اس کی پروانہیں کی۔ ان کا رویہ نہایت مدبّرانہ تھا۔ علامہ شبلی نے مولانا عبداللہ ٹونکی کی رپورٹ پر تبصرے میں ۲۵ مئی ۱۹۱۳ء کو خط لکھا تھا، اسے حضرت سیّد صاحب نے نقل کیا ہے۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

"خاص طور پر میری یہ گذارش ہے کہ بجائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دو قوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، اسلامی (مصالح) کا یہ اقتضا ہے کہ دو تین شخصوں کو حکم مان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دے دیجیے، جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کرلیں، پھر وہ جلسہٴ انتظامیہ میں باقاعدہ منظور ہو جائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تفضیح ہو چکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے کہ جھگڑا کہاں سے شروع ہوا، کیوں کہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسرِ ناحق ہے، ایسے اشخاص خود ندوہ میں موجود ہیں، جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔"

"ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لیے اشخاصِ ذیل موزوں ہیں:

ڈاکٹر ناظر الدین حسن (بیرسٹر)

مسٹر ممتاز حسین (بیرسٹر)

مولوی آزاد صاحب سبحانی (کان پور)

مولوی سیّد سلیمان، پونہ، دکن" (حیاتِ شبلی: ص ۶۶۔۶۶۵)

انتظامیہ کا جلسہ ہوا اور افسوس کہ شبلی کے اخلاص کی نہ قدر کی گئی نہ ان کی معقولیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس رویے نے ندوے کے مخلصین کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن جن حضرات نے ۱۰رمئی کے جلسے میں رسوائی کی شرم سے منہ چھپا لیا تھا، ۱۵رجون کے انتظامیہ کے جلسے میں کامیابی سے ان کے چہرے چمک اٹھے تھے۔ بعد کے چند ماہ غور وفکر اور جدید اقدام کے لیے موقع کی تلاش میں گزرے۔ ابھی کسی نتیجے تک نہ پہنچے تھے کہ ۱۸رنومبر ۱۹۱۴ء کو حضرت علامہ شبلی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ندوہ تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ حزب فساد جو مر چکی تھی، شبلی کی وفات نے اسے زندگی کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں رہی، لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ شبلی کی وفات پر چند ماہ گزرے تھے کہ انتظامیہ نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کا فیصلہ کیا...... مجلسِ اصلاحِ ندوہ نے اصلاحی کاموں کے لیے میدان کو ہموار اور فضا کو سازگار پایا اور بہ قول حضرت سیّد صاحبؒ:

''اس موقع پر ۱۸رمارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کی رائے سے نواب سیّد علی حسن خاں صاحب مرحوم نے دفترِ نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی، مصالحت کا مبارک وقت آ پہنچا تھا، اس لیے ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا اور مولانا ابوالکلام صاحب، بابو نظام الدین صاحب رئیسِ امرتسر، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ (حال نواب ناظر یار جنگ جج ہائی کورٹ حیدر آباد) اور نواب سیّد علی حسن خاں صاحب، اور موجودہ ارکانِ ندوہ کی طرف سے مولانا حکیم سیّد عبدالحی صاحب، منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ اور مولوی اعجاز علی صاحب رئیس کاکوری منتخب ہوئے، یہ اصحاب ۳۱رمارچ کی رات کو بعد مغرب دارالعلوم کی عمارت میں جمع ہوئے اور تمام امور پر نہایت ہمدردی سے غور وفکر کیا اور حسبِ ذیل امور اتفاق کامل سے منظور کیے:

۱۔ ندوۃ العلماء کے دستور العمل میں مناسب اصلاح وترمیم،

۲۔ مسئلۂ نظامت کا تصفیہ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری نے استعفا دیا اور ان کی جگہ مولانا سیّد عبدالحی صاحب مرحوم کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا،

جس کو مولانا نے اصرار کے بعد قبول فرمایا،
۳۔ معتمد صاحب مال نے اپنے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط کو منظور کیا،
۴۔ دارالعلوم کے طلبائے قدیم میں سے پانچ اشخاص کو ندوے کا ممبر بنانا قبول کیا۔
اس تصفیے کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب ''مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن'' کے ضروری اجلاس میں شرکت کے لیے پہلی اپریل کو علی گڑھ چلے گئے جہاں سے وہ ۵/اپریل کو واپس آکر ندوے کے آخری سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے اور مجلس اصلاح کی طرف سے کھلے جلسے میں تمام اختلافات کے خاتمے کا اعلان کیا اور دونوں فریق نے اتحاد واتفاق کے اس پُر مسرت منظر پر خوشی ظاہر کی، لیکن اس خوشی وشادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ یہ تھی کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح، امید ہے کہ شاد ہوئی ہوگی۔''

(حیاتِ شبلی: ص ۶۷-۶۶۶)

حواشی

۱۔ اگست ۱۹۰۴ء میں الندوہ کا پہلا شمارہ شاہجہان پور سے شائع ہوا تھا۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۶ء مولانا ابوالکلام اس کے نائب مدیر رہے۔ اس دور کے اہم اور قابل ذکر مضامین کی جو فہرست زمانی اعتبار سے علامہ شبلی نے بنائی تھی، اس میں آخری مضمون (نمبر ۱۷) المرأۃ المسلمہ پر مولانا آزاد کے قلم سے تبصرہ ہے۔ ابھی اس کا کچھ حصہ باقی تھا کہ مولانا وکیل امرتسر میں چلے گئے۔ اور یہ تبصرہ ترمیم واضافہ اور تصحیح وتکمیل کے بعد وکیل بک ایجنسی، امرتسر کی طرف سے کتابی صورت میں ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان سے اب تک بیسیوں بار چھپ چکا ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۵)

ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالکلام آزاد

افادات مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

میں نے کہا کہ الندوہ سے مولانا ابوالکلام کے ضابطے کے تعلقات ختم ہو جانے کے بعد بھی مولانا آزاد کا تعلق الندوہ سے اور ندوۃ العلماء سے ختم نہیں ہوگیا تھا۔ الندوہ سے ان کا قلمی تعلق رہا اور ندوۃ العلماء کے حفظ و بقا کی جنگ میں انھوں نے ندوہ کے بزرگوں، مخلصوں اور بہی خواہوں کے ساتھ مل کر اس کے مخالفوں اور دشمنوں کا ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ اور ملک کی رائے عامہ کو ایسا ہموار کیا کہ کہہ و مہہ کے نہ صرف کان ندوہ کی تحریک اور اس کے مقاصد سے آشنا ہوئے بلکہ ندوے کا نام لوگوں کے دلوں پر نقش ہوگیا۔ مولانا نے ندوے کے کاموں کے لیے نہ صرف اپنے وقت کا ایثار کیا، بلکہ صلاحیتوں کو صَرف کیا اور الہلال کے سیکڑوں صفحات کو ندوے کے ذکر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بلاشبہ ملک کے بعض دوسرے اخبارات زمیندار لاہور، ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہا نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا، لیکن الہلال کا پیمانۂ خدمت بہت بلند اور اس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

الندوہ اور ندوۃ العلماء سے تعلق و خدمت کے علاوہ ندوہ کے بزرگوں، مثلاً علامہ شبلی نعمانی، حضرت صدر یار جنگ مولانا شروانی، نواب سیّد علی حسن خان، مخلصین میں مولانا سیّد عبدالحی اور احباب میں سیّد سلیمان، مولانا مسعود علی، مولانا عبدالسلام، ضیاء الحسن علوی، مولانا عبدالباری، مولانا ریاست علی اور خردوں میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، عبدالرحمٰن نگرامی، اور ندوے سے باہر اسی حلقے کے ارکان میں عبدالماجد دریابادی وغیرہم سے ان کے تعلقات ہمیشہ قایم رہے اور ان کا احترام کیا، اور اگرچہ سیاسی ذوق و عمل کی بنا پر دیوبند کے ایک بزرگ اور ان کے بعض تلامذہ سے وہ بہت قریب تھے اور اسی ذوق کی بنا پر وہ جمعیت علمائے ہند کی شوریٰ میں ہمیشہ شریک رہے

اور اگر کبھی ایسا نہ ہوا تب بھی کسی نہ کسی طرح اہم سیاسی مسایل میں انھیں شریک کرلیا جاتا رہا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے تعلقات خاطر اور حضرت کے ان کی جانب التفات کی بنا پر تو انھیں جمعیت کے حلقے میں ایک بزرگ، ایک معمر اور مدبّر کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ابوالکلام کا حلقۂ احباب بیشتر حضرت شبلی کے تلامذہ کا تھا۔

اس بحث میں دور تک جانا اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ البتہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے بعض افادات اس مقام پر مرتّب کر دینا نہایت مفید خیال کرتا ہوں۔ مولانا علی میاں نے اپنے مضمون میں نہ صرف اپنی ارادت اور تعلق کا ذکر کیا ہے، بلکہ انھوں نے اپنے شعور سے پہلے کے بزرگوں کے تعلقات، ان کے رویوں اور ان کے دیکھنے والوں کے بیانات، الندوہ کے زمانۂ ادارت کے بعض واقعات و واردات، اپنے والد گرامی مولانا سیّد عبدالحی سے روابط، اس دور کے بعد کے ایام میں ندوہ، تحریک ندوہ اور علامہ شبلی کی کسی خصوصیت کے اعتراف، انجمن اصلاح میں مولانا کی شرکت، ندوے کے طلبہ سے مولانا کی ملاقاتوں کا تذکرہ، ندوے کے کاموں میں ان کی معاونت، نزہۃ الخواطر کی اشاعت سے مولانا کی دل چسپی کے جو واقعات بیان فرمائے ہیں ان سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ندوہ اور اس کے متعلقین مولانا کو کتنے عزیز تھے اور اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی انھیں ندوے کے کسی کام کی طرف توجہ دلائی گئی انھوں نے اس بارے میں صایب مشورہ دیا اور نہایت خوش دلی سے وہ کام کروا دیا۔

الندوہ کی ادارت اور قیام لکھنؤ کا زمانہ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے شعور ہی سے پہلے کا نہیں بلکہ حضرت کی ولادت (۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء) سے بھی پہلے کا زمانہ تھا۔ اس دور کی باتیں انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنی تھیں۔ اگرچہ مثل تو یہ ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ لیکن تاریخ و سوانح ہی میں نہیں، مذہب میں بھی سماعت کا ایک مقام ہے۔ خواہ درس و شہادت کے برابر نہ ہو۔ لیکن قیاس کے مقابلے میں سماعت کا مقام بہت اونچا ہے۔ پھر راوی کی حیثیت بھی حضرت مخدومی مولانا علی میاں جیسی ہو تو روایت کا درجۂ استناد انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ مولانا علی میاں فرماتے ہیں کہ ہمارے یہ بزرگ عزیز مولانا کے کچھ ایسے معتقد نہ تھے۔ لیکن وہ مولانا کی غیر معمولی ذہانت، حاضر دماغی، انشاپردازی اور اس کے ساتھ ان کی خودداری اور لطافت و نظافت کے قصے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ لیکن سترہ برس کی عمر کے ''بروا'' سے ذہانت، حاضر دماغی، انشاپردازی ہی کے

چکنے پتوں کی توقع کرنا چاہیے۔اگر اس میں خودداری اور نظافت و لطافت کی خوبیاں بھی ہوں تو کیا کہنا! اگر انھیں ان میں بزرگی نظر نہیں آئی تو انھوں نے بھی ابوالکلام کی شرافت اور سلامتی طبع کا انکار تو نہیں کیا۔انھوں نے بھی ان کی خوبیاں ہی بیاں کیں! اور پھر ان کے معتقدین نے بھی انھیں مادرزاد ولی کب کہا؟ پھر یہ زمانہ تو واقعتاً ان کے شک و تذبذب ہی کا نہیں کامل درجے میں الحاد کا تھا، جس نے ان کے گھر کے دینی ماحول میں ان کی زندگی کو مشکل بنا دیا۔اور اسی لیے وہ گھر سے دور اور اس کے ماحول سے نفور تھے۔اس دور کے ابوالکلام کے لاابالی پن اور آزادروی کے قصے تو عام طور پر مشہور ہیں۔خودداری اور نظافت و لطافت کے ساتھ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی صفات ملتی جلتی ہیں۔ان کی ذات میں اس وقت بزرگی، پرہیزگاری، زہد و تقویٰ اور دین داری کی اعلیٰ صفات اور مثالی اور معیاری انسانی صفات کا ان میں تلاش کرنا خود ان بزرگوں کے دینی ذوق و نظر کی خوبی تو ہے، ابوالکلام کی ذات میں کوئی عیب نہیں۔ان پر اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ الحاد و فسق کی جس دلدل میں پھنس گئے تھے، اس سے انھیں نجات ملی اور اس پر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے۔ان کے معتقدین کے لیے بھی خوشی کا بہت بڑا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا انجام بخیر فرمایا۔الحمدللہ ثم الحمدللہ! بزرگوں نے ابوالکلام کے بارے میں جو کچھ بیان کیا درست تھا۔انھوں نے ان کی تنقیص نہیں کی۔بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ کہا وہ تنقید کے درجے میں بھی نہیں آتا، تذکرے ہی کے دائرے میں رہتا ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابوالکلام کا قیام اس زمانے میں گولا گنج میں ندوے کی قدیم عمارت میں تھا۔اور حضرت علامہ شبلی کے قریب ہی میں ان کا کمرہ تھا۔یہ بات خود ابوالکلام نے بیان کی ہے۔وہ بھی شبلی ہی کی طرح سحر خیزی کے عادی تھے اور صبح سویرے ان کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔چائے کا دور چلتا تھا اور علمی، ادبی، تاریخی تذکرے رہتے۔ابوالکلام بیان فرماتے ہیں:

> ’’ہر وقت مولانا (شبلی) مرحوم سے یک جائی رہتی۔وہ بھی صبح سویرے اٹھنے کے عادی اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر! جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا۔اسی وقت چائے کا دور چلتا۔طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔اکثر فارسی اشعار کا اپنے خاص ٹون میں ترنم کرتے۔ان اشعار کے متعلق تذکرے رہتے۔‘‘ (آزادی کی کہانی......ص ۳۱۴،۱۵)

اسی سال (اگست ۲۰۰۵ء) خاکسار کو ہندوستان کے سفر کا اتفاق ہوا تو ندوۃ العلماء میں ایک ہفتہ قیام رہا، اس دوران گولاگنج بھی جانے کا موقع ملا اور خاتون منزل بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ یہاں تو دار العلوم کے طرز کی کوئی عمارت ہی نہیں۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ کہاں کلاسیں ہوتی ہوں گی اور کہاں اور کس طرح طلبہ کی رہایش ہوگی؟ یہی الندوہ کا دفتر ہوگا، یہیں ابوالکلام نے قیام کیا تھا، یہیں علامہ شبلی قیام کرتے تھے۔ اس وقت کا ندوہ میرے تخیل میں آج کے ندوے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بہر حال یہیں کسی مکان کے کسی کمرے میں الندوہ کا دفتر ہوگا، یہیں کسی جگہ شبلی رہتے ہوں گے اور اس کے قریب ایک کمرے میں ابوالکلام کی رہایش ہوگی۔

اب میں حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے پر لطف بیان اور قارئین کے درمیان حایل رہنا نہیں چاہتا۔ حضرت فرماتے ہیں:

''میرے ذہنی شعور اور پڑھنے لکھنے کا زمانہ وہ ہے، جب مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان میں طوطی بولتا تھا۔ اُردو کا یہ پرانا محاورہ کسی اور مقرر، مصنف یا ادیب و شاعر کے متعلق اتنا صحیح اور حسبِ حال نہیں، جتنا مولانا آزاد کے متعلق ہے۔ علمی و ادبی ذوق رکھنے والوں میں سے شاید کوئی ایسا آدمی ہو جو ان کی خطابت وزورِ قلم کا قایل اور ''الہلال'' کے سحر حلال سے مسحور نہ ہوا ہو! میری جس ماحول میں پرورش ہوئی وہ ان کے افکار و خیالات سے پورے طور سے ہم آہنگ تھا اور ان میں ایسے متعدد اشخاص تھے جنھوں نے مولانا کو آغاز شباب میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ رسالہ ''الندوہ'' کے معاون مدیر کی حیثیت سے پرانے ندوے میں (جو گولاگنج کی اس عمارت میں تھا، جس کو اب خاتون منزل کہتے ہیں، اور جو مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی مرحوم لکھنؤ کی قیام گاہ رہی ہے) مقیم تھے، اور علامہ شبلی کی علمی صحبتوں سے استفادہ کرتے تھے۔

ہمارے یہ بزرگ عزیز مولانا کے کچھ ایسے معتقد نہ تھے، لیکن وہ مولانا کی غیر معمولی ذہانت، حاضر دماغی، انشاپردازی اور اس کے ساتھ ان کی خودداری اور نظافت و لطافت کے قصے اس طرح مزے لے لے کر سناتے تھے کہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم یونان کے حکما و فلاسفہ اور الف لیلہ کی خیالی شخصیتوں کے قصے سن رہے

ہیں۔ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ مولانا کو معیاری اور مثالی انسان سمجھتے ہیں، جو ہر طرح کے نقص یا تنقید سے بالاتر ہو بلکہ کچھ معاصرانہ تنقیدی اشارے بھی ہوتے تھے، لیکن ان سب کا ان کی غیر معمولی، ذہانت، خداداد حافظے اور خودداری وخوداعتمادی کے نمایاں وصف پر اتفاق تھا۔“

ندوے میں جو حضرات مولانا ابوالکلام کے بہت قریب تھے، انھوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا اور جانچا پرکھا تھا۔ ان میں سے حضرت سیّد سلیمان ندوی کے حوالے سے حضرت مخدومی مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

”بعد میں حضرۃ الاستاذ مولانا سیّد سلیمان ندوی سے بھی متعدد مجلسوں میں ان کی غیر معمولی ذہانت، اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، پھر اس کو بہتر سے بہتر طریقے پر پیش کرنے اور اپنے معلومات سے کام لینے کی غیر معمولی قابلیت کے واقعات سنے۔“

ابوالکلام کی ایک آزمایش:

اس زمانے میں بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ حضرت علامہ شبلی نے کسی سے کوئی مضمون لکھوایا۔ پسند نہ آیا تو دوسرے سے لکھوایا لیکن ان کے ذوق ومعیار پر پورا نہ اترا اور ان کی اس پریشانی کو مولانا ابوالکلام نے آسان کردیا اور وہ خوش ہوگئے۔ ایسے مواقع کی طرف حضرت مولانا علی میاں نے توجہ دلائی ہے۔ اگرچہ معلوم الفاظ میں اس کے راوی حضرت سیّد صاحب نہیں ہیں، لیکن جس تسلسل میں ان مواقع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس سے تو یہ روایت حضرت سیّد صاحب ہی کی معلوم ہوتی ہے اور اس بات سے تو انکار کیا نہیں جاسکتا کہ اگر سیّد صاحب اس کے راوی نہیں تو جن حضرات سے یہ روایات سنی گئیں ان میں حضرت سیّد صاحب کا شمار ہوتا ہے اور ان کے مؤید تو ضرور ہیں! مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

”بارہا ایسا ہوا کہ علامہ شبلی نے اپنے ارشد تلامذہ سے کسی موضوع پر لکھنے کی فرمایش کی اور انھوں نے مواد ومعلومات کا ایک ذخیرہ رکھ دیا، ان کے بعض لایق ترین تلامذہ نے مضامین لکھ کر پیش کیے، لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے، بعض مرتبہ کئی

بار یہ کوشش کی گئی اور ناکام رہی۔ مولانا آزاد کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، قریب آئے اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ علامہ شبلی نے مختصر تقریر کی، وہ اسی وقت بیٹھ گئے اور مضمون لکھ کر پیش کیا، مولانا نے فرمایا، بس میں یہی چاہتا تھا۔

یہ مضامین بعض اوقات بڑے نازک اور دقیق کلامی و فلسفیانہ مباحث پر ہوتے تھے، حاضرین مجلس کو یقین ہوتا تھا کہ اس موقع پر اس نوجوان انشا پرداز کا، جس نے اپنی طلاقت لسانی سے سب پر اپنے علم و مطالعے کا سکہ بٹھا رکھا ہے، بھرم جاتا رہے گا اور اس کی علمی کم مائیگی کا راز فاش ہو جائے گا، لیکن معاملہ ہمیشہ الٹا ہوا، اور وہ ہر مرتبہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔"

(پرانے چراغ:۲:ص ۴۵)

مولانا سیّد عبدالحی اور ابوالکلام:

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے والد گرامی حضرت مولانا سیّد عبدالحی (دسمبر ۱۸۶۹ء- فروری ۱۹۲۳ء) کا ندوۃ العلماء سے تعلق جس اخلاص، ایثار، ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ طویل عرصے تک رہا تھا، اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ وہ ۱۸۹۴ء میں کان پور کے جلسۂ ندوہ میں شریک تھے۔ اس وقت ندوے کے مقاصد سے انھوں نے جو پیمانِ وفا باندھا تھا اسے زمانے کا کوئی فساد و انقلاب توڑ نہ سکا تا آں کہ فرشتۂ اجل نے ۱۹۲۳ء میں ان کی دنیاوی زندگی کا ورق الٹ دیا۔ تقریباً تیس برس ندوے سے ان کا تعلق رہا۔ اس مدت میں ندوے کے پہلے ناظم حضرت مولانا سیّد محمد علی مونگیری کے معاون و معتمدِ خصوصی اور دوسرے ناظم مولانا مسیح الزماں خاں شاہ جہان پوری کے مددگار ناظم رہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ ندوہ کے ناظم ہو گئے۔ دفتر شاہ جہان پور منتقل ہوا تو انھوں نے بھی وہیں رہائش اختیار کر لی۔ دفتر کے معتمد اور انتظام کے ذمہ دار تھے۔ الندوہ جاری ہوا تو مضامین کی فراہمی اور انتخاب کے سوا تمام ذمے داریاں انھی کی تھیں۔ کہنے کو ان کا شعبہ نظامتِ دفتری کا تھا لیکن ندوے کی خدمت کے شوق میں کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہ تھا جو انھیں سونپا گیا ہو، انھوں نے اس کی بجا آوری کی ذمے داری بہ خوشی قبول نہ فرمائی ہو، اور خوش اُسلوبی

سے اسے انجام نہ دیا ہو۔

اس کے ساتھ وہ ایک طبیب حاذق اور بلند پایہ کتب کثیرۂ عربی و اُردو کے مصنف اور مؤلف بھی تھے۔ ان کی زندگی کے تمام معاملات مدت العمر معاش کے لیے مطب، خدمت کے لیے ندوہ، علمی وادبی ذوق کی تسکین کے لیے تصنیف وتالیف اور شوق مطالعہ کے کاموں تک محدود رہے۔ ندوے کے کاموں اور فرایض کی ادائیگی کے ذوق نے ملک کے دور دراز گوشوں تک ان کے روابط کو پھیلا دیا تھا اور تصنیف وتالیف کے کمال شوق نے انھیں اصحابِ ذوق کا مرجع بنا دیا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ خود زحمت اٹھائی اور کسی چھوٹے بڑے کو علمی کاموں میں رہنمائی اور تعاون سے مایوس نہ کیا۔ ان کے اخلاص کے سب معترف اور اخلاق کے سب گرویدہ تھے۔ ان کی خدماتِ علم و ادب اور فن میں تاریخ، تذکرہ، سوانح، ادب وتاریخ اُردو عربی، تنقید، طب وغیرہا اور ان کے انواع و اقسام اور اطراف ومتعلقات تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لیے ہر ذوق وفن کا شایق ان کے پاس آتا تھا اور اگرچہ کسی ادیب کے لیے اپنی زیرِ تصنیف کتاب سے استفادے کا موقع فراہم کرنا سخت مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن انھیں اس قسم کی خدمت میں بھی کسی خاص وعام سے تکلف نہ ہوا۔

اس حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ان کے تعلقات تھے اور ابوالکلام (۱۸۸۸ء) ان سے ۱۸، ۱۹ برس چھوٹے تھے، عمر کے لحاظ سے وہ مولانا سیّد عبدالحی حسنی کے فرزند اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنی (دسمبر ۱۸۹۳ء- مئی ۱۹۶۱ء) کے قریب العمر تھے، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر دونوں کے روابط میں دوستی کا تعلق تھا۔ مولانا علی میاں مرحوم نے اپنے والد گرامی مرتبت سے ابوالکلام کی بعض نسبتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں، جو ''پرانے چراغ'' (حصہ دوم) میں شامل ہے، فرماتے ہیں:

''ندوے کے تعلق نیز خاندانی تعارف کی بنا پر وہ میرے والد ماجد مولانا حکیم سیّد عبدالحی صاحب مرحوم سے ملنے مکان پر ضرور کئی بار آئے ہوں گے۔ مجھے ان کے قلمی ذخیرے اور کاغذات میں ایک ویزیٹنگ کارڈ ملا جس پر حاذق الملک حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں کے دستخط ہیں، والد صاحب کے نام ان کے ایک سے زاید خط ہمارے خاندانی مرقع خطوط کی زینت ہیں۔ تعارف و تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی جوانی کے آغاز میں شمس العلماء

مولانا محمد یوسف رنجور عظیم آبادی کی، جو کلکتہ میں مقیم تھے، عرصے تک صحبت میں رہے اور استفادہ کیا، وہ خاندانِ صادق پور کے چشم و چراغ تھے، جو حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مخلص و صادق اور وفادار ترین معتقدوں میں تھا، اور جس کا ان قربانیوں میں سب سے بڑا حصہ ہے جو سیّد صاحبؒ کی دعوت و تحریک کے مجاہدوں کو انگریزی دورِ اقتدار میں دینی پڑیں۔

جب ان صادقینِ صادق پور کا پہلا تذکرہ اُردو میں ''الدر المنثور'' یا ''تذکرۂ صادقہ'' کے نام سے شائع ہوا، جو مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری اسیرِ انڈمان کے قلم سے تھا تو اس پر مقدمہ ایک نوجوان، گم نام اہلِ قلم محی الدین ابوالکلام احمد کے قلم سے تھا، جس میں قدیم طرز تحریر کا رنگ ہے، اور اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کا لکھنے والا کسی دن ہندوستان کے علمی و ادبی مطلع پر ہلالِ عید بن کر اس طرح چمکے گا کہ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جائیں گے۔

لیکن مجھے ان کا گھر پر آنا یاد نہیں اس لیے کہ والد صاحب کا انتقال ۲ر فروری ۱۹۲۳ء کو ہوا، اس وقت میری عمر ساڑھے نو سال کی تھی، اس سے پہلے کا زمانہ، جب وہ ندوے کے قیام میں یا خلافت تحریک کے آغاز میں کبھی ملنے آتے رہے ہوں گے، میرے شعور سے پہلے کا زمانہ ہے۔''

بلاشبہ ابوالکلام حضرت مولانا حکیم سیّد عبدالحی حسنی سے کئی بار ملے ہوں گے، اس لیے کہ اس کے بغیر تعلقات میں پختگی اور بے تکلفی اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوتی اور جب تک یہ اعتماد پیدا نہ ہو جائے اس سے کسی کی سفارش نہیں کی جاتی۔ چوں کہ تعلقات اس منزل سے گزر چکے تھے اور اعتماد پیدا ہو گیا، اس لیے انھوں نے ایک صاحب کے لیے ان کی تالیف سے استفادے کا موقع دینے کی سفارش کی تھی۔ اس سلسلے میں ابوالکلام کا ایک خط حضرت مولانا علی میاں نے اس خاکسار کو عنایت فرمایا تھا جو اس کے مرتبہ مجموعۂ خطوط (غیر مطبوعہ) میں شامل ہے۔ ایک خط مولانا علی میاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنی کے نام بھی ہے، جو کسی کام میں ایک شخص کی رہنمائی کی سفارش کے مضمون ہی میں ہے، یہ خط خاکسار کے مرتبہ مجموعے ''مکاتیبِ مولانا ابوالکلام آزاد'' (مطبوعہ) کراچی، ۱۹۶۹ء میں شامل ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت

مولانا علی میاں نے مولانا کے مکتوب بنام مولانا سیّد عبدالحی حسنی بھیجا تھا تو یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ یہی خط دستیاب ہو سکا ہے۔

ہمیں حضرت مولانا حکیم عبدالحی رحمۃ اللہ کی کوئی تحریر واثر ابوالکلام کے بارے میں دستیاب نہیں ہوا، لیکن ندوہ کے اجلاس دہلی (۱۹۱۰ء) کی روداد مولانا کے قلم سے یادگار ہے۔ اس میں حضرت مولانا حکیم صاحب کے تذکرے میں ان کے اخلاص، ایثار اور خدمات کا جو عظیم الشان اعتراف کیا ہے وہ ان دونوں بزرگوں کے مابین اخلاص ومحبت کے تعلقات کا بڑا ثبوت اور ان دونوں کے اس عقیدت کیش کے لیے بہت فخر ومسرت کا سرمایہ ہے۔ ہم اس تحریر کے لطفِ مطالعہ میں اپنے قارئین کو بھی شامل کر لینا چاہتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

''اس اجلاس میں پریسیڈنشیل ایڈریس کے علاوہ دو اور اہم کارروائیاں ہوئیں۔ ندوۃ العلماء کی رپورٹ مولانا سیّد عبدالحی صاحب سیکرٹری دفتر ندوۃ العلماء نے حسبِ معمول پیش کی اور مولانا شبلی کا لیکچر ندوے کی ضرورت اور اس کے مقاصد پر، جن کی تقریریں اجلاس ہائے ندوہ کی سب سے زیادہ قابلِ قدر نعمت ہے۔''

اس تمہید کے بعد خاص طور پر حضرت کے نام نامی کو عنوان قرار دے کر لکھتے ہیں:

''مولانا سیّد عبدالحی

مولانا سیّد عبدالحی کا چوں کہ ذکر آ گیا ہے، اس لیے یہ کہے بغیر قلم آگے نہیں بڑھتا کہ مولانا شبلی کے بعد وہ دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے ندوۃ العلماء کی خدمت گذاری میں قابلِ صد تحسین ایثارِ نفس سے کام لیا ہے اور آغازِ کار سے اس وقت تک ندوے کی تاریخ میں ایک مثال رہے ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ فرض اور ضمیر کے معانی سے قوم کی قوم بیگانۂ محض ہو رہی ہے اور قومی ترقی کے عام شور وغوغا میں ایک آواز بھی خلوص اور ایثار کی سنائی نہیں دیتی، ایک ایسے شخص کی تعریف کیوں نہ کی جائے، جس نے ابتدا سے ندوے کا ساتھ دیا اور اس وقت بھی جب کہ حد درجے کی کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں ندوہ چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے اغراضِ شخصیہ کے لیے مفید نہ پا کر تمام مدعیانِ کار ایک ایک کر کے الگ ہو

رہے تھے، وہ اس کی خدمت میں برابر سرگرم رہا اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ باوجود مالی بے اطمینانی وضروریاتِ معاش کے جو قلیل رقم ندوہ پیش کرتا تھا، اس کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا وجود فرض کے خیال اور ایثار کے جوش کا کتنا مؤثر نمونہ ہے۔''

(الندوۃ: لکھنؤ، بابت ماہ اپریل ۱۹۱۰ء، ص ۱۰)

مولانا آزاد سے کئی اور نسبتیں:

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی سے مولانا آزاد کو کئی لحاظ سے تعلق خاطر تھا۔ پہلا اور قریبی تعلق تو ندوے ہی کا تھا۔ اسی کے ساتھ انھیں خاص شفقت اس وجہ سے تھی کہ وہ ان کے دوست کے خلفِ رشید ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنی کے، جو مولانا کے قریب العمر ہیں اور قریبی تعلق بھی زیادہ ہے، برادرِ خرد ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دل چسپی یہ تھی کہ ان کا تعلق حضرت سیّد احمد رائے بریلوی شہید کے خانوادۂ اصحاب عزیمت وایثار سے ہے اور سیّد احمد شہید پر وہ ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ ان متعدد نسبتوں کی بنا پر ان سے زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ مولانا سیّد علی میاں مرحوم نے مولانا آزاد سے اپنی کئی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک ملاقات میں مولانا علی میاں اپنی ایک کتاب کا مسودہ لے گئے تھے اور اس پر مقدمے کے لیے مولانا سے درخواست کی تھی اور مولانا نے وعدہ بھی فرمالیا تھا۔ لیکن جب کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کتاب میں مقدمہ مولانا سیّد سلیمان ندوی کا شامل تھا۔ مولانا سے ملاقات ہوئی تو فرمایا، ''مجھے اس سلسلے میں تمھارا کوئی خط نہیں ملا۔ بہ ہر حال مقدمہ اب بھی لکھا جا سکتا ہے اس کا وقت اب بھی ہے۔'' مولانا سیّد علی میاں فرماتے ہیں:

''میں نے مناسب جواب دیا لیکن اصرار نہیں کیا۔ افسوس ہے کہ مولانا کی مصروفیات اور ان کی ذمہ داریوں کی بنا پر جو بڑھتی ہی گئیں، اس کی نوبت نہیں آئی۔''

مولانا شبلی کا ذکر:

اسی ملاقات کی تفصیلات میں یہ بھی لکھا ہے:

''مولانا اس مجلس میں دیر تک ندوے کا، مولانا شبلی کا اور ندوے کی تحریک کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے رہے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس تحریک کے پورے طور پر کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے بعد پھر کوئی اس کے آستانے پر آکر پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں گیا۔''

مولانا علی میاں مرحوم نے ایک اور ملاقات کا ذکر فرمایا ہے کہ دارالعلوم کے کچھ طلبہ مولانا آزاد کو یہ تاثر دے کر کہ مولانا شروانی تشریف لائے ہیں، دارالعلوم میں ہیں۔ مولانا آزاد ان سے ملاقات کے شوق میں کشاں کشاں تشریف لے آئے، لیکن انکشاف حقیقت کے بعد وہ طلبہ پر ناراض نہیں ہوئے۔ بقول مولانا علی میاں کے ''اس میں ناگواری واحتجاج کی تلخی نہ تھی۔ ایک بزرگانہ شکایت جس میں محبت وشفقت کی آمیزش تھی۔''

طلبہ کی انجمن میں شرکت:

مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ اور بھی طلبہ کی دعوت پر مولانا طلبہ کی انجمن ''اصلاح'' میں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تھے، رات کا وقت تھا۔ مولانا کے ساتھ مولانا عبدالقادر قصوری بھی تھے۔ یہ واقعہ اور پیشتر کا ہے۔''

(ایضاً ص ۵۳۔۵۲)

زمانۂ وزارت میں تین ملاقاتیں:

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے مولانا کے زمانۂ وزارت میں اپنی تین ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ ''تین مرتبہ زمانۂ وزارت میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ جب

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی دعوت پر دہلی اس لیے گیا تاکہ وہ مولانا کو میری موجودگی میں والد صاحب کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' کی طرف توجہ دلائیں، جس کی چار یا پانچ جلدیں دایرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد نے شایع کی تھیں، لیکن پولیس ایکشن کے بعد اس کا سلسلہ رک گیا تھا، یہ ملاقات جمیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسے میں ہوئی جو گلی قاسم جان میں ہو رہا تھا۔ مولانا آزاد تشریف لائے تو مولانا مدنیؒ نے میرا تعارف کرایا اور ''نزہۃ الخواطر'' کا ذکر کیا، مولانا نے اپنی واقفیت اور دل چسپی کا اظہار کیا اور فرمایا، اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا یاددہانی کی ضرورت ہوگی؟ تو فرمایا نہیں۔ چناں چہ ایسے ہی ہوا۔ ادارے سے اس کے بقیہ حصے طلب کیے گئے اور پوری کتاب چھپ کر شایع ہوئی۔''

(ایضاً، ص ۵۷)

حضرت مولانا سیّد علی میاں نے نزہۃ الخواطر کی جلد ہشتم (۱) میں بھی اس واقعے کا ذکر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''آپ (مولانا مدنیؒ) نے اس زمانے کے جمہوریۂ ہند کے وزیر المعارف مولانا ابوالکلام آزاد کو اس کی اہمیت اور اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی۔ مولانا آزاد خود بھی صاحبِ کتاب سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کتاب کی اہمیت بھی ان کے دل میں تھی۔ چناں چہ آپ نے دایرۃ المعارف (حیدرآباد دکن) کو اس کے بقیہ تمام حصوں کو شایع کرنے کے لیے اشارہ فرمادیا۔ چناں چہ اس کے بعد اس کا چھٹا حصہ ۱۹۵۷ء میں اور ساتواں حصہ ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آ گیا۔''

(چودھویں صدی کے علماے برصغیر، نزہۃ الخواطر...... (۸): کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱)

۲۔ ''دوسری ملاقات پارلیمنٹ ہاؤس میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ اس ملاقات میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان مصری ساتھ تھے۔ مولانا نے ان سے مختصراً عربی میں گفتگو کی اور انڈونیشیا کی ''ماشومی'' پارٹی کے متعلق دریافت کیا۔''

۳۔ ''تیسری ملاقات نئی دہلی میں مولانا کی قیام گاہ پر ہوئی، جس میں مولانا عمران

خاں صاحب ساتھ تھے، ہم لوگ ندوے کے ایک کام کے لیے حاضر ہوئے تھے، مولانا نے اس سے بڑی دل چسپی لی اور مفید مشورے دیے اور بہت جلد اس کام کی تکمیل ہوگئی، جس کے لیے ہم گئے تھے۔'' (ایضاً، ص ۵۷)

حضرت مخدومی مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے ان افادات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام کو ندوۃ العلماء اور اس کی اصلاح، ترقی اور بقا کی تحریک سے کتنا گہرا لگاؤ تھا اور اسے تعلیم کی ایک معیاری درس گاہ اور تصنیف وتالیف وتحقیق کا ایک بلند پایہ ادارہ بنانے سے، نیز اس کے علمی وتعلیمی ترجمان الندوہ سے، ندوہ کے بزرگوں کے علمی وتحقیقی کاموں اور ان کی اشاعت سے، ندوہ کے طلبہ سے اور ان کی تعلیم وتربیت کے مسایل سے کس درجے جذباتی لگاؤ تھا اور ان کے ذوقِ ایثار وخدمات اور اخلاص کا پیمانہ کتنا بلند تھا۔

آخر کلام:

مناسب ہوگا کہ ابوالکلام کے تذکرے میں حضرت مولانا علی میاں کے ان افادات کا خاتمہ آں مرحوم کے اسی تاریخی مضمون کے اختتامیے پر کردیا جائے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جائے گا، ان کی سیرت اور ان کے کمالات کا ایک ایک گوشہ سامنے لایا جائے گا۔ ان کے سیاسی خیالات اور موقف کے متعلق بہت کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ وہ ہندوستانی سیاست اور ہماری قدیم تہذیب وثقافت کا ایک ستون تھے۔ بے عیب ذات خدا کی ہے اور سراپا عصمت زندگی خدا کے پیغمبر کی جس میں کہیں قیل وقال کی گنجایش نہیں، ان کی بشری لغزشوں اور کمزوریوں کے متعلق بھی ان کے معاصرین اور ناقدین کی نہ زبان کو روکا جاسکتا ہے، نہ قلم کو، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے جن سفروں کا تذکرہ کیا ہے، ان کے تاریخی ثبوت اور ان کے زمانے کے تعین کے بارے میں اختلاف اور بحث وتحقیق کی بڑی گنجایش ہے، لیکن ان کا حیرت انگیز حافظہ، ان کی غیر معمولی ذہانت، ان کی حاضر دماغی اور بیدار مغزی، ان کی ادبیت اور ان کی انشا پردازی جو کسی وقت اور کسی جگہ ان کا ساتھ نہیں

چھوڑتی، ان کے اپنے مطالعے اور معلومات سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھانے کی عجیب وغریب صلاحیت، ان کی سیاسی بصیرت اور دور بینی، ان کے اپنے خیالات میں پختگی اور اپنے مسلک پر ثابت قدمی واستقامت اور لوگوں کی مدح وتنقید سے بے پروائی، ان کی خودداری اور عزت نفس ہر شبہ سے بالاتر اور ہر اختلاف سے بے نیاز ہے۔

میں لاہور میں تھا کہ ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو پاکستان ریڈیو نے یہ صاعقہ اثر خبر سنائی کہ مولانا آزاد اس جہانِ آب وگل اور اس کے طوق وسلاسل کی قید سے آزاد ہو کر ان باکمالوں سے جا ملے، جن کے اس جہانِ فانی سے سفر کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے جاری ہے:

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا"

(ایضاً: ص ۶۱-۶۰)

(٦)

الہلال کا لب ولہجہ اور علامہ شبلی

الہلال کی فنی خصوصیات، اس کی دینی دعوت اور سیاسی فکر سے حضرت علامہ شبلی مرحوم کے تعلق کے کئی پہلو ہیں، اور صحافت کی تاریخ میں الہلال اپنی ظاہری اور معنوی خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا واحد صحیفہ تھا۔ اس کے امتیازات اس کے ظاہر سے باطن تک نمایاں تھے۔ ظاہری طور پر اس کا کاغذ، اس کی تصاویر، اس کا ٹائپ، اس کی پرنٹنگ سے لے کر اس کے اشتہارات کی پیشکش میں بھی ایک حسن تھا۔ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے اس کے صفحات کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے ان کی خصوصیات کو نمایاں کر دیا تھا۔ الہلال ایک مصور جریدہ تھا۔ اس کی تصاویر صفحات کی زینت اور قارئین کے جذبِ نظر و توجہ کا محض ذریعہ نہ تھیں، تاریخ کا ایک حصہ تھیں۔ وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتی تھیں اور اپنی اہمیت کے اعلان و وضاحت کے لیے آپ اپنی زبان تھیں۔ ان کی اشاعت میں تاریخ و سیاست کے کتنے ہی اسرار پوشیدہ ہوتے تھے۔ جنگ بلقان کی ستم رانیوں، مسجد کان پور کے انہدام کے واقعے اور جنگ عظیم اوّل کے دوران صرف تصاویر کی اشاعت سے واقعات و حالات کے ایسے پوشیدہ گوشوں کی طرف متوجہ کیا، جن کی وضاحت مضامین کی تفصیلات سے بھی ممکن نہ تھی۔ کان پور کی مسجد کے سلسلے میں گرفتار شدہ بچوں کی تصاویر کی اشاعت نے ملک میں آگ لگا دی تھی۔ یہ حکومت کے خلاف اس کے ظلم کی ایسی تشہیر تھی جو کسی اشتعال انگیز مضمون سے بھی ممکن نہ تھی۔ ۱۹۱۴ء میں دوسری بار الہلال کی ضمانت ضبط ہوئی تو ضبطی کی وجہ ایک مضمون ہی نہیں ایک جہاز کی تصویر کی اشاعت بھی تھی۔

الہلال اپنے موضوع اور نوعیت کے لحاظ سے ایک ادبی جریدہ نہ تھا۔ ٹھیک اسی طرح وہ صرف مذہبی یا سیاسی اخبار بھی نہ تھا لیکن ادب اور سیاست کے شائقین کو اس کی انھی خصوصیات نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ یہ صرف فنی لحاظ سے اس کی تالیف و تدوین اور تہذیب مضامین و تصاویر کی خوبی تھی۔

وقت کے افکار و مسایل اور واقعات و حوادث کا مستند ترین ذخیرہ اس کے صفحات میں موجود ہے۔ سرسیّد مرحوم کی ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ کالج اور یونی ورسٹی کی تحریک اور ندوۃ العلماء کے قیام کی معنویت اور تاریخی اہمیت، اس کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک اور اس کے حفظ و بقا اور قومی اصلاح کے مسئلے پر سب سے قیمتی اور تاریخی لٹریچر الہلال کے صفحات میں موجود ہے۔

سیاست میں مسلمانوں کی ذہنی و فکری حالت، پس ماندگی اور افتادگی اور شاہراہ مقصود کی طرف رہنمائی کے باب میں جو فکری اور تاریخی لٹریچر الہلال کے صفحات میں موجود ہے اس کی افادیت اور نتیجہ خیزی میں کلام نہیں۔ باب التفسیر کے مضامین کو جمع کر دیا جائے تو قرآن کی آیات و سورۃ کی ایک نہایت فکر انگیز، ایمان پرور، اصول و مبادی تفسیر اور ان کے اطراف کے مطالب کی جامع، بہت مفید و موثر تفسیر بن جائے۔ یہ الہلال کی وہی خدمتِ قرآن ہے جس کی طرف مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو متوجہ کر دیا تھا۔ جس کی بہ دولت مسلمانوں میں ذوقِ قرآنی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور قرآن سے مسلمانوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ قایم ہوا تھا۔ الہلال ایک مختلف الجہات تحریک تھی جس کی بعض خصوصیات اور اطراف کی طرف اشارہ کیا گیا۔ مولانا آزاد کی تحریک حزب اللہ اور اس کے دارالارشاد کے قیام، مقاصد اور اس کی خصوصیات کی تفصیلات صرف اسی کے صفحات میں موجود ہیں۔

الہلال کے ابواب اپنی خاص اہمیت اور معنویت رکھتے تھے۔ مختلف اوقات میں پچاس سے زیادہ ابواب کے عنوانات اس کے صفحات میں نمایاں ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

بابُ التفسیر، اسوۂ حسنہ، بصایر و حکم، مذاکرۂ علمیہ، تاریخ و عبر، وثایق و حقایق، آثارِ عتیقہ، مقالات، ادبیات، حکایات، انتقاد، عالم مطبوعات و صحایف، اقتباسات و تراجم وغیرہا۔

کسی مضمون کا کسی باب میں جگہ پانا اس کے علمی معیار کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔

الہلال ادبی صحافت میں ایک مثال بن کر نمودار ہوا تھا۔ اس نے ادب و صحافت کو ایک نئی زبان، ایک جدید اُسلوبِ نگارش اور ایک نئے لب و لہجہ سے آشنا کیا۔ الہلال دین کے احیا اور ملت کی بیداری کی ایک دعوت تھی اور اس دعوت کا تقاضا تھا کہ اس کا مخصوص اُسلوب تحریر اور جدا اندازِ خطابت ہو۔ الہلال کا اُسلوبِ تحریر اور اندازِ خطابت اس کی دعوت کے تقاضے کے عین مطابق تھا۔(۱)

حضرت علامہ شبلی کو الہلال سے نہایت دل چسپی تھی۔ وہ اس کے اجرا کے مقاصد، اس کی دینی دعوت، تحریکِ اصلاح اور سیاسی موقف سے متفق اور ابوالکلام کے نقطۂ نظر کے موید تھے۔ وہ اس کے اُسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش کی اہمیت کے اندازہ شناس اور دل ربائی کے والہ وشیدا تھے۔ ۲۰/اگست ۱۹۱۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''آپ نے بہت اونچا نصب العین رکھا ہے۔ ورنہ جی یہ چاہتا تھا کہ سب طرف سے نظر کر کے وہیں آ رہتا۔ اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا۔ اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشاں خیال اور پریشاں عمل ہو رہے ہیں۔ کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے، ورنہ ہر طرف سے بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے۔''

(مکاتیب شبلی (حصہ اوّل): ص ۲۸۴)

۲۷/اکتوبر ۱۹۱۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''الہلال...... نے احساس عام پیدا کر دیا ہے۔ یعنی تمام اسلامی کاموں پر لوگوں کو مداخلت کا دعویٰ پیدا ہو گیا ہے۔'' (ایضاً: ص ۲۸۸)

اس کے ادبیات وفکاہات کے کالم میں سب سے زیادہ منظومات حضرت علامہ شبلی ہی کی چھپی ہیں۔ شایقین کو شبلی کی اسلامی، تاریخی یا وقت کے سیاسی مسایل پر مثلاً ہنگامۂ طرابلس وبلقان کے موقع پر ''شہر آشوبِ اسلام''، جنگ کے زخمیوں کی خدمت اور ڈاکٹر انصاری کے میڈیکل مشن کی واپسی پر ان کا خیر مقدم، ہنگامۂ مسجد کان پور، سوٹ ایبل گورنمنٹ، مسلم لیگ اور اس کے اندازِ فکر اور ذوق عمل، ترکوں کو آغا خاں کے مشورے، سیّد امیر علی سے خطاب، مسلم یونی ورسٹی کے مسایل، یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس، یونی ورسٹی کے الحاق، اس کے ڈیپوٹیشن، اس کے نصابِ تعلیم، ندوۃ العلماء میں اختلاف کا فتنہ اور اس کے اطراف ومتعلقات، جنگ یورپ ۱۹۱۴ء اور متعدد شخصیات، جماعتوں وغیرہ پر ان کے ادبی اور فکاہی رشحاتِ فکر کا قارئین الہلال کو انتظار رہتا تھا۔ ان کی منظومات نے الہلال کو مقبول بنایا تھا اور الہلال نے شبلی مرحوم کے افکار اور ان کے فیضان کو عام کیا تھا۔ شبلی کی منظومات الہلال کی فکر اور تحریک کا ایک حصہ تھیں۔

حضرت علامہ شبلی کو ایک عرصے تک شاید اس بات میں شبہ تھا کہ ابوالکلام جس دعوت کو لے

کر اٹھے ہیں اور جس تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں، وہ اس میں ثابت قدم بھی رہیں گے اور راہ کی جو مشکلات اور آزمائشیں پیش آئیں گی وہ ان کا مقابلہ بھی کر سکیں گے اور جس جوش و ولولے کے ساتھ وہ الہلال کے مضامین لکھ رہے ہیں اور جس اُسلوب اور لہجے میں وہ عام و خاص کو مخاطب کر رہے ہیں، یہ وقتی ہے یا اس میں پائیداری بھی ہے؟ حضرت شبلی مرحوم نے چند اشعار میں اپنے تذبذب کا اظہار بھی کیا۔ مولانا آزاد نے ان کے رشحات فکر کو الہلال میں جگہ دی۔ یہ اشعار ''جزر و مد...... الہلال کا لب ولہجہ'' کے عنوان اور ''کشاف'' کے قلمی نام سے شایع ہوئے ہیں:

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید
سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟

رہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام
اس میں کچھ شائبہ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟

اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر
اس میں کچھ قابل تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟

نکتہ چینی کا یہ انداز، یہ آئین سخن
بزم تہذیب میں یہ مستوجب رد ہے کہ نہیں؟

جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ
کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟

شاطروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط
اس میں ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں؟

پہلے گر شانِ غلامی تھی، تو اب خیرہ سری
اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں؟

فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں
''جزر'' جیسا تھا اسی زور کا ''مد'' ہے کہ نہیں؟

شبلی مرحوم کے یہ اشعار ''فکاہات'' کے باب میں الہلال کی پہلی جلد کے نمبر ۲۳، (ص ۱۳) میں شایع ہوئے۔ اس کے بعد الہلال کے دور اوّل کی چار جلدیں شبلی مرحوم کی زندگی میں اور شایع ہوئیں۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال کا آخری شمارہ شبلی مرحوم کے انتقال کی دردانگیز خبر کے ساتھ شایع ہوا۔ اس وقت تک الہلال اسی شان کے ساتھ شایع ہوتا رہا اور جب مولانا آزاد نے محسوس کر لیا کہ حکومت نے الہلال کا گلا گھونٹنے ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو ضمانت کی مطلوبہ رقم جمع کرانے کے بجائے اسے بند کر دیا۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ اُسلوبِ تحریر اور طرزِ تخاطب اور اس کا لب ولہجہ حالات و مصالح اور دعوت یا تحریک کی ضرورت کے مطابق تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بادشاہوں، ان کے امرا، وزرا، علما و مشائخ اور ان کی اولاد سے خطابات اس وقت کے حالات و

مصالح کے مطابق تھے۔شاہ اسماعیل شہید کے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے مواعظ کی زبان اور لہجہ ان کے مرض کی اس وقت کی حالت اور دعوت واصلاح کی ضرورت کے مطابق تھے۔ابوالکلام کے الہلال کی زبان اور اس کا اُسلوب بیان اپنے وقت کی ضرورت کے مطابق تھا۔جب موسم بدلا اور حالات کا تقاضا ہوا تو ان کا لہجہ اور ان کا طرزِ خطاب بھی بدل گیا۔چناں چہ دینی، اصلاحی، تبلیغی جلسوں کی تقریروں اور کانگریس کے خطبوں اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی کی تقریر اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں کل جماعتی کانفرنس لکھنؤ اور پارلیمنٹ کی تقریروں میں نہ صرف ان کا لب ولہجہ، بلکہ ان کی زبان اور طرزِ بیان بھی آپ بالکل بدلا ہوا پائیں گے کہ وقت کی ضرورت اور موقعہ ومحل کا تقاضا یہی تھا۔مدرس کے درس اور مولوی کے وعظ کی زبان، اُسلوب بیان اور لہجہ کب ایک ہوا ہے کہ ابوالکلام یا کسی اور پر زبانِ طعن دراز کی جائے؟

حواشی

۱۔ خاکسار نے الہلال کی فنی خصوصیات، اس کی ترتیب وتہذیب، زبان وبیان اور اس کی دعوت وتحریک پر ''ابوالکلام کی صحافت'' میں زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔(ا۔س۔ش)

(۷)

تحریکِ تالیفِ سیرۃ النبیؐ اور مولانا آزاد

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے عشق کی حد تک محبت ہر مسلمان کے ایمان کا جز ہے۔ شبلی نعمانی کے اجداد چوں کہ راجپوت نومسلم تھے اور نومسلم ہونے کے ناتے ان میں یہ جذبہ کچھ سوا ہی تھا۔ انھوں نے اپنی علمی زندگی میں تاریخ وسوانح کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں پچاسوں کتب و رسایل اور سیکڑوں مضامین و مقالات تحریر فرمائے اور خطبات دیے۔ لیکن علمی زندگی کا آغاز سیرت نبویؐ میں ایک رسالے کی تالیف سے ہوا تھا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ''بدءُ الاسلام'' کے نام سے تھا اور علی گڑھ کالج کے نصاب میں ایک مدت تک داخل رہا تھا۔ اور یہ بھی کیسا اتفاق تھا کہ ان کی زندگی کا آخری علمی کارنامہ بھی سیرت نبویؐ کی تالیف وتدوین تھا۔ بلکہ ان کی زندگی کی آخری مصروفیت اور آٹھ نو برس کے شب وروز کا مستقل مشغلہ سیرت نبویؐ کا مطالعہ، اسی میں غور وفکر، تحقیق اور تالیف وتدوین تھا اور جب فرشتۂ اجل ان کے پاس پہنچا تو سیرت نبویؐ کی تالیف کے ذوق وفکر سے ان کا سینہ معمور اور زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ ان کی زندگی کے آخری مشاغل کتنے مبارک اور خاتمہ کیسا قابلِ رشک تھا۔ اس مصروفیت پر انھوں نے ایک قطعے میں خدا کا شکر ادا کیا ہے:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

زندگی کے دورِ آخر میں انھیں سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تالیف کے اس عظیم کام کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس ہوا، پھر اس میں کس طرح پختگی آئی، عزم راسخ ہوا،

میدانِ عمل میں قدم رکھا، سروسامان کی فکر کی، کتابیں فراہم کیں، کارکنوں کو جمع کیا، مجلسِ تالیف سیرت قایم کی اور اس مبارک قافلے کی روانگی کس طرح اور کس اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی، حضرت سیّد سلیمان ندوی نے اس کی ضروری تفصیل ''حیاتِ شبلی'' کے ایک مستقل مبحث میں بیان کی ہے اور اس کی تالیف کے مراحل اور سفرِ مبارک کے سنگ ہائے میل گنائے ہیں۔ ان کے تفصیلی مطالعے کے لیے حیاتِ شبلی (سیرت النبی، صلّی اللہ علیہ وسلّم: ص ۷۱۸۔ ۶۹۹) سے رجوع کرنا چاہیے۔

اس سفرِ مبارک کے قافلہ سالار حضرت علامہ شبلی تھے اور وقت کے فاضلین کی ایک جماعت ان کے ''رُفقاے علمی'' کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھی۔ اس کام میں ان کے معاونین اور مشیرانِ اہل علم کا دایرہ براعظم ہند پاکستان کے دوردراز گوشوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان میں شبلی مرحوم کے ایک مخلص ابوالکلام بھی تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف آغازِ کار (۱۹۱۲ء) سے بلکہ اس وقت سے جب انھیں تالیف سیرت کی ضرورت کا احساس ہوا تھا، حضرت علامہ کے مشیر تھے اور سروسامان کی فراہمی کے انتظام سے لے کر تالیف وتحریر کے مسایل اور کتاب کی اشاعت وطباعت کے معاملات تک میں مشیر ومعاون رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام کے خطوط بنام حضرت شبلی اور مولانا سیّد سلیمان میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ خود مولانا آزاد ''تذکرہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآن حکیم میں دایرۂ استناد واخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے۔ جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا، آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے: قرآن اور سیرت محمدیہ......''

(تذکرہ: مرتبہ مالک رام، دہلی ۱۹۶۸ء، ص ۳۰۴)

اکتوبر ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انھیں سیرت کی بعض اچھی کتابیں ملیں۔ اس خوشی میں وہ مولانا آزاد کو بھی شریک کرتے ہیں اور انھیں ترغیب بھی دیتے

ہیں کہ ''آپ چاہیں تو خرید سکتے ہیں۔'' اسی خط میں لکھتے ہیں:

''آپ سے ملنے کی بہت ضرورت ہے کہ آیندہ کوئی متفقہ پروگرام تیار ہو کر کارروائی ہو سکے۔''

(خطوطِ شبلی بہ نام آزاد؛ بہار اُردو اکیڈمی، مکتوب مورخہ ۱۵ / اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۵۵)

سیرت نبوی کا پہلا حصہ ابھی پوری طرح مکمل بھی نہ ہوا تھا۔ البتہ دیباچے کا مسودہ تیار ہو گیا تھا جو انھوں نے مولانا آزاد کو بھیجا تھا۔ مولانا آزاد نے اسے ایک طویل نوٹ کے ساتھ چار قسطوں میں چھاپا تھا۔ لیکن یہ دیباچے کا صرف ایک حصہ تھا۔ یہ دیباچہ ۲۲ و ۲۹ / جنوری اور ۵ و ۱۲ / فروری ۱۹۱۳ء کی چار قسطوں میں مقالات کے باب میں ''سیرت نبوی'' کے عنوان سے شریکِ اشاعت کیا گیا تھا۔ دوسری قسط سے عنوان ''بابِ مقالات'' کے نیچے داہنی طرف صفحے کے کنارے ''تراجم احوال'' کی ایک ذیلی سرخی کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ الہلال کے نوٹ کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

ایں نیست کہ صحرائے سخن جادہ نہ دارد
واژوں روش کج نگری راچہ کند کس؟

اگر قوم میں کام کرنے والوں کی کمی ہے تو چنداں شکایت نہیں، کام کرنے والے ہمیشہ کم ہی رہتے ہیں۔ لیکن افسوس اس عالم گیر خیرہ مذاقی پر ہے کہ جو کام کرنے والے موجود ہیں، ان کے حسن و قبح کو پہچاننے والے بھی ناپید ہیں۔ تحسین ہے تو ناشناسانہ اور طعن ہے تو معاندانہ!

از رد و ہم قبولِ تو فارغ نشستہ ایم
اے آں کہ خوب ماشناسی ز زشت ما

(الہلال: ۲۲ / جنوری ۱۹۱۳ء ص ۸)

زیرِ نظر نوٹ کے نصف ثانی میں مولانا لکھتے ہیں:

''ناظرین کو معلوم ہے کہ کچھ عرصے سے شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ایک نہایت عظیم الشان دینی و علمی خدمت میں مصروف ہیں یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جامع و مکمل سیرت کی تدوین و تصنیف میں جو کہ نہ صرف اُردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی بلکہ افسوس کہ عربی اور ترکی زبانوں میں بھی جن پر اُردو سے

بہتر تصنیف وتالیف کا دور گزر رہا ہے! لیکن شاید بہت کم لوگوں کو اس کام کی مشکلات کا صحیح اندازہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کام ایک شخص کے بس کا نہ تھا، گو وہ اپنے اندر قابلیتوں اور فضیلتوں کا کیسا ہی مجمع رکھتا ہو! کیوں کہ قابلیت اور دماغ ہی نہیں بلکہ وقت اور محنت بھی مطلوب تھی۔ ضرورت تھی کہ ایک منتخب ترین ارباب علم کی مجلس ہوتی اور یورپ کے مجامع علمیہ کے اصول پر اس کام کو انجام دیا جاتا لیکن افسوس کہ ہم میں دماغ اور دل، دونوں کا قحط ہے۔ اور آدمی کسی مشین میں ڈھال کر پیدا نہیں کیے جا سکتے۔

اس وقت سیرۃ النبی کا کام جس رفتار سے ہو رہا ہے اس کے لحاظ سے امید کی جا سکتی ہے کہ غالباً چند ماہ کے اندر کتاب کا پہلا حصہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اس وقت تک مسودے کی صورت میں اس کا بڑا حصہ مرتب ہو چکا ہے اور بدر تک کے حالات کی پہلی تبئیض بھی ہو چکی ہے۔

ہم نے مولانا سے عرض کیا کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کے بعض اہم اجزا جن سے طرزِ تصنیف وترتیب اور مشکلاتِ موضوع کے خاص مقامات سامنے آ جائیں، شایع کر دینے چاہییں تاکہ اربابِ فن ورائے کو اس کی نسبت بحث کرنے اور مشورہ دینے کا موقع مل سکے۔" (ایضاً)

مولانا ابوالکلام کے اس مشورے کو حضرت علامہ نے قبول کر لیا اور سیرۃ نبوی کے دیباچے کے چند خاص مباحث مولانا کو بھیج دیے، جنھیں مولانا نے اپنے نوٹ کے ساتھ الہلال میں شایع کر دیا تھا، اسی نوٹ کے خاتمے کے قریب مولانا لکھتے ہیں۔

"آج کی اشاعت میں ہم دیباچۂ کتاب کا ایک ٹکڑا شایع کرتے ہیں، جس کے مطالعے سے موضوع کتاب کے متعلق ناظرین کو نہایت مفید بصیرت حاصل ہوگی۔ اس کے بعد اصل کتاب کے بعض اہم حصے بھی شایع کیے جائیں گے۔"

اس کے بعد مولانا نے اصحابِ ذوق وفن سے یہ گذارش کی ہے:

"اُن علمائے کرام سے، جن کو فن سیرت وحدیث سے دلچسپی ہے، خاص طور پر امید کی جاتی ہے کہ وہ بہ تعمق نظر ملاحظہ فرمائیں گے اور کوئی امر قابل بحث ومذاکرہ

یا مشورہ ضرور ان کے خیال میں آئے تو اسے دفتر سیرۃ نبوی یا صفحات الہلال تک پہنچانے میں دریغ نہ فرمائیں۔" (ایضا)

معلوم نہیں اس مسئلے سے کتنے لوگوں نے دل چسپی لی اور حضرت علامہ شبلی کو اپنے سنجیدہ نقد، تبصروں اور مشوروں سے نوازا اور دفتر سیرت نبوی (لکھنو) کو استفادے کا موقع دیا۔ الہلال میں صرف دو اصحاب؛ حکیم غلام غوث بہاولپور اور مولوی محمد اسحاق مدرس مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے مراسلات شایع ہوئے ہیں۔ ۳۱/اپریل ۱۹۱۳ء کو حکیم صاحب کا مراسلہ شایع ہوا، اس میں انھوں نے بیان کیا کہ طبری چوں کہ شیعہ تھا اس لیے حاشیے میں اس کے تشیع کا اظہار کر دینا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ لکھی کہ ولادت نبویؐ کے وقت کسریٰ کے محل کے کنگورے گرنا ایک تاریخی واقعہ ہے اور شاہ نامہ فردوسی میں اس کا ذکر آیا ہے اور شاہ نامے کا تاریخی ہونا خود شبلی نے شعر العجم میں تسلیم کیا ہے۔ مراسلے پر الہلال کا نوٹ ہے۔ اسی میں دونوں مشوروں کا جواب دیا گیا ہے:

۱۔ "امام طبری کی نسبت مولانا شبلی نے کوئی خاص بحث نہیں کی ہے اور نہ وہاں اس کا کوئی موقعہ تھا۔ بلکہ مؤرخین سیرت کے ذکر میں ضمناً ذکر آ گیا ہے۔ رہا الزام تشیع تو براہِ کرم اس کے وجوہ ارقام فرمایئے۔"

۲۔ دوسرے اعتراض کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

"محل کسریٰ کے تزلزل کی نسبت شاہ نامے سے استدلال تعجب انگیز ہے! اگرچہ مولانا (شبلی) نے شعر العجم میں اس کی تاریخی حیثیت پر زور دیا ہے تو اس سے یہ مقصود ہوگا کہ خود فردوسی نے بہ طور قصص اور داستان سرائی کے واقعات گھڑے نہیں ہیں، بلکہ قدیم ایران کی تاریخ کا جو مواد عربی میں آ چکا تھا اسی کو بہ حیثیت ایک دیانت دار مؤرخ کے نظم کر دیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ فردوسی بہ طور ایک محدث اور مؤرخ سیرت کے تسلیم کیا جائے!"

(الہلال: ۲۰/اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۱۰)

مولوی محمد اسحاق کلکتہ کے نقد کا کوئی جواب الہلال میں نہیں دیا گیا۔ البتہ حکیم غلام غوث کے مراسلے پر الہلال کے نوٹ سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ الہلال کے نزدیک ان کے اعتراض کی کوئی اہمیت نہ تھی، مذکورہ بالا نوٹ ہی میں لکھتے ہیں:

''صرف کلکتہ سے ایک صاحب نے ایک ضمنی امر کی نسبت تحریر بھیجی تھی جو آیندہ نمبر میں شایع کردی جائے گی۔'' (ایضاً)

چناں چہ اسی پر اکتفا کیا۔ ۲۱ر و ۲۸ر مئی کے الہلال کے ''باب المراسلت والمناظرہ'' میں یہ تحریر شایع کردی گئی، البتہ شبلی مرحوم اس سے اثر لیے بغیر نہ رہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی تحقیق کے مطابق:

''مولانا محمد اسحاق (کلکتہ) کے تعقب اور ان کے ردو تردید کا اتنا فایدہ ضرور ہوا کہ حدیث مذکور سے متعلق تنقید کا وہ حصہ مولانا شبلی نے اپنے دیباچے سے خارج کردیا۔''

(مولانا شبلی بہ حیثیت سیرت نگار: علی گڑھ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۱)

حضرت علامہ شبلی نے اس بحث، جس پر نقد کیا گیا تھا، کو دیباچے سے ضرور خارج کردیا لیکن ان کی رائے نہ بدلی تھی۔ اس لیے کتاب میں جہاں یہ بحث آئی تھی وہاں نہ صرف یہ کہ وہ اپنی رائے پر مصر رہے، بلکہ اسے دلایل سے اور مستحکم کردیا۔ محترم صدیقی صاحب فرماتے ہیں:

''اصل کتاب (سیرۃ النبیؐ) میں جہاں اس روایت کے مندرجات انھوں نے تفصیل کے ساتھ ذکر کیے ہیں، وہیں اس سے متعلق اپنے خلجان کا ذکر بھی پیرایۂ زبان بدل کر کردیا ہے۔ پھر آخر میں اس روایت کی سند پر کلام کرتے ہوئے اسے ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے۔'' (ایضاً: ص ۴۳-۱۴۱)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ہمارے لیے اپنے اس بیان ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ سیرۃ النبیؐ (حصہ اوّل، اشاعت چہارم ص ۵-۲۰۳) سے پوری بحث بھی نقل کردی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دیباچے کا الہلال میں چھپنا کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوا۔ الہلال کی طرف صرف دو حضرات متوجہ ہوئے حال آں کہ اس سے کہیں زیادہ کی توقع تھی۔ ایک صاحب کو صرف اشکال تھا اور دوسرے صاحب ایک ضمنی مسئلے پر معترض تھے، مخالف نہ تھے۔ اس سے بھی منصوبے کو کسی نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن حضرت سیّد صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ مخالفت کے لیے اس انتظار میں تھے کہ شبلی کی کوئی تحریر ہاتھ لگے، انھیں اچھا موقع ہاتھ آیا۔ ان میں مولانا عبدالشکور لکھنوی کا نام سیّد صاحب نے خاص طور پر لیا ہے۔ ''ایک

فتنہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام کی تحریک تھی کہ سیرت خوشنما ٹائپ میں چھپے۔ مولانا شبلی نے نمونہ کے طور پر چھاپنے کے لیے اس کے مقدمے کو ان کے پاس الہلال پریس کلکتہ بھیج دیا۔ مولانا ابوالکلام نے اس مقدمے کو الہلال میں بھی چھاپ دیا تاکہ اہل نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے۔ لیکن بعض مخالفین جن کو دل سے یہ بات پسند نہ تھی کہ سرکار عالیہ کی سرپرستی میں جو سیرۃ نبوی ﷺ لکھی جائے وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، اس کے منتظر تھے کہ سیرۃ کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کریں۔

یہ مقدمہ نکلا تو مولوی عبدالشکور صاحب ایڈیٹر النجم نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مقدمے پر نہایت سخت تنقید لکھی۔ مخالفین نے جن میں ''دیوبند'' کے کچھ لوگ بھی تھے، اس تنقید کو دستاویز بنالیا۔ اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا اور بعض ذرائع سے وہ سرکار عالیہ تک پہنچائی گئی......'' (حیات شبلی: ص ۱۵۷)

الہلال میں دیباچے یا مقدمے کے جو صفحات چھپوائے گئے تھے اس کے نتیجے پر سر عبدالقادر کے نام ایک خط میں علامہ شبلی نے بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''الہلال میں بھی جو صفحہ نمونے کے لیے چھپوایا لیکن عام لوگ متفق نہیں۔''

(خطوطِ شبلی: خط مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۲۴۳)

اس سلسلے میں ایک یہ سوال پیدا ہوا کہ سیرۃ نبوی کا مسودہ کسی مستند اور صاحبِ نظر عالم دین کو دکھایا جائے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ شبلی جیسے صاحبِ قلم اور مصنف کتب کثیرہ، جس کی پوری زندگی قلم و قرطاس کی صحبت میں گزری تھی اور مختلف علوم و فنون میں بیسیوں تصانیف اور پچاسوں مقالات ان کے صاحبِ علم و فن ہونے کا ثبوت تھے، ان کا مضمون کس کو دکھایا جائے اور اس پر شبلی کیسے آمادہ ہوں گے؟ لیکن شبلی حضرت مولانا محمود حسن شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی نظر ورائے پر آمادہ ہوگئے لیکن حضرت (شیخ الہند) کو ان کے اردگرد کے لوگوں نے اس کام پر آمادہ ہی نہ ہونے دیا۔ لیکن اگر بھوپال کے حکمراں کو کوئی شک کتاب کے معیار اور تحریر کے بارے میں ہو بھی گیا تھا تو وہ جلد دور ہوگیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت شبلی اس پر آمادہ ہوگئے تھے کہ بھوپال کی امداد

سے دست بردار ہو جائیں گے۔

سیرت نبویؐ کا اگلا مرحلہ اس کی کتابت اور طباعت کا تھا۔حضرت علامہ شبلی کے حلقے میں کتابت و طباعت میں جو تجربہ مولانا ابوالکلام آزاد کو تھا وہ معلوم ہے! ابوالکلام کے ذوق و معلومات پر سبھی اعتماد کرتے تھے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے انھی سے مشورہ کیا۔مولانا آزاد ہاتھ کی کتابت کے بجائے ٹائپ کے حروف کو پسند کرتے تھے کہ حالات و وقت کے تقاضوں کا ٹائپ ہی ساتھ دے سکتا تھا۔انھوں نے الہلال اسی لیے ٹائپ میں نکالا تھا اور اسی کے استعمال کے محرک تھے۔۱۹۱۴ء کے شروع میں جب یہ مرحلہ پیش آیا اور حضرت شبلی مرحوم نے اس امر کا فیصلہ کر کے یکسو ہو جانا چاہا تو مولانا نے ان کی خواہش پر ٹائپ،عمدہ کاغذ اور طباعت کے نمونے حضرت مرحوم کی خدمت میں بھیج دیے۔۵/مارچ ۱۹۱۴ء کے مکتوب میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''نمونہ طبع پہنچا۔سبحان اللہ! ٹائپ اس سے بہتر کیا ہوگا؟ لیکن آپ نے لکھا ہے کہ کئی کاغذ کے نمونے بھیجوں گا۔یہ تو صرف ہلکا ہے۔چکنا اور آب دار کاغذ زیادہ نمونہ طلب تھا۔''

اس خط کو ختم کر چکے تو ایک اور بات یاد آئی۔چناں چہ پسِ تحریر لکھتے ہیں:

> ''آپ نے لکھا ہے ہارٹ پریس میں دے کر حروف زیادہ روشن ہو جاتے ہیں،تو تیار کرا کر بھیجیے! غرض یہ کہ کوئی حالت منتظرہ نہ رہے۔البتہ تخمینۂ طبع بھی بھیجیے۔یعنی فی عنصر (دو روپیہ) کتنے اجزا پڑیں گے؟''

(خطوط شبلی بنام آزاد: خط مورخہ ۵/مارچ ۱۹۱۴ء،ص ۱۶۲و۱۶۴)

کسی بیان یا خط سے یہ روشنی نہیں پڑتی کہ مولانا آزاد نے اس فرمایش کا کیا جواب دیا اور اس مسئلے کا فیصلہ کیا ہوا۔جب تک مرحوم شبلی صحت مند رہے ان کی اپنی گوناگوں مصروفیات تھیں، پھر بیمار پڑے تو سارا کارخانہ معطل ہو گیا۔ممکن ہے مشورہ و غور و فکر کے بعد مرحوم شبلی کسی نتیجے تک پہنچ گئے ہوں۔لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ ۱۹۱۵ء تک نہ ہو سکا تھا۔

سیرۃ نبوی کی تالیف و تدوین اور کتابت و طباعت وغیرہ مسایل میں حضرت علامہ کو مولانا سیّد سلیمان ندوی،مولانا حمید الدین فراہی کے علاوہ جس شخص کے علم و رائے اور اخلاص پر سب سے زیادہ اعتماد تھا،وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی تھی۔یہ بات بہت مشہور ہے کہ آخری

وقت میں مذکورۃ الصدر انھیں تین مخلصین کو انھوں نے تار دیے تھے کہ اعظم گڑھ پہنچیں اور سیرۃ نبوی کی ذمہ داری سے انھیں اطمینان دلائیں۔ مولانا آزاد کے نام حضرت مرحوم کا تار مولانا سیّد سلیمان ندوی نے شبلی کے خطوط بنام ابوالکلام آزاد میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ خطوط معارف (اعظم گڑھ) میں شایع ہو چکے ہیں۔ میرے سامنے مکاتیب شبلی مرتبہ مولانا سیّد سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء ہے۔ اس میں شبلی کے تار کا مضمون یہ ہے:

> ''اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا۔ ورنہ سب کارروائی بیکار ہو جائے گی۔ سیّد سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔''

یہ محض اتفاق تھا کہ حضرت سیّد صاحب اسی روز پہنچ گئے تھے۔ ۱۸ر نومبر کو حضرت شبلی نے اعلیٰ علیین کا سفر اختیار کیا۔ یہ حضرت شبلی کا مولانا ابوالکلام اور دیگر دونوں مخلصین کے ذوق وعلم و رائے اور ان کے اخلاص کا بہت بڑا اعتراف اور شہادتِ حق ہے۔

(۸)

علامہ شبلی کی رحلت اور مولانا ابوالکلام آزاد

(۱۹۱۴ء)

۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو حضرت مولانا شبلی نعمانی کا انتقال ہوگیا اور مولانا ابوالکلام سے چودہ سالہ تعلقات کی تاریخ کا ورق پلٹ گیا۔ آخری دس برسوں میں دونوں کے تعلقات بہت قریبی ہوگئے تھے۔ مولانا آزاد تو انھیں اپنا بزرگ دوست سمجھتے ہی تھے، مولانا شبلی بھی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ندوۃ العلما اور علامہ شبلی کے دفاع میں ابوالکلام نے جو تاریخی کردار ادا کیا تھا وہ ان کی بہت بڑی ملّی خدمت تھی۔ اس سے حضرت شبلی کی نظروں میں ان کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن ابوالکلام اس سے بالکل بے نیاز اور بے پروا تھے۔ وہ مولانا شبلی کے مخلص اور ان کے قدرداں تھے۔ ابوالکلام ان کی علمی شخصیت سے متاثر اور علوم وفنون میں ان کی جامعیت کے بہت قایل تھے اور تاریخ وسوانح اور ادب وتنقید میں ان کے کمالات وخدمات کے معترف تھے۔ علامہ شبلی کا تار متعلق انتظام سیرۃ نبوی پہنچا تو وہ الہلال دورِ اوّل کا آخری شمارہ ترتیب دے رہے تھے۔ حکومت نے اس کی پچھلی ضمانت ضبط کرلی تھی۔ اس کا ایک مضمون اور ایک تصویر قابلِ اعتراض قرار پائی تھی اور دس ہزار روپے کی نئی ضمانت طلب کی تھی۔ لیکن معلوم تھا کہ حکومت الہلال کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے گی، اس لیے نئی ضمانت جمع نہ کرانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مولانا ابھی ان الجھنوں سے فارغ نہ ہوئے تھے اور ضمانت جمع کرانے کی مدت کے اندر الہلال کا آخری شمارہ چھاپ کر فارغ ہوجانا چاہتے تھے کہ حضرت علامہ شبلی کے انتقال کی اطلاع ملی۔ مولانا نے اسی شمارے میں حضرت شبلی کی وہ تاریخی تصویر، جو رحمٰن فیضی نے بنائی تھی، ایک سیاہ چوکھٹے میں سجائی اور اپنے رنج والم کے اظہار میں ایک تحریر کے ساتھ شایع کردی۔ جن حالات میں پہلے شبلی کا تار پہنچا تھا، پھر ان کے انتقال کی خبر ملی تھی اور جن حالات میں الہلال کے دورِ اوّل کا یہ آخری شمارہ شایع کیا جارہا تھا اور اظہارِ رنج و

غم کے ساتھ رسم تعزیت بھی ادا کرنی تھی، اس میں ان کی پریشان خیالی کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔

تصویر پر جو تعزیتی نوٹ ہے، اس میں ایک سطر یہ بھی ہے:

> ''اس وقت تو یہ رونا ہے کہ ہم دل کھول کر اس شہیدِ علم کا ماتم بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنی خوں نابہ فشانیوں کو دوسری فرصت کے لیے ملتوی رکھتے ہیں۔''

حضرت علامہ شبلی کے حادثۂ انتقال کو مولانا آزاد نے ایک شخص کی موت کے بجائے ''علم کی موت'' اور ''حادثہ فاجعۂ علمیہ'' قرار دیا ہے اور موت العالم موت العالَم کے مشہور اور رٹے پٹے جملے کو دہرانے کے بجائے عربی کا وہ شعر بہ تصرف استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قیس کی موت تنہا ایک فرد کی موت نہیں، اس کا مرنا تو پورے قبیلے کا مرجانا ہے کہ

وما کان شبلی هلکه هلک واحد

ولکنه بنیان علم تهدما!

> ''شبلی کی وفات کسی شخص واحد کے وفات پا جانے کا حادثہ نہیں، بلکہ ان کے حادثۂ انتقال سے علم کی بنیاد ہل گئی ہے۔''

یہ شبلی کی علمی فضیلت کو بہت بڑا اخراج ہے جو انھیں پیش کیا گیا تھا۔

یہ جملے اور شعر تو تصویر کے سرنامے کی زینت ہے۔ تصویر کے نیچے تعارفی جملہ: ''فقید العلم مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ'' ہے اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

> ''نہایت رنج و افسوس کے ساتھ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے حادثۂ وفات کی خبر درج کی جاتی ہے۔ اس ماتم کے لیے صرف یہ مرقع رنج و غم کافی نہیں۔ اس کے لیے تو الہلال کا ایک پورا نمبر بھی کافی نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت تو یہ رونا ہے کہ ہم دل کھول کر اس شہیدِ علم کا ماتم بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنی خوں نابہ فشانیوں کو دوسری فرصت کے لیے ملتوی رکھتے ہیں۔ درد رسیدوں کے ماتم کے لیے کوئی وقت محدود نہیں ہے۔ آبلۂ دل ہر وقت پھوٹ بہنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ نشترِ غم کی کھٹک چاہیے اور وہ اس حادثۂ فاجعۂ علمیہ کی بہ دولت دل میں ہر وقت موجود رہے گی۔'' (۱)

(الہلال: کلکتہ، ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء، ص ۱۷)

مولانا آزاد نے صفحۂ تعزیت پر جس تصویر کو چھاپا ہے وہ مشہور آرٹسٹ رحیمن فیضی کے برش قلم کا شاہکار ہے۔ یہ اس نے ۱۹۱۳ء میں بنائی تھی۔ علامہ شبلی سے اپنے ایک خط بنامِ آزاد مورخہ ۲۰/اگست ۱۹۱۳ء میں مولانا سے وعدہ کیا تھا، ''میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا۔'' الہلال میں مولانا نے اس تصویر کو دو مرتبہ شایع کیا تھا۔ پہلی بار ''سیرۃ نبویؐ'' کے دیباچے کی پہلی قسط کے ساتھ! اور دوسری مرتبہ اب مولانا شبلی کی وفات کے سانحے کے موقع پر!

اسی زمانے میں مولانا ابوالکلام نے مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال، کلکتہ میں ایک جلسے سے خطاب کیا۔ یہ جلسہ جسٹس سیّد حسن امام کے زیر صدارت شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا، ''حضرت علامہ شبلی نعمانی کی حیات علمی۔'' مولانا آزاد کے ایک عزیز و مخلص مولوی محمد یعقوب نے اپنے طور پر مولانا کی تقریر کے نوٹ لے لیے تھے اور پھر اس خیال سے کہ تالیفِ مطالب میں کوئی غلطی نہ رہ جائے، مولانا کی خدمت میں پیش کیے کہ وہ اس پر اصلاح کی نظر ڈال لیں۔ مولانا نے یہ نوٹ لے کر رکھ لیے، لیکن پھر یہ بات ان کے ذہن سے نکل گئی۔ مولانا محمد یعقوب نے بھی مولانا کو یاد نہ دلایا۔ اس واقعے پر ایک سال گزر گیا۔ ایک روز وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے تھے کہ اچانک یہ مسودہ ان کے ہاتھ میں آگیا۔ اس وقت البلاغ کا اجرا عمل میں آچکا تھا۔ مولانا نے ایک نوٹ کے ساتھ اسے البلاغ میں اشاعت کے لیے دے دیا۔ مولانا کی یہ تقریر شمارہ: ۴، ۵ مورخہ ۱۷ اور ۲۴/دسمبر ۱۹۱۵ء میں شایع ہوگئی۔ ابتدائی نوٹ میں مولانا فرماتے ہیں:

> ''آج ایک سال کے بعد ایک ضرورت سے کاغذ دیکھنے لگا تو یہ پورا مضمون نکل آیا۔ مضمون نے سال گذشتہ کا وہ زمانہ یاد دلایا، جب میں نے ان کاغذات کو حوالۂ نسیاں کیا تھا۔ اور اس یاد کے ساتھ ہی مولانا شبلی مرحوم اور ان کی ناقابلِ فراموش علمی اور ادبی صحبتیں یاد آگئیں۔''

جرت الریاح علی مکان دیارہم
فکانہم کانوا علی میعاد!

اگرچہ یہ ایک محض زبانی اور سرسری تقریر تھی اور پھر اس کے بھی ناممکل و متفرق نوٹ ہیں، تاہم خیال آیا کہ گذشتہ کی ہر یاد اور رفتہ کا ہر تذکرہ کچھ نہ کچھ دل چسپی

ضرور رکھتا ہے، اسے شایع کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے سرسری اشارات سے کوئی مفید بات کسی کو معلوم ہو جائے اور پھر تذکرۂ علم وارباب علم بہ ہر حال عدم تذکرہ سے بہتر ہے۔''

(البلاغ: کلکتہ: ۷ او ۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء، ص ۱۱۳)

بلاشبہ اس تقریر میں بہت سی مفید باتیں، شبلی کی حیات علمی کے خصایص، فکر انگیز نکات اور ایسے اشارات ہیں جو ہمیں زندگی کے حقایق سے آشنا کرتے ہیں۔ قارئینِ کرام کے لیے مولانا آزادؔ کی اس تقریر کا مطالعہ، اگر چہ یہ مکمل اور مربوط اور کلیتاً مولانا کے الفاظ میں نہیں، افادیت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

''آپ اعلان پڑھ چکے ہیں کہ میرا موضوع ''مولانا شبلی مرحوم کی حیاتِ علمی و ادبی'' ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ ڈیڑھ گھنٹے کی صحبت کے اندر ایک چہل سالہ علمی زندگی کے متعلق آپ کو کیا بتلا سکتا ہوں۔ اس قسم کے علمی موضوعوں کے لیے بہت کافی وقت کی ضرورت ہے۔

ہمارے سامنے ایک ایسی زندگی ہے جو یک سر تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی اور جس کی تصنیف و تالیف کا میدان نہایت وسیع تھا۔ اگر صرف ایک فن ہی کا تذکرہ ہوتا تو اس کے لیے بھی ایک مختصر صحبت کافی نہ تھی۔ یہاں تو مختلف علوم کی تصنیفات و مباحث کے مسایل درپیش ہیں اور جن میں بعض ایسے علوم بھی ہیں جن کا ذوق باہم متضاد و مختلف ہے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں اور ایک ہی وقت کے اندر تاریخ، سیرت، کلام، حدیث اور ادب و شعر کے متعلق تصنیفات مرتب کی ہیں۔''

اس کے بعد مولانا نے شبلی مرحوم کے مختلف فضایل علمی پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہمارے فقیدِ ملت کی ایک خصوصیت ''جامعیتِ ذوق'' بھی تھی اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

''ایک ہی وقت میں مختلف علوم کا مطالعہ اور علی الخصوص ایسی چیزوں کا ایک ہی وقت میں ذوق صحیح پیدا کرنا جو باہم متضاد سمجھی جاتی ہوں، عجائبات سے ہے۔ ایک دماغ ایک ہی وقت میں فلسفہ اور شاعری کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور بہت مشکل ہے

کہ ایک شخص تاریخ کے ساتھ ادب اور کلام کا بھی مطالعہ جاری رکھے۔ قدماے اہلِ اسلام میں بھی جامعیت کی مثالیں زیادہ نہیں ملیں گی۔"

اس کے بعد مولانا آزاد نے امام غزالی، امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی کی مثالیں دے کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور اسے ثابت کیا ہے۔ آخر میں فرمایا:

"......لیکن مولانا شبلی مرحوم کو اگر ہم ایک ہی وقت کے اندر مختلف علوم کے مطالعے میں منہمک پاتے ہیں تو اس کی قدر شناسی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں مختلف زندگیوں کے کام انجام دیے۔ ان کی تصنیفات ان کے تعددِ مذاق و تنوع مطالعے کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں مورخِ خلفاء، مورخ ملوک، مورخِ علوم اور پھر ادیب، انشا پرداز اور شاعر تھے۔ بارہا تم نے دیکھا ہوگا کہ تاریخ و کلام کی علمی صحبتوں سے اٹھ کر حسن و عشق کی شاعرانہ بزموں میں نغمہ طراز ہیں اور ادب و شعر کی مجلسیں ان کی دقیقہ سنجیوں سے رونق پا رہی ہیں۔"

(البلاغ: کلکتہ: مورخہ ۷ او ۲۴ ر دسمبر ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۵)

حواشی

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت علامہ شبلی کے انتقال پر الہلال کے ایک صفحے میں مولانا مرحوم کی تصویر کو عباراتِ مختلفہ و متعددہ کے ساتھ سیاہ چوکھٹے میں جس طرح سجایا ہے، ٹھیک اسی طرح انھیں عبارات اور تصویر زیرِ نظر کتاب کا ایک صفحہ مزین کیا ہے۔ اس عنایت کے لیے ہم اپنے نہایت کرم فرما محترم احمد حسین صدیقی امروہوی (کراچی) کے بہت شکر گذار ہیں۔ (ا۔س۔ش)

(۹)

مرحوم علامہ شبلی نعمانی

حیات علمی وادبی پر ایک سرسری نظر

تمہیدی نوٹ:

"گزشتہ سال ایک یادگار جلسہ مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں زیر صدارت جسٹس سیّد حسن امام منعقد ہوا تھا، اس غرض سے کہ یہ عاجز شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی حیات علمی وادبی کے متعلق لیکچر دے۔

کسی کثیر التصانیف مصنف کی علمی زندگی کے متعلق، علی الخصوص جب کہ وہ مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہو، ایک دو گھنٹے کی صحبت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ تاہم ایک تقریر کی گئی اور چوں کہ مجمع ہر طرح کا تھا، اس لیے کوشش کی گئی کہ خالص علمی مباحث کا خشک مذاکرہ ہی نہ ہو، بلکہ زیادہ تر انھی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے جو عام طور پر بھی کوئی ادبی وعلمی بصیرت سامعین کے لیے رکھتے ہیں۔

میرے ایک عزیز ومخلص مولوی محمد یعقوب صاحب نے اس تقریر کے نوٹ بہ طور خود لے لیے تھے۔ وہ ان کو مرتب کر کے اس غرض سے میرے پاس لائے کہ کسی بیان میں غلطی تو نہیں رہ گئی ہے۔ چناں چہ وہ کاغذ لے کر میں نے رکھ لیا۔ لیکن اس کے بعد نہ تو مجھے اس کی یاد آئی اور نہ مولوی صاحب نے یاددہانی کی ضرورت سمجھی۔ آج ایک سال کے بعد ایک ضرورت سے کاغذات کو دیکھنے لگا تو یہ پورا مضمون نکل آیا۔ مضمون نے پہلے سال گذشتہ کا وہ زمانہ یاد دلایا جب میں نے ان کاغذات کو حوالۂ نسیاں کیا تھا۔ اور اس یاد کے ساتھ ہی مولانا شبلی مرحوم اور ان کی ناقابلِ فراموش علمی اورادبی صحبتیں یاد آ گئیں۔

جرت الریاح علی مکان دیارہم
فکانہم کانوا علی میعاد!

اگر چہ یہ ایک محض زبانی اور سرسری تقریر تھی اور پھر اس کے بھی یہ ناممکل و متفرق نوٹ ہیں، تاہم خیال آیا کہ گذشتہ کی ہر یاد اور رفتہ کا ہر تذکرہ کچھ نہ کچھ دلچسپی ضرور رکھتا ہے، اسے شائع کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے سرسری اشارات سے کوئی مفید بات کسی کو معلوم ہو جائے اور پھر تذکرۂ علم وارباب علم بہ ہر حال عدم تذکرہ سے بہتر ہے۔" (آزاد)

تقریر:

"میں اس موثر اور عظیم الشان اجتماع پر اس ہال کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ انسانوں کا ایک بہت بڑا مجمع مجھے اپنے اردگرد نظر آتا ہے کیوں کہ مجامع ہمیشہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے۔ اس لیے نہیں کہ شوق اور محویت کا ایک غیر معمولی اجتماع میرے سامنے ہے۔ کیوں کہ میں نے اس سے بھی وسیع تر حلقہ ہائے محویت و ذوق دیکھے ہیں اور اس لیے بھی نہیں کہ ایک منتخب اور تعلیم یافتہ صحبت یہاں منعقد ہوگئی ہے، کیوں کہ ایسا بارہا ہوا ہے اور یہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں، مگر حضرات! صرف اس لیے کہ آج کا اجتماع ان تمام موجبات تبریک سے بھی بڑھ کر ایک خصوصیت اپنے اندر رکھتا ہے اور وہ کسی متمدن اور زندہ اجتماع کے لیے سب سے بڑی عظمت ہے جو دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارا آج کا اجتماع طاقت کے ماتم میں نہیں ہے، جس کا ماتم ہمیشہ کیا جاتا ہے۔ ہمارا ماتم دولت کے لٹنے کا نہیں ہے، جس کے لیے غلام دولت مجمعوں نے ہمیشہ ماتم کیا ہے، ہمارا ماتم دنیوی عزتوں کے لیے نہیں ہے جس پر حلقہ بگوشانِ دنیا نے ہمیشہ سینہ کوبی کی ہے۔ ہم کو کسی دنیوی عزوجاہ کی کشش کھینچ کر یہاں نہیں لائی ہے، جس کی طاقتور زنجیروں نے ہمیشہ بندۂ ہوس انسانوں کو مقیّد کیا ہے۔ بلکہ آج ہم صرف علم اور فن کے ماتم کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، جس کی تقدیس سب سے بالاتر اور جس کی عظمت کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی ہیچ ہے۔ (چیرز)

ہم ایک ایسے انسان کے غم میں اشک بار ہیں، جو ایک فقیر بے نوا تھا، جس کو کسی طرح دنیوی عزت حاصل نہ تھی، جو نہ کبھی بڑے بڑے ایوانوں میں رہا اور نہ چاندی سونے کے خزانے اپنے وارثوں کے لیے جمع کیے، (چیرز) البتہ اس نے دنیوی شہنشاہوں کی جگہ چالیس سال تک سلطانِ علم کی خدمت گذاری۔ (چیرز) پس مبارک ہے وہ اجتماع جو علم اور اربابِ علم کے لیے ہو!

اور مبارک ہو تم کہ آج طاقت، حکومت، عزت اور دولت کی جگہ صرف علم اور اہل علم کی عظمت کے لیے جمع ہوئے ہو!'' (چیرز)

اس کے بعد مقرر نے اصل موضوع پر توجہ کی اور اپنی مشکلات کو ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا:

''آپ اعلان میں پڑھ چکے ہیں کہ میرا موضوع ''مولانا شبلی مرحوم کی حیاتِ علمی و ادبی'' ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی صحبت کے اندر ایک چہل سالہ علمی زندگی کے متعلق آپ کو کیا بتلا سکتا ہوں۔ اس قسم کے علمی موضوعوں کے لیے بہت کافی وقت کی ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے ایک ایسی زندگی ہے جو یک سر تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی اور جس کی تصنیف و تالیف کا میدان نہایت وسیع تھا۔ اگر صرف ایک ہی فن کا تذکرہ ہوتا تو اس کے لیے بھی ایک مختصر صحبت کافی نہ ہوتی۔ یہاں تو مختلف علوم کی تصنیفات و مباحث کے مسایل در پیش ہیں اور جن میں بعض ایسے علوم بھی ہیں، جن کا ذوق باہم متضاد و مختلف ہے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں ایک ہی وقت کے اندر تاریخ، سیرت، کلام، حدیث اور ادب و شعر کے متعلق تصنیفات مرتب کی ہیں، اور اس لیے ہمیں بھی ایک ہی وقت کے اندر علوم دینیہ کے خشک اور مقدس مباحث کے ساتھ عالم حسن و عشق اور ادب و شعر کی گلیوں میں بھی سراغ رسانی کرنی ہے اور پھر اس سے بھی مشکل تر یہ ہے کہ کسی مصنف کی زندگی پر نقد و بحث کرنے کے لیے خالص علمی بحث کی ضرورت ہے۔ انھوں نے جن مواضع پر اپنی مصنفات یادگار چھوڑی ہیں، ان کے مقاصد اور اطراف و متعلقات کو واضح کرنا چاہیے۔ پھر ان مقاصد کے لیے جو ذخیرہ متقدمین کا موجود ہے، اس کی حالت کو بہ کثرت مثالیں دے کر اور اقتباسات پیش کر کے ذہن نشین کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دیکھنا چاہیے کہ ایک ایسے متفرق، غیر مرتب، غیر منظم، اور پریشاں سامان سے کیوں کر ایک کامل و جامع اور مرتب و منظم عمارت تعمیر کی گئی؟ اور اجتہادِ فکر، دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور حسن اخذ و استدلال نے کس طرح ان تمام نقصوں کو پورا کر دیا جو قلتِ مواد اور تساہل مصنفین سے پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن علاوہ قلتِ وقت کے یہ ایک ایسی بحث ہوگی جو شاید بعض طبایع پر شاق گزرے۔

پھر اس سے بھی مقدم تر اَمر فنِ تصنیف و تالیف کا تذکرہ ہے اور اس کے بغیر میری بحث کامل نہیں ہو سکتی۔ تصنیف کی مختلف قسمیں ہیں اور مجھے بتلانا چاہیے کہ ان کے فرایض و مقاصد کیا کیا ہیں؟ نیز یہ کہ ایک مصنف کے لیے استعداد دماغی، حسن مطالعہ اور وسعت معلومات کیوں کر بہم

ہو سکتے ہیں اور ہمارے فقید علم و فن کا ان ضروری ارکان تلاثۂ تصنیف میں کیا حال تھا؟

ایسی حالت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس موضوع کو قلتِ وقت نے کس قدر مشکل کر دیا ہے! تاہم مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہے اور اسی موضوع پر کہنا ہے۔ میں مختصر اشارات سے کام لوں گا اور کوشش کروں گا کہ اس علمی زندگی میں جو عبرتیں اور بصیرتیں خواستگارانِ علم و بزرگی کے لیے پوشیدہ ہیں، انھیں اپنے سفر بیان کے ہر قدم پر نمایاں کروں۔ کیوں کہ ان تمام مذاکرات و بیانات کا مقصدِ اصلی یہی ہے۔ ''لقد کان فی قَصَصِهِمْ عبرة لاوّلی الالباب''

اس کے بعد انھوں نے مختصر طور پر تصنیفات کی بہ لحاظ موضوع و مقاصد چند قسمیں بیان کیں اور سب سے پہلے مولانا مرحوم کی تاریخی تصنیفات کو بحث کے لیے منتخب کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے اسلام کے تاریخی ذخیرے کی ایک مختصر تاریخ بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ:

> ''اگر چہ اسلام کی تدوینِ تاریخ کے مختلف دور ہیں مگر میں تسہیل بیان و اختصار مطلب کی غرض سے انھیں صرف دو بڑی قسموں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ پہلے قدما مؤرخین کا دور جو سنہ ۶۰ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ بہ روایت ابن الندیم بعض روایات غزوات قلم بند کی گئیں اور متاخرین مؤرخین کا دور جنھوں نے چوتھی صدی کے بعد نئی ترتیبات و مقاصد سے تاریخیں مدوّن کیں۔''

اس کے بعد انھوں نے قدما کی خصوصیاتِ تحریر و تدوین کو بیان کیا اور دیر تک اس کی تفصیل مثالوں کو پیش کر کے ذہن نشین کرتے رہے۔ مثلاً انھوں نے کہا:

''سادگی بیان، سلسلۂ روایت، صحتِ نقل، عدم تاثر مؤثرات سیاسیہ و دینیہ اور تمام اجزاے ضروریۂ واقعہ نگاری کے لحاظ سے ہمارا اصلی ذخیرہ (مثل تمام علوم اسلامیہ کے) صرف متقدمین ہی کا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہی دولت اصلی ضایع ہو چکی ہے اور مستشرقین یورپ علی الخصوص علم پرستان جرمنی کی بہ دولت جو چند کتابیں میسر آگئی ہیں، وہ ہماری ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہیں۔ سب سے قدیم تر کتاب طبقات ابنِ سعد ہے، جو صحابۂ کرام کا تذکرہ ہے اور گذشتہ آٹھ سال کے اندر مستشرقین جرمنی کی مساعی حسنہ سے شایع ہوا ہے۔ اس کے بعد ابن قتیبہ، ابوحنیفہ، طبری، ابن الندیم، بلاذری، یعقوبی اور ابن ہشام ہیں اور تمام متاخرین تقریباً انھی کتابوں سے مواد اخذ کرتے ہیں۔'' پھر انھوں نے متاخرین کا ذکر کیا ہے اور کہا:

''مواد تاریخ کے لیے تقریباً یہ تمام ذخیرہ بیکار ہے۔ کیوں کہ اوّل تو کوئی نئی شہادت نہیں، پھر ترتیب وتنظیم اور جزئیات تاریخ کے لحاظ سے بھی کچھ مفید نہیں۔''

انھوں نے ابن خلدون کے مقدمہ، مقریزی کی تاریخ مصر اور اندلس کے مؤرخین کو اس عام تنزلِ تاریخی سے مستثنیٰ کر دیا اور محی الدین مراکشی، ابن وزیر غرناطی اور مقری کی بہت تعریف کی: ''جنھوں نے قرونِ مدیہٗ اندلس کے متعلق بہترین مواد تاریخی جمع کیا اور مذاق تصنیف کے تنزل اور تدوین علوم کی اس بدمذاقی سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہوئے جو تمام مشرق پر طاری تھا۔''

سلسلۂ بیان میں انھوں نے تاریخ مصنفات اسلامیہ وعربیہ کے متعلق جا بجا نہایت مفید اور دقیق اشارات کیے جو افسوس ہے کہ اُردو مختصر نویسی کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے قلم بند نہیں کیے جا سکتے۔ مثلاً انھوں نے طرزِ تصنیف، طریق ترتیب، تنظیم مطالب، تقسیم ابواب وفصول، تبویبِ عناوین ومواضیع اور حسنِ ضبط وتسلسلِ بیان کے لحاظ سے بھی قدما مصنفین کو متاخرین پر ترجیح دی اور کہا کہ:

''تمام دنیا میں علوم وتمدّن کی ترویج وترقی کے ساتھ اقوامِ متمدّنہ کے علمی ذخیرے میں بھی نئی نئی خوبیاں پیدا ہوئی ہیں۔ مگر تاریخ اسلام کا حال اس لحاظ سے نہایت عجیب اور بالکل برعکس ہے۔ یہاں مذہب، علم، اخلاق اور سیاست سب کی خوبیاں قدما کے حصے میں آئیں اور جس قدر زمانہ گزرتا گیا ترقی کی جگہ ہر شے میں انحطاط ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ آج کل کے ترقی یافتہ فنِ تصنیف کے لحاظ سے بھی تمام خوبیاں قدمائے اہل اسلام ہی کے یہاں مل سکتی ہیں۔''

اسی سلسلے میں انھوں نے ایک نئی بات کہی جس پر ممکن ہے کہ عام طور پر تعجب کیا جائے۔ جب وہ سلسلۂ بیان میں فنِ تدوین علوم کے متعلق قدما کے حالات بیان کرنے لگے تو انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ:

''نہ صرف عظمت موضوع وتقدس مضمون کے لحاظ سے بلکہ طرز تصنیف وترتیب، ضبط مطالب اور حسن تقسیم وتنظیم کے لحاظ سے بھی تمام تاریخ اسلام میں بہترین کتاب ''صحیح بخاری'' لکھی گئی ہے اور کوئی اسلامی تصنیف اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ امام بخاری کے بعد بقیہ اصحاب صحاح و جامعین سنن ومعاجم ومسانید نے نئے نئے اُسلوب مطالب پیدا کیے مگر کوئی کتاب صحیح بخاری تک

نہ پہنچ سکی اور یہ میں محض فن حدیث کی قدیم خوش اعتقادیوں کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یقین کیجیے کہ اس فن تصنیف کو پیشِ نظر رکھ کے، جو ترقی یافتہ علمی زبانوں میں آج پایا جاتا ہے، میں نے علی وجہ البصیرت یہ راے قایم کی ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے مثالیں دے کر واضح کیا کہ اس تمام ذخیرے کا کیا حال ہے؟ متقدمین کی تصنیفات ناپید اور متاخرین کا ذخیرہ غیر مفید!

''پھر یہ حال بھی صرف موادِ تاریخ و واقعات کے لحاظ سے ہے۔ طرزِ تصنیف و ترتیب و تفحص جزئیات و علل کی راہیں تو تقریباً بالکل مسدود ہیں۔ آج کل کے مصنف کے فرایض پچھلے مصنفین سے بالکل مختلف ہوگئے ہیں، اور اس کا کام بہت مشکل ہے۔ اب محض سلسلۂ سنین و اعصار سے واقعات غیر مربوط و غیر معلل کو جمع کر دینا کسی مکمل تاریخ کا نام حاصل نہیں کر سکتا۔ فلسفۂ تاریخ کی وہ راہ جسے ابن خلدون نے پیدا کیا، مگر ہمیں اس پر نہ چلا سکا اور جسے اب یورپ نے اپنا طریقہ کار قرار دیا ہے، ہمارے سامنے ہے اور ہمیں اسی پر چلنا چاہیے۔ غور کیجیے کہ اس لحاظ سے موجودہ زمانے کے ایک مؤرخ کے کیا فرایض ہیں؟''

اس کے بعد انھوں نے ان فرایض کی تشریح کی اور پھر مثالیں دے کر بتلایا کہ:

''قدما کے غیر مکمل اور متاخرین کے غیر مفید ذخیرے سے ایک ایسی تاریخ کا مرتب کرنا کس قدر مشکل کام ہوگیا ہے۔ آج کل کی تاریخوں اور سیرتوں کے جو ضروری ابواب ہیں، ان میں سے ایک باب کے لیے بھی ہمیں مکمل ذخیرہ نہیں مل سکتا۔ یہ کمی اب صرف اجتہادِ فکر، سلامتی ذوق، اعتدالِ راے، قوتِ استدلال و استنباط اور بہت زیادہ وسعت مطالعہ و نظر ہی سے دور ہوسکتی ہے۔ ہماری بہت سی قیمتی معلومات ہیں جن کو کوئی باقاعدہ جگہ نہیں ملی ہے۔ مگر وہ کہیں نہ کہیں پریشان اور آوارہ گرد ضرور موجود ہیں۔ اس قدر وسیع نظر ہونی چاہیے کہ صدہا غیر متعلق کتابوں سے آپ اپنے موضوع کا مواد حاصل کرسکیں۔ بہت ممکن ہے کہ جو تاریخی واقعہ تاریخ ابن اثیر میں آپ کو ملنا چاہیے تھا، وہ خوارزمی کے کسی خط میں آپ کو مل جائے۔ اگرچہ وہ ادب کی کتاب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کسی اہم واقعے کی تفصیل کے لیے تمام تاریخوں کی ورق گردانی کر چکے ہوں اور ناکام رہے ہوں، لیکن وہ ایک کتاب حدیث کی شرح میں مل جائے، جہاں ضمناً اس کا کچھ تذکرہ آگیا ہے!

آپ ایک عمارت بنا رہے ہیں، مگر اس کا مصالحہ صدہا میلوں کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور ایسے ایسے گوشوں میں پوشیدہ ہے جن کا وہم وگمان بھی نہیں ہو سکتا۔ پس بہت ہی وسیع تلاش و تفحص کی ضرورت ہے اور صرف ایک فن ہی کی نہیں بلکہ واقفیت عامہ کی بھی! ارباب کار سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر مشکل کام ہے؟''

اسی سلسلے میں مطالعے کا ذکر آ گیا اور طالبانِ علم کے لیے نہایت مفید نکات انھوں نے بیان کیے۔ مثلاً انھوں نے کہا:

''محض کثرت مطالعہ ہی مفید نہیں ہے بلکہ اصلی چیز ''حسن مطالعہ'' اور ''قوتِ اخذ ونظر'' ہے۔ بہت سی کتابوں کو پڑھ کر بھی ایک شخص جاہل رہ سکتا ہے۔ جب اخذ مطالب وتفحصِ نوادر کی قوت دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہر کتاب کو اوّل سے لے کر آخر تک پڑھا جائے اور اس کے تمام کارآمد مطالب کے نوٹس لکھے جائیں۔ بڑے مصنفین نے کبھی بھی باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا۔ وہ ایک بڑی سے بڑی کتاب کو اٹھا لیتے ہیں اور محض ایک سرسری نظر ڈال کے اور اِدھر اُدھر سے دیکھ کے بہترین معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی نظروں کو کام کی باتوں سے کچھ ایسی مقناطیسیت ہو جاتی ہے کہ وہ جب صفحوں پر پڑتی ہیں تو صرف کام کی باتوں ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے بیکار اطراف کو اس طرح چھوڑ دیتی ہیں گویا ان کے غیر مفید ہونے کی نسبت وہ پہلے سے فیصلہ کر چکی ہیں۔ اس حقیقت کی صرف وہی لوگ تصدیق کر سکتے ہیں جن پر یہ فیضانِ علم کھل چکا ہے۔ کیوں کہ یہ بحث واستدلال کا مسئلہ نہیں ہے، زیادہ تر ذوق وکیفیت کا سوال ہے۔''

درمیان میں لیکچرر نے اور بہت سے نکاتِ مطالعہ اور فنِ تصنیف تالیف کے متعلق بیان کیے۔ پھر مولانا شبلی مرحوم کی بعض تصنیفات کو مثال کے لیے چن کر اپنے تمام گذشتہ بیانات کو منطبق کیا اور دکھلایا کہ انھوں نے اسلامی تاریخ کی تدوین وتہذیب کے ان مشکل ترین مراحل کو کہاں تک کامیابی کے ساتھ طے کیا اور پرانے مصالحے سے کیسی باقاعدہ اور منظّم عمارتیں کھڑی کیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے طریقِ استدلال، تعلیلِ واقعات، توجیہِ امور اور ترتیب وانطباقِ حوادث پر بھی بحث کی۔ پھر فرمایا کہ:

''مختلف فنون کے مطالعے کا ذکر آ گیا ہے اور میں بتلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے فقیدِ ملت کی ایک خصوصیت ''جامعیت ذوق'' بھی تھی۔''

انھوں نے کہا کہ:

''اس تعلیم یافتہ مجمع میں جو میرے سامنے ہے، یہ کہنا مزید تفصیل کا محتاج نہ ہوگا کہ ایک ہی وقت میں مختلف علوم کا مطالعہ اور ذوق پیدا کرنا ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہمیشہ اور ہر علمی عہد میں کم یاب رہی ہے۔علی الخصوص ایسی چیزوں کا ایک ہی وقت میں ذوق صحیح پیدا کرنا جو باہم متضاد سمجھی جاتی ہوں۔ ایک دماغ ایک ہی وقت میں فلسفے اور شاعری کا مطالعہ نہیں کرسکتا اور بہت مشکل ہے کہ ایک شخص تاریخ کے ساتھ ادب اور کلام کا بھی مطالعہ جاری رکھے۔ قدمائے اہل اسلام میں بھی جامعیت کی مثالیں زیادہ نہیں ملیں گی۔ حضرت امام غزالی کی احیاے علوم الدین جس درجے کی کتاب ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تصوف واخلاق، معارف شریعت اور علوم اسرار الدین میں حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ دہلوی) کو مستثنیٰ کردینے کے بعد اور کوئی کتاب اس کے سامنے نہیں لائی جاسکتی۔ مگر ساتھ ہی فن حدیث کے متعلق اس قدر بے احتیاط کتاب ہے کہ اکثر صوفیوں اور حکماے الٰہیین کے اقوال کو حدیث قرار دے دیا ہے اور اسرائیلیات سے تو اس کے متعدد ابواب مملو ہیں۔ چناں چہ امام حجۃ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کو کہنا پڑا کہ'' کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید، لاکن فیہ اربع مواد فاسدۃ، مادہ فلسفیہ و مادہ کلامیہ و مادۃ الاحادیث الموضوعۃ''......الخ، لیکن اس سے امام غزالی کے جلالت مرتبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ وہ متکلم، حکیم، فقیہ اور صوفی تھے نہ کہ محدث وناقد حدیث ولکل فن رجال!

لیکن مولانا شبلی مرحوم کو اگر ہم ایک ہی وقت کے اندر مختلف علوم کے مطالعے میں منہمک پاتے ہیں تو اس کی قدر شناسی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں متعدد زندگیوں کے کام انجام دیے۔ ان کی تصنیفات ان کے تعدد مذاق وتنوع مطالعہ کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں مؤرخ خلفا، مؤرخ ملوک، مؤرخ علوم اور پھر ادیب، انشا پرداز اور شاعر تھے۔ بارہا تم نے دیکھا ہوگا کہ تاریخ وکلام کی علمی صحبتوں سے اٹھ کر حسن وعشق کی شاعرانہ بزموں میں نغمہ طراز ہیں اور ادب وشعر کی مجلسیں ان کی دقیقہ سنجیوں سے رونق پارہی ہیں!'' (باقی آیندہ)

(البلاغ، کلکتہ: شمارہ ۴و۵، مورخہ ۱۷ر و ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۵ء، ص ۱۵-۱۳)

نوٹ:

افسوس کہ اس لیکچر کی دوسری قسط شایع نہیں ہوئی۔

(۱۰)

ابوالکلام اور علامہ شبلی

آخری دور

مولانا ابوالکلام آزاد کو حضرت علامہ شبلی سے عقیدت و نیاز کا جو تعلق تھا وہ ان کے علمی فضایل، ذہنی کمالات، خصایل طبع، فکری رجحانات، بلند افکار، نا قابلِ فراموش علمی، ادبی اور تاریخی کارناموں، ملت کی دردمندی، اخلاصِ خدمت اور پیشِ نظر اعلیٰ مقاصد ملّی و اسلامی کے مشاہدہ و علم اور تجربات کی بنا پر تھا۔ قومی، سیاسی اور تعلیمی مسایل میں دونوں کا اندازِ فکر یکساں تھا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی کا خیال تو یہ ہے کہ ابوالکلام نے قومی و سیاسی مسایل میں جو راہ اختیار کی تھی وہ حضرت شبلی کی صحبت کا فیضان تھا۔ سیّد صاحب لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۲ء میں انھوں نے الہلال نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں۔ لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمرہی جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے۔'' (حیات شبلی: ص ۴۴۵)

شبلی ابوالکلام کے تعلقات اور ان کے قرب وصحبت کے اثر و فیضان کے بارے میں حضرت سیّد صاحب کی رائے کی جو اہمیت ہے، اگر اس سے بالکل اسی طرح اتفاق نہ کیا جائے تب بھی اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علامہ شبلی کی صحبت نے ابوالکلام کے خیالات کو پختہ ضرور کر دیا تھا۔ اس لیے کہ ان کے اس اندازِ فکر اور کانگریس کی طرف ان کے رجحان کے اشارے الندوہ کے دور اور علامہ شبلی کی صحبتوں سے پہلے لسان الصدق کے زمانے میں ملتے ہیں۔ بہ ہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوالکلام نے حضرت شبلی کی صحبتوں سے بہت فیض اٹھایا تھا۔ لیکن اتحادِ اسلامی اور وطنی سیاست میں مولانا آزاد کا جو رجحان تھا وہ ان کا اپنا مستقل فکر اور رجحان تھا اور ان

کے اپنے غور وفکر کا نتیجہ تھا۔ان کا یہ فکر ورجحان کسی سے مستعار تھا اور نہ محض کسی کی صحبت کا فیضان تھا۔جس طرح حضرت علامہ شبلی نے غور وفکر کے بعد ایک صحیح فکر کا سراغ پا لیا تھا، اسی طرح ابوالکلام نے اپنی ذہانت اور مطالعہ ونظر کے بعد اس فکر تک رسائی پالی تھی۔اگر وہ اپنے گھر کی رسمی و روایتی زندگی اور مقلدانہ عقاید وایمان سے اپنے صحیح طرزِ فکر اور مطالعہ وتحقیق کے بعد بغاوت کر سکتے تھے تو کیا اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں وہ اپنی خداداد ذہانت اور مطالعہ ونظر سے صراط مستقیم معلوم نہیں کر سکتے تھے؟

اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا بیان زیادہ واضح ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا (آزاد) کی تحریر اور تحریک پر کوئی اور اثر ہے تو وہ شبلی ہی کا ہے۔شبلی اور مولانا دونوں لیگ کے مخالف اور اپنے وقت کی اصطلاح میں نیشنلسٹ تھے۔دونوں اسلام، ہیروز آف اسلام اور عالم اسلام اور اسلامیانِ عالم کا کلمہ جپتے تھے۔دونوں فارسی، اور عربی ادب کا یکساں بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، دونوں شاعر تھے، دونوں آرٹ کے دل دادہ تھے، موسیقی پر دم دیتے تھے اور جمالیات کا نکھرا ہوا ذوق رکھتے تھے۔پھر کوئی تعجب نہیں اگر شبلی سے کسی قدر قریب رہنے کے بعد، خاص کر الندوہ کی ادارت کے زمانے میں وہ شبلی کے طرزِ فکر اور طرزِ نگارش سے متاثر ہوئے ہوں۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد: رام پور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۱)

اجمال وتفصیل کے علاوہ دونوں بیانوں میں فرق صرف یہ ہے کہ حضرت سیّد صاحب حتمی فیصلہ سناتے ہیں، جب کہ ڈاکٹر بیدار صاحب امکان سے بعید نہیں سمجھتے۔ان کے اس جملے نے کہ ''پھر کوئی تعجب نہیں اگر شبلی سے'' ان کی رائے کو قابلِ قبول بنا دیا ہے۔میں اپنی بات میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ۱۹۰۵ء میں الندوہ میں شبلی کی صحبت ورفاقت سے پہلے شبلی اور ابوالکلام...... دونوں کے فکر کے نشوونما اور رائے کی تہذیب وتربیت کے ماحول الگ الگ تھے۔دوسری بات یہ کہ اگر ابوالکلام کا طرزِ فکر اور خیالات شبلی کی ملاقات سے پہلے یہ نہیں تھے تو یہ انقلابِ فکر پانچ چھ ماہ کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا۔اگر شبلی کی صحبت کا فیضان ہوتو ان سے زیادہ مدت تک شبلی کے قرب وصحبت سے فیض اٹھانے والے اور ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے

والے تو ''مولانا ابوالکلام'' سے زیادہ بڑے ابوالکلام بن جاتے۔ ابوالکلام نے ان صحبتوں سے یقیناً فیض اٹھایا ہوگا لیکن ان کی فضیلتیں خداداد تھیں۔

حضرت علامہ شبلی سے ابوالکلام کی عقیدت کسی وقتی اثر یا الندوہ کے دور کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں ہی کا نتیجہ نہ تھی۔ اسی لیے ان کی عقیدت اور نیازمندی میں استقرار ہے۔ انھوں نے الندوہ کی مجلس برخاست ہوجانے کے بعد بھی الندوہ سے تعلق رکھا اور ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے دارالعلوم کا مفاد بھی عزیز رکھا اور حضرت شبلی کے انتقال کے بعد بھی ان کی عقیدت ختم نہیں ہوگئی۔ ان کے علمی تذکروں سے اپنی مجالس علمی کو گرمایا اور پرسوز بنایا اور جب ان کی یاد آئی، حسرت ویاس کی اداسی دل پر اپنا داغ چھوڑ گئی۔ ابوالکلام نے اپنی زندگی کے ہر دور میں اور طرح طرح سے ان کی یاد اور ان کے ذکر کو دراز کیا۔

شبلی سے ابوالکلام کے تعارف کی داستان اور ۵۔۱۹۰۴ء میں شبلی سے ملاقات کی کہانی تو اس سلسلے کے پہلے مضمون ہی میں بیان کردی تھی۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۵ء تک الندوہ، ندوۃ العلماء، الہلال اور ندوہ کے بعض حوادث کے سلسلۂ بیان میں دونوں بزرگوں کے تعلقات کے استحکام کی تفصیلات لکھی گئیں۔ بعد کے دیگر معاملات اور ندوہ کے اصاغر واکابر سے مولانا کی دلچسپیاں اور تعلقات کا تذکرہ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے افادات میں سمٹ آیا ہے۔

مناسب ہوگا کہ ۱۹۱۵ء کے بعد کے حالات میں بھی علامہ شبلی کے تذکار پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۸۔۱۹۱۷ء میں جب مولانا رانچی میں نظربند تھے اور ''تذکرہ'' زیرِ تصنیف تھا تو ایک بار نہیں کئی بار ''تذکرہ'' میں علامہ شبلی کی سیرت وافکار کا ذکر آیا ہے۔ ایک بار ''قرآن اور سیرتِ محمدیہ'' کے سلسلۂ بحث میں ان کا ذکر آیا ہے کہ وہ کس طرح کسی معاملے کی ابتدا شک اور تردّد سے کرتے تھے اور پھر وہ جب تک یقین کے لیے مجبور نہ ہوجائیں، یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر ندوہ ہی کے معاملات کا حوالہ دیا ہے کہ

> ''ندوہ کے معاملات میں جو الجھاؤ لوگوں نے ڈالے، وہ ان کے اسی ضعفِ یقین وعدم جزم وصلابتِ ارادہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا......''

(تذکرہ: دہلی، ۱۹۶۸ء (پہلی بار)، ۵۔۲۰۴)

تذکرہ میں مولانا نے ۱۹۱۱ء کی کلکتہ کی ایک مجلس کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے ساتھ وقف علی الاولاد کے ایک وفد میں شریک علما کی ایک جماعت موجود تھی۔ان میں سے ایک عالم نے بہ قول مولانا آزاد کے:

''اسی لب و لہجے میں، جوان بزرگوں کے لیے مخصوص ہے، آج کل کے انگریزی خواں تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب سے بے خبری اور الحاد و بے قیدی کی شکایت کرنے لگے۔میں نے کہا:

یہ شکایت کم ازکم آپ لوگوں کی زبانی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔میرے خیال میں تو آپ اور وہ...... دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب و مسلک کے دو مختلف مظاہر ہیں۔زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی قدامت و روایت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو آپ کا چھوٹا بھائی کہا جائے! آپ یونانیوں کے حلقہ بگوش، وہ یورپ کے پرستار! قرآن وسنت سے آپ بھی دور و مہجور، وہ بھی بے خبر و نفور:

محتسب داند کہ حافظ مے خورد
واصفِ ملک سلیماں نیز ہم!''

(ایضاً،ص ۲۳۲)

یہ ایک دل چسپ بحث ہے جو مزید ایک صفحے تک پھیلتی چلی گئی ہے۔تذکرہ ہی میں ایک مقام پر مفروضہ و غیر وقوع حوادث کے بارے میں فتویٰ نویسی میں اسلاف کرام کے رویے کی بحث میں علامہ شبلی کا نہایت لطیف انداز میں ایراد بھی کیا ہے۔فرماتے ہیں:

''امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قاعدہ تھا جب کبھی کسی مسئلے کی نسبت سوال کیا جاتا تو دریافت فرماتے، کیا یہ صورت پیش آئی ہے؟ اگر سایل کہتا، ہاں! تو جواب دیتے،نہیں تو خاموش رہتے۔حضرت شیخ اکبر نے ''فتوحات'' میں کیا خوب فرمایا ہے، **فان فیه تلمیح الی ان من افتی فی الحوادث الفرضیه قبل وقوعها فلادین ولا علم** اور یہی وجہ ہے کہ بہ صورت صحتِ واقعہ **مناظرہ درمیان امام ابو حنیفه وقتاوہ مصری رضی الله عنهما منقوله عقود الجمان و خطیب ۔)** جب حضرت امام نے زوج مفقود الخبر

کے متعلق سوال کیا تو قتادہ نے پوچھا، کیا یہ صورت پیش آئی ہے؟ اگر نہیں آئی ہے تو فرضی صورتوں میں سوال و جواب بدعت ہے! اسی طرح مباحثۂ حضرت قاضی ابو یوسف و قاضی یحییٰ بن سعید انصاری نسبت غلام مشترک میں قاضی یحییٰ نے فرضی صورتوں میں بحث و تعمق سے انکار کر دیا۔ ان بزرگوں کا انکار ان کے کمالِ علم و حکمت و فہم اسرارِ شریعت و غوامضِ بدایت امم و اجتماع کا نتیجہ تھا۔ ظاہر پرستانہ بے خبری و بے عقلی یا بہ الفاظ صریح بے وقوفی نہ تھی جیسا کہ بہت سے لوگوں نے سمجھا! اور جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سیرۃ النعمان'' میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(ایضاً، ص ۲۴۲)

یہ دلایل و امثال سے مرتب اور لطفِ بیان و اُسلوب تحریر سے مزین ایک دل چسپ بحث ہے جو کئی صفحات پیچھے چھڑی تھی اور آگے تک دراز ہوتی چلی گئی ہے۔

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام کو رانچی کی نظر بندی سے رہائی ملی۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریکِ خلافت کا آغاز ہو چکا تھا اور ترک موالات کا چولھا دہکنا شروع ہوا تھا۔ آیندہ کے دو سال مولانا کو خود اپنے سر پیر کی خبر نہ تھی۔ اس زمانے میں وہ ایک دن کے لیے نہ اطمینان سے بیٹھ سکے نہ تصنیف و تالیف کا کوئی سر و سامان ہوا تھا۔ تا آں کہ وہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار ہو گئے اور پورے ایک سال ستائیس دن کے لیے کلکتہ کی پریسیڈنسی جیل علی پور میں محبوس کر دیے گئے۔ علی پور جیل کی یادگار ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' بہ روایت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہے، یا وہ چند تحریرات ''جو ذکر آزاد'' مؤلفہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی میں شامل ہیں۔ ''آزاد کی کہانی......'' شبلی مرحوم سے مولانا آزاد کے تعارف اور ابتدائی تعلقات کی تاریخ و تفصیل کا بڑا ماخذ ہے جس کا ذکر سلسلے کے پہلے ہی مضمون میں گزر چکا ہے۔ قیام ربط اور خلا کو پر کرنے کے لیے صرف ایک حوالہ دینا چاہوں گا۔ اتفاق سے یہ مکمل حوالہ ابتدائی مضمون میں درج ہونے سے رہ بھی گیا ہے۔

مولانا شبلی سے عقیدت:

۱۹۲۲ء میں جب مولانا آزاد کلکتہ کی پریسیڈنسی جیل علی پور میں قید تھے تو لکھنؤ میں حضرت علامہ شبلی کے ساتھ گزری ہوئی صحبتوں کو بڑی حسرت سے یاد کیا اور اعتراف کیا کہ انھیں ان صحبتوں سے بہت فایدہ پہنچا۔ ''مولانا شبلی سے عقیدت'' کے زیرعنوان فرماتے ہیں:

''ہر وقت مولانا مرحوم سے یک جائی رہتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے سے اٹھنے کے عادی اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر! جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ اسی وقت چائے کا دور چلتا۔ طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ اکثر فارسی اشعار کا اپنے خاص ٹون میں ترنم کرتے، ان اشعار کے متعلق تذکرے رہتے، شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی و ادبی تذکروں میں بسر ہوتا۔ حقیقتاً وہ ایسی صحبتیں تھیں جن کا لطف و کیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی۔ مجھے ان صحبتوں سے بہت فایدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ مدفون ہوگئے، وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پرلطف صحبت تھی جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ ان کا علمی ذوق جو وسیع اور ہر وادی میں تھا، ایک ساتھ ہی مدفون ہو چکا ہے۔''

(آزاد کی کہانی......ص ۱۵-۳۱۴)

مولانا شبلی کا ذوقِ لطیف:

علی پور جیل کی یادوں ہی کے سلسلے میں مولانا ملیح آبادی نے علامہ شبلی مرحوم سے متعلق مولانا آزاد کا ایک بیان ''ذکر آزاد'' میں نقل کیا ہے، جس سے حضرت شبلی کے ذوق لطیف اور سرود و نغمہ سے ان کی دل چسپی کا پتا چلتا ہے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

''جیل میں ایک دن مولانا نے مرحوم علامہ شبلی نعمانی کے متعلق ایک دل چسپ لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے، مولانا شبلی نہایت زندہ دل، صاحب ذوق آدمی

تھے۔ حسن پرست بھی تھے اور موسیقی وغیرہ فنون لطیفہ سے گہری دل چسپی رکھتے تھے، مگر مولوی تھے، عام رائے سے ڈرتے تھے اور بڑی احتیاط سے اپنا ذوق پورا کرتے تھے۔

ایک دفعہ موصوف دہلی میں حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے کہ خواجہ حسن نظامی ملنے آئے اور کہنے لگے، ''آج میرے ہاں قوالی ہے۔ دہلی کی مشہور طوائف...... (میں نام بھول گیا ہوں) گائے گی۔ محفل بالکل خاص ہے۔ میرے اور آپ کے سوا وہاں کوئی نہ ہوگا۔

مولانا شبلی نے دعوت قبول کرلی۔ کشمیری شال اوڑھی، وضع بدلی، بند گاڑی میں بیٹھے اور خواجہ صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ واقعی کوئی تیسرا آدمی مدعو نہ تھا۔ قوالی شروع ہوئی اور مولانا نے اپنے آپ کو محتسبوں سے محفوظ پاکر ضرورت سے زیادہ آزادی سے کام لیا۔ دل کھول کے گانے کی اور گانے والی کی تعریف کی۔ طوائف سے ہنستے بھی رہے اور اسے چھیڑتے بھی رہے۔

طوائف کا طبلچی ایک لحیم شحیم سن رسیدہ آدمی تھا۔ سر پر پٹے تھے اور منہ پر چوکور بڑی سی ڈاڑھی تھی۔ پٹے اور ڈاڑھی خضاب سے بھونرا ہو رہے تھے۔ محفل جب برخواست ہونے لگی تو دونوں ہاتھ بڑھائے ہوئے مولانا کی طرف لپکا اور بڑے جوش سے مولانا کے ہاتھ پکڑ لیے، چومے، آنکھوں سے لگائے اور جوش سے کہنے لگا، کس منہ سے خدا کا شکر ادا کروں کہ عمر بھر کی آرزو آج پوری ہوگئی۔ مولانا سبحان اللہ، ماشاءاللہ! آپ نے الفاروق لکھ کر وہ کام کیا ہے جو نہ کسی سے ہوا ہے، نہ ہوسکے گا۔ بخدا آپ نے قلم توڑ دیا ہے! بندے کی کتنی تمنا تھی کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہو، تو آج بائی جی اور خواجہ صاحب کی بدولت یہ سعادت اس گناہ گار کو نصیب ہوگئی!''

مولانا نے فرمایا:

''علامہ شبلی بڑے ذکی الحس تھے۔ اس غیر متوقع واقعے نے ان کی ساری خوشی کرکری کر دی، شرم سے عرق عرق ہوگئے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ طبلچی کو کیا

جواب دیں، کس طرح محفل سے غائب ہو جائیں؟ بے جان بت کی طرح بیٹھے رہ گئے۔ خواجہ صاحب نے موقعے کی نزاکت محسوس کی اور طایفے کو فوراً رخصت کر دیا۔ مگر علامہ کو سخت ذہنی صدمہ پہنچ چکا تھا۔ ہفتوں شگفتہ نہ ہو سکے۔"

مولانا نے فرمایا:

"یہ واقعہ خود علامہ شبلی نے ان سے بیان کیا تھا۔ بیان کرتے وقت بھی متاثر تھے اور بار بار کہتے تھے، کاش! "الفاروق" میرے قلم سے نہ نکلی ہوتی اور نکلی تھی تو اسے پڑھنے والا طبلچی اس قوالی سے پہلے ہی ناپید ہو چکا ہوتا۔ یہ نہیں تو مجھے موت آ گئی ہوتی کہ اس ذلت سے بچ جاتا۔" (ذکرِ آزاد: کلکتہ، ۱۹۶۰ء، ص ۱۹-۲۱۷)

جزیے کی نہایت قیمتی تحقیقات:

۳۶- ۱۹۳۵ء میں جب ترجمان القرآن کی دوسری جلد مولانا کے زیرِ قلم تھی تو تفسیر سورۂ کہف میں "جزیہ" کی بحث میں انھوں نے علامہ شبلی کی اسلامی تحقیق کی تحسین کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

خود "جزیہ" کا لفظ بھی ایران کی پیداوار ہے، یعنی لفظ گزیت سے معرب ہوا ہے۔ اس بارے میں مولانا شبلی نعمانی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ زمانۂ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے۔"

(ترجمان القرآن (جلد سوم): دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۸۹۳)

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی:

ندوۃ العلماء کے بزرگوں میں سب سے آخر میں حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رہ گئے تھے، جن سے گزشتہ صحبتوں کی یادیں تازہ تھیں۔ حضرت صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات الندوہ سے ادارتی تعلق کے زمانے میں ہوئی تھی۔ حضرت شروانی اور علامہ شبلی الندوہ کے مدیر تھے اور مولانا آزاد ان کے نائب مدیر بنائے گئے تھے۔ چھ ماہ گزرے تھے کہ مولانا نے وکیل امرتسر کی ادارت قبول کر لی، لیکن الندوہ سے ترک تعلق کا اثر ان دونوں بزرگوں سے روابط پر نہیں پڑا۔ تعلقات نہ صرف قایم رہے بلکہ اور زیادہ پختہ ہو گئے۔

حضرت شروانی سے رفتہ رفتہ تعلقات اتنے قریبی ہوگئے کہ بعض حضرات کو، جو ان سے اسی وقت سے دوستی کا رشتہ رکھتے تھے، رشک پیدا ہوگیا اور یہ جذبہ دل ہی میں پنہاں نہ رہا بلکہ زبانِ قلم پر آیا اور صفحۂ کاغذ پر اپنا دائمی نقش چھوڑ گیا۔

حضرت صدر یار جنگ کا ادبی و شعری ذوق بہت پختہ اور علمی پایہ بہت بلند تھا۔ وہ اُردو اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ علامہ شبلی ان کی فارسی شاعری کے دل دادہ اور ابوالکلام پرستار تھے۔ وہ خصایص علم وتہذیب کی ایک جامع شخصیت، محامد اخلاق اور محاسن سیرت سے مزین، پروقار اور متدین بزرگ تھے۔ ادب وتہذیب میں وہ اپنے دور میں مثال تھے۔ کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ وہ مروّت کا پیکر اور وضع داری کا مجسمہ تھے۔ سیاست سے انھوں نے کبھی تعلق نہ رکھا تھا لیکن ملی خدمات میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ بیسیوں دینی وملی ادارے ان کے ایثار کے رہین منت تھے۔ علی گڑھ کالج اور یونی ورسٹی تو گویا ان کا اپنا ادارہ تھا۔ ندوۃ العلماء کے سرپرست اور دارالعلوم دیوبند کی امداد میں ہمیشہ کشادہ دست رہے۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے اوّلین مددگاروں میں تھے۔

ابوالکلام آزاد سے ان کا پہلا برتاؤ شفقت کا تھا۔ بعد میں وہ ان کے ہم نشیں، دوست اور قابل فخر صدیق مکرم بن گئے۔ دونوں میں مشرقی تہذیب، وضع داری اور ذوق علمی وادبی قدر مشترک تھا۔ تعلقات کا آغاز ۱۹۰۵ء میں ہوگیا تھا۔ لیکن مراسلت کے سلسلے کا پتا تقریباً ۱۹۴۰ء سے ملتا ہے۔ یہ مراسلت اُردو ادب کا یادگار سرمایہ ہے۔ آیئے کہ اس یادگار اور قیمتی سرمایے کے مطالعے سے گذشتہ صحبتوں کی یاد تازہ کریں۔ علامہ شبلی مرحوم ان یادوں کی جان ہیں۔ صدیق مکرم حضرت نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲؍ ستمبر ۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''آج الماریوں میں ایک کتاب ڈھونڈھ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک مجلّد پر نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو ارشاد الکملاء وغیرہ ندوہ کے بعض رسایل کا مجموعہ تھا۔ اس مجموعے کو دیکھتے ہی ذہن ندوے کی صحبتوں کی طرف منتقل ہوا اور پھر اچانک آپ یاد آگئے۔

قاصدے کو کہ فرستم بہ تو پیغامے چند

بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملاقات ہوتی، افکارِ زمانہ اور کاوش ہائے روزگار سے الگ ہوکر دو گھڑی بیٹھتے اور پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرتے، جام و مینا کا دور نہ سہی، چائے کے پیالہ ہائے پیہم کیا کم ہیں:

زخیل درد کشاں غیر ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

مڑ کے دیکھتا ہوں تو گزری ہوئی صحبتیں ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں اور کچھ دیر کے لیے ایک بالکل دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔ آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی، جب الندوہ کی ایڈیٹری کے سلسلے میں وہاں مقیم تھا۔ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ پورے پینتیس برس ہوگئے۔ اس وقت یاد آرہا ہے کہ آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے۔ اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی۔ دہلی کا جلسۂ ندوہ آپ کو یاد ہے؟ غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہوگی۔ (۱) مرحوم مولانا شبلی، آپ اور میں، مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے تھے اور شب و روز صحبتیں رہتی تھیں۔ امین آباد لکھنؤ میں مولانا مرحوم کا بالا خانہ اور لیگ کے جلسے کے موقع پر وہاں قیام، یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے۔ اٹھائیس برس ہوگئے۔ اس وقت سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ لبثنا یوماً او بعض یوم (سورۃ الکہف: ۱۹) لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحٰھا (سورۃ النازعات: ۴۶) کا شاید یہی مطلب ہے۔ ۱۹۱۴ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرا تھا۔ آپ بھی دہلی آئے اور پانی پت کا بہ اتفاق سفر کیا۔ اس سفر کی صحبتوں کی ایک ایک بات اس وقت صفحۂ دماغ پر ابھر رہی ہے۔"

اس کے بعد کس حسرت افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

"افسوس جتنے ہم نفس تھے، ایک ایک کر کے سب رخصت ہوگئے۔ وہ صحبتیں خواب و خیال ہوگئیں، اب برسوں گزر جاتے ہیں، ایک تنفس بھی میسر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوقِ طبیعت کی چار باتیں کرلوں، اب نہ زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمل ہے، نہ ہم زمانے کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں:

کان لم یکن بین الحجون الی الصفاء
انیس و لم یسمر بمکة سامرا

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، چاے پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں:

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم
بعد منزل نہ بود در سفر روحانی!"

اور اس درازنفسی کا مقصد ہی یہ بتاتے ہیں:

"یہ ساری درازنفسی اس لیے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آپ یاد آ گئے، ملاقات میسر نہیں ہے تو دل کی آرزومندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں:

درهیچ نسخه معنی لفظ امید نیست
فرهنگ نامه هائے تمنا نوشته ایم"

(کاروان خیال: بجنور، ص ۶۲۔۵۹)

اس کے بعد ۲۶/اکتوبر ۱۹۴۰ء کے خط میں پھر شبلی کا ذکر نکل آیا۔ لکھتے ہیں:

"آپ کی غزل پر علامہ شبلی کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہے(۲) جو اس عہد میں مل سکتی تھی۔ یہ شعر کتنا رواں اور ڈھلا ہوا نکلا ہے:

حدیث دوست بگوشم رسد ز پردۂ دل
حکایتِ نے وصوتِ رباب را چہ کنم

اور نقاب کے قافیے میں تو واقعی ردیف چیخ اٹھی ہے:

اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

علامہ مرحوم کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا:

ولیس للہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

خواجہ حالی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے اِک انجمن ہیں!

(کاروانِ خیال،ص۹۲)

یہ بات تو انھوں نے حضرت علامہ شبلی کے حوالے سے شروع کی تھی۔ اس کے بعد وہ براہِ راست مولانا شبلی کے تذکرے پر آگئے۔ فرماتے ہیں:

''فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، سرتا سر مغز بے پوست تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بہ دل نہ ہوتی ہو، وہ کیا گئے علم و فن کی صحبتوں کا سرتا سر خاتمہ ہو گیا۔''

درمیان میں ان کی سحر خیزی کی یاد آگئی۔ چونکہ وہ خود بھی بچپن سے اس کے عادی تھے، اس لیے ہم ذوقی کے ذکر میں ان کے لیے دوگونہ لذت تھی۔ اس کے ساتھ ہی علامہ شبلی کے ذوق و مزاج اور ذہن و طبع کی بعض خوبیوں کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔ والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔ اس اشتراکِ عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا کر دیا تھا۔ جب کبھی یک جائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف و کیفیت کا وقت ہوتا۔ چاے کا دور چلتا اور علم و فن اور شعر و ادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے۔ اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طلب علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکی طبع، جو اس راہ کے مہالک و آفات میں سے ہے، انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔''

(کاروانِ خیال،ص۹۳)

یہ ذکر ختم ہوا تھا کہ ان کی شاعری کی طرف ذہن پلٹ گیا۔ اور شبلی کی شاعری پر اتنا عمدہ تبصرہ ہو گیا کہ کیا کسی نے کیا ہوگا! مطالب کی معنویت اپنی جگہ، خود تبصرے کی زبان کی سلاست اور روانی اور بیان کی شگفتگی اور دلآویزی الگ ہے۔ یہ ایک شاعر کے کلام پر تبصرہ نہیں، برِّاعظم ہند پاکستان کے ایک فارسی شاعر کی دریافت ہے، غزل کے آخری فارسی شاعر کی دریافت! مولانا فرماتے ہیں:

''شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان کے حصے میں آیا تھا اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہوئی۔ کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے تو ان کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ ہے تغزل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے، لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کیے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں۔ خصوصاً حیدرآباد والی نظم! اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اُسلوبِ شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔

اس معاملے کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں جن کی ترتیب واشاعت میں غریب براؤن نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں، خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔

غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرجوشی و کیفیت ہے اور حقایق و واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے۔ مولانا کا ایک شعر سیکڑوں مرتبہ دہرا چکا ہوں، لیکن پھر بے اختیار دل کی گہرائیوں میں سے ابھر آتا ہے۔

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیبے است سالک را
خجل ہستم زکفر خود کہ دارد بوے ایماں ہم

میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے، کیوں کہ اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے، جب تک وہ طاری نہ ہو، اس طرح کی صدا اٹھ نہیں سکتی۔ خواجہ حالی مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس شعر پر گھنٹوں مجھے خود فراموشی رہی۔''

(ایضاً: ص ۹۵-۹۳)

اس داستانِ حسن و عشق کا اختتام بھی کتنا حسرت انگیز اور افسردہ کر دینے والا ہے۔

ابوالکلام لکھتے ہیں:

"افسوس! اب وہ وقت آ گیا کہ ان تذکروں کے لیے بھی کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ کہاں جایئے اور کس سے باتیں کیجیے، جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہو گئے۔ ہاں الحمدللہ ایک آپ کی ذات گرامی باقی ہے، لیکن یک جائی میسر نہیں:

سراغ یک نگاہِ آشنا درکس نمی یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کو رمی ماند

بدایونی نے ایک رباعی لکھی ہے، معلوم نہیں کس کی ہے! اکثر زبان پر جاری ہو جاتی ہے:

افسوس کہ یاراں ہمہ ازدست شدند
در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب درمجلسِ عمر
یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

اب تھک گیا ہوں اور تکیے پر سر رکھتا ہوں۔" (کاروانِ خیال: ص۹۶۔۹۰)

حضرت نواب صاحب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (ولادت ۵/جنوری ۱۸۶۷ء) اس دور میں جب کہ ان کی عمر ۷۳ برس سے زیادہ ہو چکی تھی، ایک حد تک گوشہ نشین ہو چکے تھے، زندگی کا کوئی شوق باقی نہ رہا تھا۔ زندگی کے معمولات عبادت، اور وظائف اور مطالعۂ کتب تک محدود ہو گئے تھے، مجلس آرائیاں اور علمی صحبتیں معدوم تھیں، کوئی ہم ذوق و آشنا نہ تھا۔ پچھلی صحبتوں کو یاد کرتے اور ہر دم دم سرد بھرتے تھے کہ ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے، لیکن کوئی حاتم نہ ملتا تھا کہ گزرے ہوئے دنوں اور ان کی صحبتوں میں لے جائے اور کوئی ہم ذوق و آشنا ایسا نہ تھا جس کے ساتھ دو گھڑی بیٹھ کر ایام گذشتہ کی یاد تازہ کر لی جائے۔ عبادت اور اوراد و وظائف سے جو وقت ملتا تھا، وہ مطالعۂ کتب میں گزرتا تھا۔

ابوالکلام سے ہم ذوقی و مزاج آشنائی کا رشتہ تھا۔ وہ کبھی کوئی تذکرہ چھیڑ دیتے تو پھر اسی محبت زار ذوق و تہذیب میں پہنچ جاتے جو کبھی مایۂ تسکین جاں اور موجب راحت قلب تھا۔ گزری ہوئی صحبتوں کی یاد میں وقت کے کچھ لمحے گزر جاتے۔ کبھی وہ خود بھی ابوالکلام کو مخاطب کر کے گزری ہوئی صحبتوں کا کوئی ذکر چھیڑ دیتے۔ وہ خود بھی اسی ذوق سے سرشار تھے۔ اسی ذوق و

تہذیب کے دل دادہ، شبلی کے کمال آشنا، ان کی فضیلتوں کے معترف، ان کے قدرداں، ان کے ہم ذوق، ان کی محبت کے اسیر، ان کے ساتھ گزری صحبتوں کو یاد کرنے والے اور انھی کی یاد میں قلب کا سکون ڈھونڈھنے والے تھے۔ بعض اوقات ان تذکار کا سامان خود ہی فراہم کرتے تھے۔ ان میں کسی نہ کسی پہلو سے حضرت شبلی کا ذکر آہی جاتا تھا۔ کاروانِ خیال (مجموعۂ خطوط حضرت شروانی و آزاد) میں حضرت شروانی مرحوم کے جو مکاتیب سامی شامل ہیں ان میں اسی ذوق کی خوش بو بسی ہوئی ہے اور اکثر وہی گذشتہ صحبتوں کے تذکار کا موجب ہوئے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں ایک مکتوب گرامی کا حوالہ آچکا ہے۔ حضرت مرحوم کی ایک اور تحریر کے لطفِ مطالعہ میں قارئین کرام کو شریک کرلینا چاہتا ہوں۔ یہ مکتوب سامی ابوالکلام کے ۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء کے خط کے جواب میں ہے۔ حضرت مکتوب نگار کے قلم زریں رقم سے اس پر تاریخ کا داغ نظر نہیں آیا۔ اس لیے کہ یہ حکایتِ لطیف اپنے بیان کے لطف واثر کے لیے کسی خاص موسم یا ''فصلِ گل ولالہ'' کی محتاج نہیں۔ حضرت شروانی فرماتے ہیں:

> ''آپ نے جتنے واقعے یاد کیے ہیں، یاد دلائے ہیں، سب کی مدت دھائیوں سے زیادہ ہے۔ مگر خط پڑھنے میں دل ان کی گرمی اس طرح محسوس کرتا ہے، گویا اسی صحبت میں ہے۔ بات میں بات دلی کے جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یاد شوق میں تازہ ہے۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ، گویا دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں، حال آں کہ تیس برس گزر گئے۔ (۳) سیّد رشید رضا کی تقریر کا اُردو ترجمہ آپ سنا رہے ہیں، کان سن رہے ہیں۔ اسی مثال سے متاثر ہوکر میں نے اسٹریچی ہال میں (ان کی) عربی کی اُردو کردی تھی۔ (۴)
> مولانا شبلی پر خدا کی رحمت! اب ان کی یاد جان آفریں ہے۔ دارالمصنفین میں تو گویا تجدید بیعت ہوجاتی تھی:
>
> دماغِ دل دریں جا گاہ گاہے چاق می گردد
> خدا آباد تر سازد خراباتِ محبت را!
>
> جس زمانے میں آگرہ میں پڑھتا تھا، نصف صدی گزر چکی ہے۔ فیضی کی ایک غزل پڑھی تھی۔ اس کا ایک شعر اب تک دردِ دل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی بار

اور کتنے موقعوں پر تسلی بخش ہوا ہے:

اے ہم نفسانِ صحبتِ ما
رفتید و لے نہ از دلِ ما!

مجلس احباب دل میں گرم ہے۔ دل میں اس کی گرمی ہے:

زچشم تو مستم شرابِ راچہ کنم
زتابِ حسن تو سوزم کباب راچہ کنم

دیکھیے اس ہفتے میں مولانا (شبلی) کی یاد کس کس طرح تازہ ہوئی، آپ کے الطاف نامے سے، مولوی سیّد سلیمان کے خط سے، ایک جلد سوانح شبلی کی ختم ہوئی۔ ایک نادر نسخہ رباعیاتِ سحابی نجفی کا ہاتھ آیا، مولانا (شبلی) کا نسخہ یاد آیا۔ ندوہ سے اس کی بابت خط وکتابت کی۔"

(کاروانِ خیال: ترتیب وتقدیم عبدالشاہد خاں شروانی، بجنور، مدینہ پریس، ۱۹۴۶ء، ص ۶۶۔۶۴)

اب غبارِ خاطر کا صرف ایک حوالہ درج کرنے سے رہ گیا۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ غبارِ خاطر میں حضرت علامہ شبلی کا کوئی ذکر یا ان کے کسی شعر کا حوالہ نہیں آیا۔ لیکن سوچا کہ ایک نظر ڈال لینے میں کیا حرج ہے؟ تلاش کیا تو پتا چلا کہ مکتوب نگار نے علامہ مرحوم کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ یہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۲ء کا خط ہے۔ اس میں شکر کے مسئلے نے سر اٹھایا ہے۔ اسی خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کے گڑ کھانے کے شوق اور مولانا آزاد کے استعمال میں آنے والی قند کی لذت سے عدم آشنائی کا ذکر آیا ہے۔ یہ مولانا کا بہت دل چسپ خط ہے۔ مختلف اقوام وممالک میں چاے بنانے کی تراکیب، چاے میں دودھ کے استعمال کی بدذوقی اور گڑ کی غلظت اور مصری کی نظافت ولذت کا ذکر بھی آیا ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا کے شیرینی کے عدم ذوق کا تذکرہ بھی ہے اور اصحابِ قصص و مواعظ کی ایک خانہ ساز روایت پر بحث میں ایک عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس حدیث کے تذکرے نے (۵) یارانِ قصص ومواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاددلادی کہ **الایمان حلو و المومن یحب الحلوی**(۶) لیکن اگر مدارج ایمانی کے حصول اور مراتب ایقانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا تو نہیں معلوم، اُن تہی دستانِ نقدِ حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے، جن کی محبتِ حلاوت کی ساری پونجی

چائے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی، اور ان میں بھی کم شکر پڑی ہوئی اور پھر اس کم شکر پر بھی تاسّف کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ ہا! مولانا شبلی مرحوم کا بہترین شعر یاد آ گیا:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم زکفرِ خود کہ دارد بوے ایماں ہم!

(غبار خاطر: دہلی، ۱۹۶۷ء (پہلی بار)، ص ۱۵۶)

حواشی

۱۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ (ا۔س۔ش)

۲۔ حضرت نواب صاحب نے اپنے پچھلے مکتوب میں اپنی ایک غزل کا ذکر لطیف فرمایا تھا جو انھوں نے خواجہ آصفی کی ایک غزل کی طرح میں کہی تھی اور علامہ شبلی کے ملاحظے میں بھیجی تھی۔ حضرت شبلی نے خدا کو گواہ کر کے کہا کہ غزل کی غزل مرصع ہے اور اس شعر کے بارے میں تو فرمایا کہ دل میں رکھ لینے کا ہے:

نہ کردہ جلوہ بتِ شوخ و باختم دل و دیں
اگر براَفگند از رخ نقاب راچہ کنم

یہ اظہار حضرت نواب صاحب نے مولانا ابوالکلام کے نام اپنے مکتوب میں کیا تھا اور اس غزل کے چند شعر بھی نقل کیے تھے۔ مولانا ابوالکلام نے بھی اس کی تعریف کی کہ کلام کے حسن اور خیال کی بلندی اور زبان کی لطافت کا تقاضا تھا۔ مولانا کا اشارہ اسی طرف ہے۔ حضرت نواب صاحب نے مکتوب بنام ابوالکلام میں تحریر فرمایا تھا:

''آپ کی دجلہ کی مواجی اور شب ماہ کی تابش یاد آئی۔ مجھ کو خود اپنی طبیعت کی مواجی اور تلاطم نے بے تاب کر دیا۔ کیا کہوں کیا عالم تھا اور کس کے اثر سے تھا؟ اجمالاً اس عالم کی شرح نگار ایک غزل ہے جو اسی کیفیت میں موزوں ہوئی تھی:

زجام لعلِ تو مستم شراب راچہ کنم
خوشم بہ سوزِ دلِ خود کباب راچہ کنم

یہ مطلع خواجہ آصفی کا ہے۔ اسی طرح پر میں نے غزل عرض کی تھی:

زچشم مست تو مستم شراب راچہ کنم
زتابِ حسن تو سوزم کباب راچہ کنم
حدیثِ دوست بہ گوشم رسد ز پردۂ دل
حکایت نے وصوتِ رباب راچہ کنم
نہ کردہ جلوہ بتِ شوخ و باختم دل و دیں
اگر برافگند از رخ نقاب راچہ کنم

حسب عادت غزل علامہ شبلی مرحوم کے ملاحظے میں پیش کی گئی۔ حیدرآباد سے ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو تحریر فرمایا، خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے ''اگر براگفند از رخ......''
دیکھیے ۳۲ اور ۴۰ برس کے گزرے ہوئے دو واقعے کس طرح متصادِ ہو گئے! یہ خلوصِ ذوق کا کرشمہ ہے۔
آپ کو بہت سے اہل کمال یاد آئے تھے، مجھ کو ایک علامہ کی یاد نے محوِ ذوق بنادیا:

ولیس للہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

''رحمت باد بر شبلی و نعمت بر آزاد''

(کاروانِ خیال: مکتوب بنام آزاد، مورخہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۰ء، ص ۸۵-۸۳)

۳۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوے کا سالانہ جلسہ دہلی میں تھا۔ اس کی روداد ابوالکلام کے قلم سے یادگار ہے اور الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء میں چھپی ہے۔ اس میں انھوں نے دوسروں کی تقریروں اور ان کے خیالات کا حوالہ دیا ہے، اپنی تقریر کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت شروانی کے حافظے میں اس کی یاد تھی۔ انھوں نے ایک تاریخی واقعہ ہی یاد نہیں دلایا، اس کی پوری منظر کشی کردی۔ حضرت سیّد صاحب نے بھی مولانا کی پُر زور تقریر کی یاد دلائی ہے۔ فرماتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام نے بھی اس اجلاس میں بہت پرزور تقریر کی تھی، جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک ہے۔'' (حیاتِ شبلی: ص ۴۹۹)

۴۔ ۱۹۱۲ء میں علامہ رشید رضا مصری ندوے کے سالانہ جلسہ لکھنؤ کے صدر تھے۔ ابوالکلام نے ان کی تقریر کا اُردو ترجمہ کیا تھا۔ اسی سفر کے موقع پر علامہ رشید رضا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ تشریف لائے تھے اور اس کے اساتذہ و طلبہ سے خطاب کیا تھا۔ اس خطاب کا اُردو ترجمہ کر کے حضرت شروانی نے علامہ موصوف کی عزت افزائی کی تھی۔

۵۔ اخی یوسف اصبح و انا املح منہ کی طرف اشارہ ہے۔ مالک رام کی تحقیق کے مطابق یہ حدیث کسی معتبر مجموعۂ حدیث میں نہیں ملی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین''، میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ اس موضوع کا یہ ترجمہ غبار خاطر کے حاشیے میں ہے، یعنی ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے وہ مٹھاس کو محبوب رکھے گا۔

الندوہ

نمبر ۱۱	ماہ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۰۶ء	جلد ۲

مجلس ندوۃ العلما کا ماہوار علمی رسالہ

جس کا مقصد

علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول، اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہی

مرتبہ

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی و مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی

فہرست مضامین

باہتمام قاری عبد الولی خلف علامہ آسی مولوی عبد العلی صاحب مدراسی

آسی پریس لکھنؤ میں بکمال حسن و خوبی طبع ہو کر

دفتر ندوۃ العلما لکھنؤ سے شائع ہوا

دستور العمل

(۱) یہ رسالہ ہر عربی مہینے کے پہلے ہفتے مین شائع کیا جائے گا۔

(۲) اس رسالہ کی ضخامت معمولاً ۴۰ صفحے ہوگی۔

(۳) اس رسالہ کا مقصد علوم اسلامیہ کا احیا، اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہے اسکے ساتھ حسب ذیل مضامین ہونگے

(۱) عربی زبان کی نادر الوجود کتابون پر تقریظ و تنقید۔

(۲) ممالک اسلامیہ مین آجکل جو کتابین لکھی جارہی ہین اُن پر تقریظ۔

(۳) اکابر سلف کی سوانح عمریان۔ جسمین زیادہ تر انکے اجتہادات سے بحث ہوگی۔

(۴) نصاب تعلیم مروجہ پر بحث۔

(۵) ندوۃ العلما کے متعلق حالات۔

(۶) علمی خبرین۔

(۴) چونکہ دقیق مضامین سے عام لوگون کو دلچسپی نہین ہوسکتی اسلیے ہر پرچہ مین ایک دو دقیق مضامین اور باقی عام فہم و آسان ہون گے۔

(۵) اس رسالہ کی قیمت مع محصول دو روپیہ سالانہ ہوگی۔ نمونہ کا پرچہ ۲ ر وصول ہونے پر روانہ کیا جائے گا۔

(۶) کل خط و کتابت منیجر رسالہ کے نام دفتر ندوۃ العلما۔ لکھنؤ کے پتہ سے کی جائے اور روپیہ بھی اسی پتہ سے بھیجا جائے۔

(۷) جسکے پاس کسی مہینے مین رسالہ نہ پہونچے تو اُسی مہینے مین اطلاع دینی چاہیے۔ ورنہ تعمیل نہ ہوسکے گی۔

(۸) جو صاحب خط لکھین وہ اپنا نام صاف و واضح خط مین لکھین اور قیدک کا نمبر بھی ضرور درج کردین۔

سید عبد الحی

منیجر رسالہ۔

مضامین الندوہ

(۱۹۰۵ـ۱۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مضامین الندوہ (۱۰-۱۹۰۵ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

اَلمراۃُ المُسلمَہ (۱)

(۱)

تعلیم اور خیالات کے اختلاف نے آج کل ہندوستان میں دو گروہ پیدا کر دیے ہیں۔ قدیم تعلیم کی یادگار اور نئی تعلیم کا تربیت یافتہ! تقریباً جو حال مصر کا ہے۔ نئے اور پرانے گروہ میں جو حدِّ فاصل یہاں نظر آتی ہے وہاں بھی قایم ہے! لیکن اس مماثلت کے ساتھ بڑا فرق یہ ہے کہ یہاں نئی تعلیم نے ذریعۂ ملازمت ہونے کے ساتھ اور کوئی فایدہ قوم اور لٹریچر کو نہیں پہنچایا، لیکن مصر میں نئی تعلیم نے ذریعۂ ملازمت ہونے کے ساتھ نسبتاً عمدہ نتایج پیدا کیے ہیں، نئے گروہ میں علمی مذاق پیدا ہو چلا ہے، جو تصنیفات آج عربی لٹریچر کا مایۂ ناز سمجھی جاتی ہیں تقریباً تمام تر نئے گروہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ گروہ اگر چہ ضروریاتِ زمانہ سے باخبر ہے اور یورپ کے قدم بہ قدم چلنا چاہتا ہے مگر چوں کہ اپنی حالت کی بے خبری اور تعلیم کے نقص نے امتیازِ صحیح کا مادّہ سلب کر لیا ہے، اس لیے اس امر کی قدرت نہیں رکھتا کہ حسن و قبح میں تمیز کر سکے۔ برخلاف اس کے مصر کا نیا گروہ یورپ کی ہر ادا کو شیفتگی کے ساتھ دیکھتا ہے مگر نقادانہ نظر (۲) بھی ڈالتا ہے، جو نئے مباحث یورپ کی تقلید نے پیدا کر دیے ہیں، وہ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں، مگر موافقانہ یا مخالفانہ جو کچھ اس پر لکھا جاتا ہے وہ یہاں کی نسبت زیادہ شایستہ اور مدلّل ہوتا ہے۔

نئے مباحث میں ایک بڑی بحث عورتوں کی آزادی یا پردے کی ہے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پچھلے دنوں یہ بحث چھڑ گئی۔ مصر کی تعلیم یافتہ سوسایٹی کے ایک ذی اثر ممبر مسٹر قاسم امین بک ہیں، جو کسی زمانے میں پردے کے بڑے مؤید تھے اور یورپ کی موجودہ آزادی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فرنچ میں ایک رسالہ بھی پردۂ اسلامی کی تائید پر لکھا تھا، جس نے فرانس

میں کچھ دنوں کے لیے ہل چل مچادی تھی۔ لیکن پچھلے دنوں یکا یک ان کی رائے میں انقلاب ہوا اور یورپ کی آزادی کی جگہ پردے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے، چوں کہ گذشتہ غلطی کا کفارہ ضروری تھا، اس لیے پردے کی مخالفت اور آزادیِ نسواں کی ضرورت پر یکے بعد دیگرے دو رسالے لکھ کر شائع کیے، جن میں سے پہلے رسالے کا نام تحریر المرأۃ اور دوسرے کا نام المرأۃ الجدیدہ (۴) ہے۔ ان دو رسالوں نے اہلِ مصر کو نئے سرے سے اس مسئلے پر متوجہ کر دیا۔ قاسم امین بک کی تردید میں معمولی مضامین کے علاوہ پانچ رسالے علی الترتیب لکھے گئے، جن میں سے ایک رسالہ بیروت کے کسی عالم کی تصنیف ہے اور چار رسالے مصر کے تعلیم یافتہ اشخاص کے قلموں سے نکلے ہیں، انھی (۵) رسالوں میں ایک رسالہ المرأۃ المسلمہ بھی ہے جو مصر کے مشہور مصنف فرید وجدی کی تصنیف ہے، اس مضمون کے ذریعے اُردو خوان پبلک کو اس کے قابلِ قدر مباحث سے واقف کرنا چاہتے ہیں، جس سے ایک طرف تو آزادئ نسواں کے مسئلے پر مفید روشنی پڑے گی اور دوسری طرف اس امر کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مصر کا نیا علمی مذاق، ہندوستان کے موجودہ مذاق (۶) سے کس درجے مختلف ہے؟ (۷)......

ہندوستان میں تقریباً بیس برس سے اس مسئلے پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے اور ایک خاص لٹریچر اس موضوع پر تیار (۸) ہو گیا ہے، لیکن اس تمام دفتر کا یہ حال ہے کہ نئے گروہ نے جس قدر پردہ اور تقید کی خرابیاں دکھلائی ہیں وہ خود نہیں دکھلائی ہیں بلکہ یورپ کے اثر میں محیط ہو کر دکھلائی ہیں۔ یورپ کے رعب نے اس طرح انھیں دم بخود کر دیا ہے کہ ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں نہیں کہہ سکتے، اس لیے وہ یورپ ہی کی آواز ہے جو ہیٹ کی جگہ طربوش سے چھپے ہوئے سروں سے نکلتی ہے۔ جن لوگوں نے پردے کی تائید میں رسالے لکھے ہیں، ان میں بڑی جماعت قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ چوں کہ ان لوگوں کی نظروں سے یورپ کا حال پوشیدہ ہے، اس لیے جو کچھ لکھتے ہیں، مذہب کے بل پر لکھتے ہیں اور مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا جادو نئے گروہ پر کارگر نہیں ہو سکتا۔

فرید وجدی چوں کہ یورپ کی متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے اور خود تعلیم یافتہ سوسائٹی (۹) کا ایک فاضل ممبر ہے اس لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے محض یورپ کے اقوال و حالات کو پیشِ نظر رکھ کے لکھا ہے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ المرأۃ المسلمہ جس قدر نئے گروہ پر اثر ڈال سکتی

ہے ہمارے یہاں کی مذہبی تحریروں سے اس قدر توقع نہیں ہو سکتی؟

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ یورپ کا طرزِ عمل اگرچہ اس کی تائید میں ہے، لیکن جمہور کی آواز نہایت سختی سے اس کی مخالف ہے۔ ایک بڑی باریک بیں جماعت موجود ہے جو اس آزادی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس خطرناک زمانے کی یقین کے ساتھ منتظر ہے جب اس آزادی کا لازمی نتیجہ، تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل کردے گا۔ ہمارے یہاں کے مخالفین پردہ، یورپ کے طرزِ عمل کو تو شوق کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن چوں کہ نظریں کوتاہ اور معلومات محدود ہیں اس لیے مخالف جماعت کی رایوں سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پردے کے مؤیدینِ یورپ کی زبانوں اور حالات سے محض بے خبر ہیں، اس لیے ان کی رائے بھی اس میدان میں سبقت نہیں لے جاسکتی۔ فرید وجدی چوں کہ یورپ کے اقوال وحالات پر وسیع نظر رکھتا ہے، اس لیے اس نے اوّل ان تمام لوگوں کی رائیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ (۱۰) کر جمع کی ہیں اور دکھلایا ہے کہ جس ملک کے طرزِ عمل پر فریفتہ ہو کر مصلحت اور تمدنی فواید سے چشم پوشی کرتے ہو، خود اس ملک کے اہل الرائے اور موجودہ مدنیت کے مجدد اس طرزِ عمل کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ پھر مشاہیر علمائے یورپ کے خیالات پیش کر کے ہمدردانہ لہجے میں نصیحت کی ہے کہ محض ظاہری آزادی کے کرشمے پر بے خود نہ ہو جاؤ، کیوں کہ جن نتائج کی بنا پر آزادی کا شور مچاتے ہو، وہ خیر سے یورپ میں بھی مفقود ہیں۔

......(۱۱)

اس سرسری رائے کے بعد اب ہم المرأۃ المسلمہ کے اہم مباحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

عورتوں کی آزادی کی حمایت میں اس وقت تک جس قدر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، اس میں اہم اور قابلِ بحث صرف تین مسئلے ہیں، ان کے علاوہ اور جتنی باتیں پیش کی جاتی ہیں وہ دراصل انھی تین مسئلوں کی شرح وتفسیر میں داخل ہیں۔

۱۔ الف۔ انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس فطری آزادی میں کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ پھر وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر انسانوں کا ایک گروہ اس آزادی سے فایدہ اٹھائے اور دوسرا گروہ محروم رکھا جائے؟

ب۔ جب انسانی قوا کی عقلی نشوونما تمدّنی اور شایستہ زندگی کے لیے ضروری ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عورتیں اس عقلی نشوونما سے محروم رکھی جائیں؟ مردوں نے علوم وفنون، انتظام سیاست اور دنیا کے تمدّنی مشاغل اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں اور عورتیں اس دنیا سے بالکل الگ رکھی جاتی ہیں۔ اوّل تو انھیں تعلیم دی ہی نہیں جاتی اور اگر کسی کا نرم دل ان (۱۲) کے مظلومانہ حال پر متاسّف ہوتا بھی ہے تو صرف معمولی تعلیم ان کے لیے کافی خیال کی جاتی ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں، کیا ان میں دماغی قوتیں موجود نہیں ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ صریح ظلم نہیں ہے کہ علمی دنیا کے شایستہ مشاغل سے انھیں یک لخت محروم کر دیا جائے؟

۲۔ اس وقت تک عورتیں علمی لذت سے محض ناآشنا ہیں اور یہ تمام تمدّنی میدان کل کا کل مردوں کے قبضے میں رہا۔ اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں مردوں کی طرح دماغی ترقی کی صلاحیت نہیں ہے کیوں کہ اس وقت تک انھیں ترقی کا موقع ہی کب دیا گیا؟ یورپ نے (۱۳) آج علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات سے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں اور ثبوت کے ساتھ انھیں عام آزادی بھی دے دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جسے مردوں کی طرح مغربی عورتیں انجام نہ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عورتیں ہیں، پروفیسر عورتیں ہیں، مصنف عورتیں ہیں (۱۴) اور لیکچرار عورتیں ہیں، غرضے کہ ہر میدان میں مردوں کے برابر ترقی کر رہی ہیں۔ یہ نظیر بھی بتلا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے تسلط سے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم سے مردوں کی طرح فایدہ اٹھائیں تو وہ کسی چیز میں مردوں سے کم رتبہ ثابت نہیں ہوسکتیں۔

۳۔ مشرق نے جو ظالمانہ راے عورتوں کے متعلق زمانۂ جہالت (۱۵) میں قایم کی تھی، اس وقت تک اس پر قایم ہے۔ مسلمان عام طور پر عورتوں کو ناقص العقل والدّین، اور فتنہ وفساد کی جڑ سمجھتے ہیں، برخلاف اس کے یورپ عورتوں کی غیر معمولی عزت اور احترام کرتا ہے اور مردوں سے کسی اَمر میں کم نہیں سمجھتا۔

یہ تین باتیں وہ ہیں جو آج مصر و ہندوستان میں پردے کا ہر مخالف زور وشور سے پیش کرتا ہے اور ان کی تشریح وتفسیر میں عجیب عجیب نکتہ آفرینیاں کی جاتی ہیں۔ اس لیے فرید وجدی نے المرأۃ المسلمہ میں انھی (۱۶) تین مسئلوں کو پیشِ نظر رکھا ہے اور ان کے متعدد ٹکڑے کر کے تیرہ

فصلوں میں الگ الگ بحث کی ہے۔ ان فصلوں میں اہم مباحث یہ ہیں:

۱۔ عورت کیا ہے؟

۲۔ عورت کا طبعی وظیفہ کیا ہے؟ (۱۷)

۳۔ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟

۴۔ کیا عورتیں عملی دنیا میں مردوں کے ساتھ شریک ہو سکتی ہیں؟

۵۔ کیا عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہیے؟

۶۔ کیا پردہ عورتوں کے لیے غلامی کی علامت ہے؟ اور کیا آزادی کا منافی ہے؟

۷۔ کیا پردہ عورتوں کی ترقی وکمال کا مانع ہے؟

۸۔ کیا پردے کا عام اثر زایل ہو سکتا ہے؟

۹۔ کیا موجودہ مادی مدنیت کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟ (۱۸)

آخر میں بحث کی ہے کہ تعلیم نسواں کا بہترین طریقہ کیا ہے، لیکن یہ مسئلہ ہماری بحث کے دایرے سے باہر ہے، اس لیے اس کو کسی دوسرے مضمون کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اب ہم فرداً فرداً ان چاروں مسئلوں پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ المرأۃ المسلمہ نے ان پر کس طرح بحث کی ہے، کیا کیا دلایل پیش کیے ہیں، کن کن لوگوں کی رایوں سے استشہاد کیا ہے اور اپنے حریف کے مقابلے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟ (۱۹)

پہلا مسئلہ (۲۰)

قدرت نے مخلوقات کو مختلف جنسوں اور مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر گروہ کے خاص خاص فرایض اور خاص خاص وظایف قرار دیے ہیں۔ ان تمام فرایض کی انجام دہی کے لیے چوں کہ ایک ہی قسم کی جسمانی حالت اور دماغی قابلیت کافی نہ تھی، اس لیے جس گروہ کے متعلق جو کام کیا گیا اسی کے موافق اس کو دماغی اور جسمانی قابلیت عطا کی گئی۔ فرایض کے اختلاف کے ساتھ ضروریاتِ زندگی کا بھی مختلف ہونا ضروری تھا، اس لیے ہر گروہ کو اسی قسم کے داخلی اور خارجی اعضا دیے گئے، جس قسم کی ضرورتیں اس کو پیش آتی ہیں۔ عام حیوانات پر نظر ڈالو! اونٹ کی غذا جنگل کی خاردار گھانس (۲۱) ہے اس لیے اس کو ویسی ہی زبان اور اسی قسم کے دانت بخشے گئے، جو

ان تیز وسخت شاخوں کو آسانی سے چبا سکتے ہیں اور ان کی سختی کے متحمل ہونے کی طاقت رکھتے ہیں۔ شیر کی غذا دوسرے زندہ حیوان ہیں، اس لیے اس کے پنجے نہایت تیز، سخت اور ایسے خاردار بنائے گئے، جن کا ایک ہی وار بھیڑ اور بکری کی ہلاکت کا باعث ہوسکتا ہے۔ انھی فرایض کی انجام دہی کا مجموعی نام تمدّن یا نظام عالم ہے۔ جب کوئی گروہ اپنے طبعی فرایض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے تو فوراً نظام تمدّن (۲۲) کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔

(۲۳)......

بے شک انسان فطرتاً آزاد ہے اور یہ آزادی اس کے ہر ارادی اور غیر ارادی فعل سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس اُمر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسان کا اپنے حقیقی فرایض کو ادا کرنا نظام تمدّن کا اصلی عنصر ہے۔ انسان ان مختلف قوتوں کے مجموعے کا نام ہے، جن میں بعض قوتیں اگر صفاتِ حسنہ کی طرف آمادہ کرتی ہیں تو بعض قوتیں برائیوں کے لیے ترغیب دیتی ہیں، اس میں سیکڑوں خواہشیں (۲۴) اس قسم کی موجود ہیں جن کے اثرات میں محیط ہو کر وہ عقل وتمیز کھو بیٹھتا ہے۔ تعلیم اور سوسایٹی کا خارجی اثر بسا اوقات ان طبعی قوتوں کے اثرات کو قوی اور تیز کر کے اس طرح اس پر اپنا تسلط قایم کر لیتا ہے کہ جمادات ونباتات کی طرح مجبور محض ہو کر انھی کے اشاروں پر چلتا ہے اور انھی کی تحریک پر ہر کام کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نہ اسے اپنے فرایض یاد رہتے ہیں، نہ دوسرے کے فرایض کی کچھ پروا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تسلط سے نکلنے کے لیے نہ علم وفضل کام آسکتا ہے، نہ فلسفہ وعقلیات کی تعلیم کچھ مدد کر سکتی ہے، اس لیے تمدّن اور مذہب نے انسان کی فطری آزادی کو ایک خاص حد تک مقید کر دیا ہے۔ ہر گروہ کے طبعی فرایض تشخیص کیے ہیں، اور انھی فرایض کے میدان میں اسے محدود کر دیا ہے۔ ان فرایض کے لحاظ سے جس درجے تک (۲۵) آزادی حاصل کرنے کا وہ مستحق ہے، اسے بخشی ہے اور جو آزادی اس کے فرایض میں خلل انداز ہوتی ہے، اسے قطعی جرم قرار دیا ہے۔ اب اس اصول کو ذہن نشین کر کے عورتوں کی حالت پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ ان کے طبعی فرایض کیا ہیں؟ ان فرایض کے لحاظ سے وہ کس آزادی کی مستحق ہیں؟ اور کون سی آزادی ان کو فرایض منصبی سے باز رکھ سکتی ہے؟

فرید وجدی نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ اس نے سب سے پہلے عورتوں کے طبعی فرایض پر بحث کی ہے اور نہایت دل نشین عبارت میں ان کی مکمل تصویر پیش کر کے مخالفین

سے سوال کیا ہے کہ کیا عورتوں کے یہ طبعی فرایض اس امر کے مقتضی ہیں کہ ان کو دنیا کی علمی اور تمدّنی کشمکش میں شریک کیا جائے یا اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس دنیا سے (انھیں) الگ رکھ کر اس امر کا موقع دیا جائے کہ اپنے فرایض کی انجام دہی میں منہمک رہیں؟ (۲۶)

وہ لکھتا ہے کہ:

''عورت کو قدرت نے دنیا میں جس غرض سے مخلوق کیا ہے وہ غرض نوع انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت و تربیت ہے۔ پس اس حیثیت سے اس کا طبعی فرض یہ ہے کہ اس اہم فرض کی انجام دہی کی ہمیشہ کوشش کرتی رہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے جن اعضا اور اعضا میں جس تناسب کی ضرورت تھی، قدرت نے اس سے اسے ممتاز کیا ہے۔ (۲۷) جس طرح مردوں کی طاقت سے یہ بات (۲۸) بالکل باہر ہے کہ وہ عورت کے طبعی فرایض میں حصہ لیں، اسی طرح عورت کی طاقت سے (بھی) یہ امر باہر ہے کہ وہ مردوں کے علمی و تمدّنی مشاغل میں شریک ہو۔'' (۲۹)

پھر دوسری فصل میں عورتوں کے طبعی وظیفے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ چناں چہ وہ لکھتا ہے: (۳۰)

''نوع انسانی کی تکثیر اور حفاظت کے لیے (جو عورت کا طبعی وظیفہ ہے) (۳۱) قدرت نے مسلسل چار دور قرار دیے ہیں: حمل، وضع، رضاعت، تربیت۔ ان میں سے ہر ایک دور کا زمانہ عورت کی زندگی کا نہایت اہم اور دشوار زمانہ ہوتا ہے اس کی حفاظت اور صحت کے لیے خاص خاص احتیاطوں اور علاجوں کی ضرورت پڑتی ہے جن میں اگر کسی قسم کی کمی کی جائے تو سخت خطروں اور شدید بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ عالموں کی کچھ خصوصیت نہیں، جاہل (۳۲) سے جاہل شخص بھی اس امر کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، بشرطے کہ وہ متاہل اور صاحب اولاد ہو کہ ان چار زمانوں اور بالخصوص ابتدائی تین زمانوں میں عورت کی زندگی کو کن کن خوف ناک خطروں کا سامنا ہوتا ہے، کس طرح وہ بعض وقت اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے اور کس طرح ان مصیبتوں سے سخت مشکلوں کے بعد نجات

پاتی ہے۔ علم طب کا بہت بڑا حصہ ان چار دوروں کے لوازم احتیاط اور قوانینِ صحت کے متعلق مختلف مباحث سے تعلق رکھتا ہے۔ قدیم و جدید زمانے کے سیکڑوں عالموں اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے اپنی عمریں صرف کر کے اس مسئلے کی مشکلات اور مصائب دور کرنے کے لیے کتابیں تصنیف کی ہیں، جن کے مطالعے سے ان چاروں دوروں کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ انسان کی جہالت کا اصلی مبدا انھیں زمانوں کی بے احتیاطی ہے اور انسانی خوبیوں کا حقیقی سرچشمہ بھی انھیں زمانوں کی حفاظت ہے۔''

پھر فرداً فرداً چاروں دوروں پر بحث کی ہے اور حمل، وضع، رضاعت اور تربیت کی مشکلات دکھلائی ہیں۔ چناں چہ لکھتا ہے: (۳۳)

''زمانۂ حمل جس کی مدت عام طور پر نو ماہ قرار دی گئی ہے، عورت کے لیے ایک ایسا نازک زمانہ ہوتا ہے جس میں وہ فرایض منزلی (۳۴) کے ادا کرنے کے بھی قابل نہیں ہوتی۔ اس کی ہر معمولی سے معمولی حرکت کا اثر نہ صرف خود (۳۵) اس کی ذات تک محدود رہتا ہے بلکہ اس میں وہ نازک اور ضعیف وجود بھی شامل ہوتا ہے جس کی حفاظت اور تربیت قدرت نے اس کے سپرد کی ہے۔ اس نو مہینے کے زمانے میں جنین پر مختلف دور طاری ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دور کے خاص آثار اور علامات ہیں اور ہر علامت کے زمانے میں خاص خاص احتیاطیں اور حفاظتیں ضروری ہیں۔

زمانۂ حمل میں ان کی ہر حالت سے جنین اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے ضعف و قوت یا زندگی اور موت کا دارومدار محض ان کی احتیاط اور حفاظت پر ہوتا ہے۔

اطبائے جدید و قدیم کا قول ہے کہ زمانۂ حمل میں عورت کو نہایت شدت کے ساتھ اپنے خیالات، مزاج اور افعال کی نگہ داشت کرنی چاہیے۔ ورنہ جس قسم کے حالات اس کو پیش آئیں گے جنین کی جسمانی اور دماغی حالت بھی اسی قسم کی ہوگی۔''

یورپ کے سیکڑوں تجربوں نے بھی اس قول کی تصدیق کی ہے۔ مختلف بچوں کے عادات و

اطوار، اور جسمانی قوت کے مبدا کا جب سراغ لگایا گیا تو زمانہ حمل کے حالات ثابت ہوئے۔ فرانس میں خوبصورت والدین کا بچہ جب سیاہ رنگ اور حبشیوں کی سی صورت پر پیدا ہوا تو ڈاکٹروں کو اس اختلاف پر سخت حیرت ہوئی جو تحقیق سے ثابت ہوا کہ زمانہ حمل میں ماں کی نشست کے سامنے میز پر ایک حبشی کا اسٹیچو رہا کرتا تھا، جس کی مشابہت اور رنگ کا اثر نگاہوں کے ذریعے دماغ میں پہنچا (۳۶) اور ذہن کو اس طرف غیر معمولی توجہ ہوگئی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بچے کو والدین کی صورت سے کوئی تعلق نہیں (۳۷)، اسی حبشی کے ڈیل ڈول پر پیدا ہوا۔ (۳۸)

......(۳۹)

"وضع حمل کا وقت، زمانہ حمل سے زیادہ سخت اور صعب ہوتا ہے، جس میں عورت کی زندگی موت سے نہایت قریب ہوجاتی ہے، وضع کے بعد عورت نہایت سخت بیماری اور حقیقی ضعف میں مبتلا ہوجاتی ہے، جس کا اثر مدت تک زایل نہیں ہوتا اور صحت کے بعد عورت کی زندگی از سرِ نو شروع ہوتی ہے، اطبا نے نہایت ضخیم ضخیم کتابیں اس وقت کے قواعدِ صحت اور قوانینِ احتیاط پر تصنیف کی ہیں اور وہ علاج بتلائے ہیں جن سے ان مختلف اقسام کے بخاروں سے حفاظت ہوسکتی ہے جو بسا اوقات عورتوں کے لیے باعثِ موت ہوجاتے ہیں۔"

یہ وقت عورت کے لیے جس قدر نازک اور سخت ہے اس کا ہر مقابل شخص اندازہ کرسکتا ہے۔ ہر سال دنیا میں ہزاروں جانیں صرف اس لیے ضایع ہوجاتی ہیں کہ قوانینِ طبیہ کے مطابق وضعِ حمل کے موقع پر احتیاط اور حفاظت نہیں کی گئی۔ (۴۰)

......تیسرا دور ارضاع کا زمانہ (۴۱) ہے۔ یہ زمانہ اگرچہ ماں کے لیے اس درجہ سخت اور دشوار نہیں ہے جس قدر ابتدائی دو (۴۲) دور ہوتے ہیں، لیکن بچے کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور غیر معمولی توجہ کا محتاج ہوتا ہے، اس زمانے کی حفاظت کے لیے خاص قواعد و قوانین ہیں، جن کی تعمیل میں اگر کسی قسم کی کوتاہی ہوتی ہے تو بچہ کی جان یا تو خطرے میں پڑجاتی ہے یا ہمیشہ کے لیے کوئی جسمانی اور دماغی نقص پیدا ہوجاتا ہے۔ ایام رضاعت میں ان کی احتیاط اور قواعد طبی پر عمل اس لیے ضروری ہے کہ جس قسم کی غذا اس کے استعمال میں آتی ہے اسی قسم کا اثر بچہ پر مرتب ہوتا ہے، اگر ماں گرم غذا (اعتدال اور قاعدے سے) زیادہ استعمال کرتی ہے تو اس کا مضر اثر جس

طرح خود ماں پر پڑتا ہے اسی طرح بچہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض بچے نہایت سخت بیماریوں میں اس لیے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایام رضاعت میں ماں بے احتیاطی سے بعض مولد امراض چیزوں کا استعمال کر لیتی ہے، ان کا مضر اثر دودھ کے ذریعے سے بچے تک پہنچتا ہے۔ اور مختلف امراض کا باعث ہوتا ہے۔

علاوہ اس کے بچے کی جسمانی شگفتگی اور دماغی صحت اس امر پر موقوف ہے کہ یوم ولادت سے آخر ایام رضاعت تک غذا میں، لباس میں اور صفائی میں کسی قسم کی بے احتیاطی نہ کی جائے اور ایک لحظہ بھی بچے پر ایسا نہ گزرے کہ ماں اس کی حالت سے غافل ہو۔ ہمارے ملکوں میں ہزاروں بچے نشو ونما پانے سے پہلے اس لیے دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں کہ ان کی مائیں ان ضروری قواعد سے ناواقف اور بے خبر ہوتی ہیں۔ (۴۳)

(۴۴)......

چوتھا دور، زمانۂ تربیت ہے اور درحقیقت بہ لحاظ اہمیت کے اور بلحاظ ان اثرات کے جن پر انسانی زندگی کی تمام آیندہ خوبیاں اور برائیاں (۴۵) منحصر ہیں، پہلے تینوں دوروں سے زیادہ نازک (۴۶) اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے۔

بچہ جب عالمِ غیب سے یکا یک دنیا میں قدم رکھتا ہے تو ایک ایسے آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس کی سطح بالکل صاف اور ہر قسم کے اثرات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے، نہ کسی کا عکس اس میں نظر آتا ہے اور نہ کسی کی تصویر اس پر منقش ہوتی ہے، ایسی حالت میں جس قسم کا عکس اس پر ڈالا جاتا ہے، ہمیشہ کے لیے قایم ہو جاتا ہے۔ اگر خوش نما نقش ونگار سے اس کی سطح مزین کی گئی تو ہمیشہ کے لیے وہ آئینہ خوبصورت ہو گیا، اگر بدقسمتی سے کسی ناواقف اور جاہل نے ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچ دیں تو ہمیشہ کے لیے بدنما ہو گیا۔ اس کی صاف اور شفاف سطح، سیاہ وسفید سے محض بے خبر ہوتی ہے اس لیے اس کو کسی رنگ کا قبول کرنے میں انکار نہیں ہوتا اور جس مصور کے ہاتھ قدرت نے اسے سپرد کر دیا ہے اس کی ہر رائے کے آگے سرِ تسلیم جھکا دیتی ہے۔

یہی حال اس تازہ وارد مسافر کا ہوتا ہے جس کے لیے دنیا اور دنیا کی ہر بات بالکل نئی ہوتی ہے، اس کے کان جس طرح فضایلِ انسانی سے ناآشنا ہوتے ہیں، اسی طرح رزایلِ انسانی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ رحم کیا چیز ہے اور ظلم کس کو کہتے ہیں؟ نہ اس کو اس کی خبر ہوتی ہے

کہ صبر انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور تعصب تمام برائیوں کا مخزن ہے، (۴۷) اس کا سادہ ذہن آئینے کی طرح ہر قسم کے نقش و نگار سے خالی، (۴۸) مگر ہر اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی شفیق ماں اس کی فطری مصور ہوتی ہے جس کی توجہ اور تربیت یا تو اخلاقِ محاسن کا نقش اس کے دماغ پر نقش کا لحجر کر دیتی ہے یا تمام رذایل انسانی کا عادی بنا کر، نہ صرف اس کی، بلکہ سوسایٹی کے ہر فرد کی زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ کر دیتی ہے۔ اسی زمانے کے وہ اثرات انسان کی طبیعت ثانیہ ہو جاتے ہیں جن کو نہ اعلیٰ تعلیم کا اثر زایل کر سکتا ہے، نہ ساری عمر کی ''جہد و کوشش'' (۴۹) کھو سکتی ہے۔ قوموں کی ترقی کا بڑا راز تاریخ بتلائی ہے کہ قومی افراد کی یہی ابتدائی تربیت ہے جو انسان اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں صرف ماں کی کوشش اور توجہ سے حاصل کر سکتا ہے۔

> ''اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کا طبعی وظیفہ نوعِ انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت ہے اور اس بنا پر اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہمیشہ کوشش کرتی رہے، کیوں کہ قدرت نے ایسے اہم کام اس کے متعلق کر دیے ہیں، جن میں بے شمار دقتیں اور بے حساب دشواریاں ہیں اور بغیر پوری مصروفیت اور توجہ کے انجام نہیں پا سکتے۔ پس جو شخص عورت کو اس کے طبعی وظیفے سے باہر قدم نکالنے کی ترغیب دیتا ہے، وہ نہ صرف خود قوانین قدرت کا مجرم بنتا ہے، بلکہ ایک بڑے گروہ کو قدرت کی خلاف ورزی پر آمادہ کر کے اپنے جرم میں شریک کرنا چاہتا ہے۔''

اس کے بعد آزادی کے ہوا خواہوں کو مخاطب کر کے سوال کیا ہے کہ:

> ''جس گروہ کے قدرت نے ایسے اہم فرایض قرار دیے ہیں، کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ دنیا کے عام علمی و تمدنی مشاغل میں شریک ہو؟ (۵۰)

اب سوال یہ ہے کہ جس گروہ کا طبعی وظیفہ (۵۱) ایسے اہم اور دشوار مرحلوں کا طے کرنا ہے، کیا وہ دنیا کی تمدنی کشمکش میں شریک ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس قسم کی شرکت اس کے طبعی وظیفے میں حارج نہیں نہ ہوگی؟ فرض کرو کہ ایک عورت علم و تدبر کے اعلیٰ درجے تک ترقی کر کے کسی پارلیمنٹ کی ممبر یا کسی سیاسی گروہ کی ایک

رکن ہوگئی ہے، لیکن ساتھ ہی تاہل اور معاشرت کے طبعی نتائج نے اس کو زمانۂ حمل کے صعوبات میں بھی مبتلا کر دیا ہے تو ایسی حالت میں، وہ اپنی پارٹی کی حمایت اور سیاسی مناقشات کے فیصل کی تدابیر پر غور کرے گی اور شب و روز اسی فکر میں سرگرم رہے گی یا ان تدابیرِ صحت اور قوانینِ احتیاط پر عمل کرے گی، جن کی تعمیل میں ذراسی کمی اس کی، اور جنین کی ہلاکت کا باعث ہوجاتی ہے؟ اس کا قدرتی فرض تو یہ ہے کہ اس دور کا تمام زمانہ ان افکار اور افعال میں گزار دے جن کا اثر جنین کی جسمانی و دماغی ساخت کے لیے مفید ہو لیکن سیاسی ضرورتیں اس کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ پریشان کن دماغ اور نہایت تلخ و ناگوار افکار میں مبتلا ہو کر سخت بے چینی اور بے اطمینانی میں یہ زمانہ صرف کر دے، تو کیا ایسی حالت میں یہ شرکت اس کے قدرتی فرض میں خلل انداز نہ ہوگی اور کیا اس کی صحت کے لیے مضر نہ ہوگی؟ اس مثال پر کچھ موقوف نہیں، فرض کرو کہ ایک عورت نے قانونی تعلیم کو بدرجۂ کمال حاصل کر کے ایک کامیاب بیرسٹر کی صورت میں خود کو پبلک پر ظاہر کیا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی گود میں ایک ننھا سا وجود بھی اس کی توجہ اور محبت کے انتظار میں، اس کی صورت کو تک رہا ہے، ایسی حالت میں اس کا دن بھر کسی سخت جرم کی مدافعت میں اور ان قانونی پہلوؤں کی تلاش میں جو اس کے مؤکل کے لیے مفید ہوں، مصروف رہنا اور شب بھر سندوں اور حوالوں کی جستجو میں، قانون کی ضخیم ضخیم کتابوں کی ورق گردانی میں منہمک رہنا کہ صبح کو مقدمے کی پیشی ہونے والی ہے، کیا اس کو ایامِ رضاعت کے نازک فرائض سے باز نہ رکھے گا؟ اور کیا اپنی پوری توجہ اور قوت کو جرم کی مدافعت کی کامیابی کے لیے صَرف کر دینا اور اسی کی فکر و کوشش میں رہنا، اس کو بچے کی نگہ داشت اور تربیت سے غافل رہنے پر مجبور نہیں کرے گا؟ عورت کے طبعی وظیفے کی ہدایت تو یہ ہے کہ وہ یومِ ولادت سے لے کر آخر ایامِ طفولیت تک بچے کی ہر حرکت اور ہر فعل کی نگہ داشت کرے، عمدہ خصائل کا اسے عادی بنائے، بری عادتوں سے محفوظ رکھے، لیکن اس بدقسمت بچے کا کیا حال ہوگا؟ جب اس کی ''بیرسٹر ماں'' عدالت میں فریق مخالف

پر جرح کر رہی ہوگی اور اس کا شیر خوار بچہ اس کی توجہ اور تربیت کا منتظر جھولے میں پڑا ہوگا؟ یا اس بدنصیب بچہ کی صحت اور زندگی کس حالت میں ہوگی جب وہ صالح اور مفید دودھ کا محتاج ہوگا اور اس کی مدبّر اور پارلیمنٹ کی ممبر ماں لبرل پارٹی کی حمایت کے خیال میں رات دن مستغرق اور مختلف جدو جہد میں منہمک ہوگی؟ اور ناکامی کے انفعال و افسوس نے دودھ میں فساد پیدا کر کے بچے کی طبعی غذا کو اس کے لیے مضر اور خطرناک بنا دیا ہوگا؟ کیا یہ اور اس قسم کی اور ظاہر مثالیں اس امر کے سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ قدرت نے عورت کو مردوں کے مشاغل سے محض (۵۲) الگ رکھا ہے؟ اور اس کا طبعی وظیفہ اس قدر مصروفیت طلب اور محتاج توجہ ہے کہ عورت کا مردوں کے ساتھ شریک ہونا، بغیر اس کے محال ہے کہ وہ طبعی وظیفے کی ادائیگی سے بے خبر یا دست بردار ہو جائے؟''

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے دنیا کے کاموں کے خود ہی دو حصے کر دیے ہیں؛ نوع انسانی کی حفاظت اور تکثیر اور انسانی ضروریات کا انتظام! پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا گیا، اس لیے اس کو اسی قسم کے اعضا اور اسی قسم کی جسمانی قوت دی گئی جو اس فرض کی انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا گیا، اس لیے اسی کے مطابق جسمی اور دماغی قوت (۵۳) عطا کی گئی، ان دونوں گروہوں کا الگ الگ کام دنیا کا مجموعی تمدن قایم رکھتا ہے اور جب اس اختلاف کے اٹھانے کی کوشش ہوتی ہے یا کوئی گروہ اپنے فرایض سے باہر قدم نکالتا ہے تو تمدن اور معاشرت کے انتظام میں خلل پڑ کر سیکڑوں دقتیں اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے عورت کے طبعی فرایض کا اقتضا اس خیال کا بالکل مخالف ہے کہ ان کو مردوں کے فرایض میں شریک کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں جہاں اس خیال کی تائید کی گئی اور عورتوں کو مردوں کے میدان میں قدم رکھنے کی اجازت دی گئی، وہاں بالکل کامیابی نہیں ہوئی اور معاشرت میں ہزاروں خرابیں (۵۴) پیدا ہو گئیں۔ کیوں کہ یہ قدرت کا قانون ہے اور کوئی انسانی کوشش اس کے خلاف کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

''پس ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہمیشہ کوشش کرتے رہیں کہ عورت اپنے طبعی فرایض کے میدان میں محدود رہے اور ان فرایض کو قدرت کی ہدایت

کے مطابق انجام دے اور اگر ہم دیکھیں کہ عورت اپنے طبعی فرایض سے دور ہو رہی ہے تو اس کو ایک تمدّنی مرض سمجھیں اور اس کے علاج کے لیے جدو جہد کریں۔ کیوں کہ عورت فلسفہ وعلوم کے ہزار مرحلے طے کرلے، مگر اپنے طبعی وظیفے سے غافل رہے تو غیر ممکن ہے کہ وہ علم وفضل اس کے لیے یا سوسایٹی کے لیے مفید ہو سکے۔" (۵۵)

ابوالکلام آزاد دہلوی
دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ (۵۶)

حواشی

نوٹ: حواشی میں جہاں کہیں لفظ ''کتاب'' آیا ہے، اس سے مراد ''المرأۃ المسلمہ'' کا کتابی ایڈیشن ہے۔

۱۔ کتاب (مسلمان عورت) میں ''المرأۃ المسلمہ'' اور قسط کے اشارے ''نمبر (۱)'' کی جگہ عنوان ''مقدمہ'' نے لے لی ہے اور آغازِ تحریر سے پہلے یہ شعر درج ہے:

''در رہِ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرمِ راز
ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد!''

۲۔ ''نقادانہ نظر'' کی جگہ کتاب میں ''نقادانہ نگاہ'' نے لے لی ہے۔

۳۔ ''رائے میں انقلاب ہوا'' کتاب میں یہ جملہ ''رائے میں انقلاب پیدا ہوا'' بن گیا ہے۔

۴۔ ''تحریر المرأۃ'' کا ترجمہ اُردو میں شایع ہو چکا ہے۔ ناظرین اگر اس کے ملاحظے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ پردے کی مخالفت اور آزادی کی حمایت میں جو طریق استدلال اور طرزِ تحریر مصر کی مخالف پارٹی نے اختیار کیا ہے، وہ بہ نسبت ہندوستان کے کس قدر شایستہ اور مدلّل ہے! (ابوالکلام)

۵۔ اس قسم کے تمام جملوں اور پورے سلسلہ مضمون میں لفظ ''انھیں'' استعمال ہوا ہے لیکن کتاب میں یہ املا مولانا آزاد نے ''انھی'' سے بدل دیا گیا ہے۔ اس لیے مناسب نہ ہوگا کہ اس قسم کے جملوں پر حاشیہ لکھ کر ہر جگہ املا کی تصحیح یا تبدیلی کی صراحت کی جائے۔

۶۔ ''موجودہ مذاق'' سے کتاب میں لفظ ''موجودہ'' حذف کر دیا گیا ہے۔

۷۔ کتاب میں اس مقام پر ''اہم خصوصیتیں'' ذیلی عنوان کا اضافہ ہو گیا ہے۔

۸۔ اس سلسلۂ مضمون میں ''تیار'' کا املا ''طا'' سے آیا ہے اور جہاں کہیں بھی آیا ہے اسے ''تا'' سے بدل دیا گیا ہے۔ کتابی ایڈیشن میں مولانا نے خود بدل دیا تھا اور اس کے بعد ''تذکرہ'' اور دیگر تحریرات پر نظرِ ثانی میں مولانا نے یہی...... املا اختیار کر لیا تھا۔

۹۔ یہاں لفظ ''سوسیٹی'' تھا جس کا املا کتاب میں ہر جگہ ''سوسایٹی'' کر دیا تھا۔ اِس سلسلۂ مضمون میں اسی طرح کر دیا گیا ہے۔

۱۰۔ کتاب میں ''ڈھونڈھ ڈھونڈھ'' کی نہ صرف تکرار کو دور کر دیا ہے بلکہ ''ھ'' کو تخفیف کر کے ''ڈھونڈ'' بنا دیا گیا ہے۔ ''ڈھونڈھ'' میں تخفیف ''ہا'' کی تبدیلی چوں کہ کتاب میں ہر جگہ تھی، اس لیے یہی املا اس پورے سلسلۂ مضمون میں اختیار کر لیا ہے۔

۱۱۔ کتاب میں اس مقام پر ''اہم مباحث'' کے عنوان سے سب ہیڈنگ کا اضافہ ہے۔

۱۲۔ ''ان کے مظلومانہ حال'' اس جملے میں ''ان'' ضمیر غائب جمع کو ضمیر واحد غائب ''اس'' بنا دیا گیا ہے۔

۱۳۔ جملہ ’’یورپ نے‘‘ کتاب میں حذف کر دیا ہے۔

۱۴۔ کتاب میں جملہ ’’مصنف عورتیں ہیں‘‘ حذف کر دیا ہے۔

۱۵۔ کتاب میں ’’زمانۂ جہالت‘‘ کو ’’زمانۂ جاہلیت‘‘ سے بدل دیا ہے۔

۱۶۔ کتاب میں یہاں ’’انھیں‘‘ ہے اور چوں کہ یہ تبدیلی عام ہے، اس لیے ایسے مواقع پر اس سلسلۂ مضمون میں اس اصلاح کو اختیار کر لیا ہے۔

۱۷۔ کتاب میں یہ جملہ اس طرح ہے: ’’عورت کے قدرتی فرایض کیا ہیں؟‘‘ چوں کہ کتاب میں مولانا نے ہر جگہ ’’وظیفہ‘‘ کو ’’فرایض‘‘ سے بدل دیا ہے اس لیے سلسلۂ مضمون میں اس تبدیلی کو اختیار کر لیا ہے۔

۱۸۔ کتاب میں نمبر ۹ کے بعد نمبر ۱۰ بھی ہے جس کی عبارت یہ ہے: ’’(۱۰) مسلمان عورتوں کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟‘‘

۱۹۔ کتاب میں یہ پورا پیراگراف (آخر میں بحث......تا......کامیابی حاصل کی ہے) حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۰۔ رسالہ ’’الندوۃ‘‘ کا یہ عنوان (پہلا مسئلہ) کتاب میں ایک مکمل وضاحتی جملے ’’عورت کے قدرتی فرایض‘‘ سے بدل دیا گیا ہے۔

۲۱۔ کتاب میں ’’گھانس‘‘ کے ن کی تخفیف کے ساتھ ’’گھاس‘‘ ہے۔

۲۲۔ اس جملے سے لفظ ’’فوراً‘‘ کتاب میں نکال دیا گیا ہے۔

۲۳۔ اس مقام پر کتاب میں یہ عبارت اضافہ ہے:

......بنیادیں ملنے لگتی ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف کلام الٰہی نے ارشارہ کیا ہے:

ربنا الذی اعطیٰ کل شی خلقه ثم هدی، ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کا مکمل وجود عطا فرمایا، پھر اسے اپنے فرایض بجالانے کی ہدایت کی۔

انا کل شیٔ خلقناہ بقدر ہم نے ہر چیز کو ایک اندازۂ خاص پر پیدا کیا ہے۔

نیچرل فلاسفی کا یہ قول خلاق عالم کے انھی ارشادات کی تفسیر ہے کہ ’’طبیعت اپنی حد سے کبھی نہیں بڑھتی‘‘ (مسلمان عورت، ص ۱۷)

۲۴۔ کتاب میں ’’سینکڑوں‘‘ بیچ کے ’’ن‘‘ مابعد ’’یا‘‘ کے اضافے کے ساتھ ہے۔ یہ یقیناً کاتب کی عادی غلطی ہے، جو کاتبوں اور عوام میں عام پھیلی ہوئی ہے۔

۲۵۔ ’’جس درجے تک‘‘ یہ جملہ کتاب میں ’’جس حد تک‘‘ کی صورت میں بدل گیا ہے۔

۲۶۔ یہ پیراگراف (از فرید وجدی نے......تا......میں منہمک رہیں) کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۷۔ کتاب میں یہ جملہ اس طرح ہے، ’’قدرت نے اسے عطا کیے ہیں۔‘‘ (المرأۃ المسلمہ، ص ۱۴)

۲۸۔ کتاب میں ’’یہ بات‘‘ مبدل بہ ’’یہ امر‘‘ ہوگئی ہے۔

۲۹۔ المرأۃ المسلمہ، ص ۲۲

۳۰۔ کتاب میں یہ پوری سطر حذف کر دی گئی ہے۔

۳۱۔ بین القوسین وضاحتی جملے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اس لیے حذف کر دیا ہے۔

۳۲۔ کتاب میں ''سے جاہل'' حذف کر دیا ہے۔ محاورتاً ہونا چاہیے تھا۔ یقین ہے یہ کاتب کا سہو ہے، لیکن غلط یہ بھی نہیں۔

۳۳۔ کتاب میں ان دونوں سطروں کو حذف کر دیا ہے۔

۳۴۔ ''فرایض منزلی'' کے جملے کو کتاب میں ''گھر کے فرایض'' لکھا گیا ہے۔

۳۵۔ لفظ ''خود'' کتاب میں تخفیف کر دیا گیا ہے۔

۳۶۔ ''پہونچنا'' سے بننے والے افعال کے املا میں یکسانیت نہ تھی، اس لیے ''و'' کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اب یہ املا کتاب کے مطابق بھی ہو گیا ہے۔

۳۷۔ کتاب میں لفظ ''نہیں'' کی بجائے لفظ ''نہ رہا'' ہو گیا ہے۔

۳۸۔ التوضیح فی اصول التشریع، مطبوعہ بیروت

۳۹۔ کتاب میں اس مقام پر ''وضع حمل'' کے ذیلی عنوان کا اضافہ ہے۔

۴۰۔ جملے کا آخری لفظ ''گئی'' کتاب میں لفظ ''جاتی'' سے بدل گیا ہے۔

۴۱۔ اس سطر کے آغاز پر کتاب میں ''رضاعت'' ذیلی عنوان کا اضافہ ہے اور اس جملے میں ''ارضاع کا زمانہ'' کی جگہ کتاب میں ''رضاعت کا زمانہ'' بنا دیا گیا ہے۔

۴۲۔ کتاب میں ''دو'' کی صراحت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اس لیے لفظ ''دو'' کو حذف کر دیا۔

۴۳۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۲۶ سے ۲۷ تک۔

۴۴۔ اس مقام پر کتاب میں ''تربیت'' ذیلی عنوان کا اضافہ ہے۔

۴۵۔ کتاب میں ''خوبیں اور برائیں'' کی جگہ صرف ایک لفظ ''خوبیاں'' استعمال ہوا ہے۔

۴۶۔ لفظ ''نازک'' کو کتاب میں لفظ ''خطرناک'' سے بدل دیا گیا ہے۔

۴۷۔ ان جملوں میں لفظ ''صبر'' اور ''تعصب'' کو لفظ ''علم'' اور ''جہل'' سے بدل دیا گیا ہے کتاب میں یہ عبارت اس طرح ہو گئی ہے: ''علم انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور جہل تمام برائیوں کا مخزن ہے۔''

۴۸۔ کتاب میں یہ جملہ ''خالی'' کے ساتھ فعل کا اضافہ کر کے ''خالی ہوتا ہے۔'' مکمل کر دیا گیا ہے۔

۴۹۔ ''جہد و کوشش کی بجائے کتاب میں ''جد و جہد و کوشش'' ہے۔

۵۰۔ اوپر کا پورا پیراگراف (از ''اس تمام تفصیل کا خلاصہ...... تا...... مشاغل میں شریک ہو'') کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۵۱۔ کتاب میں ''طبعی وظیفہ'' کو ''قدرتی فرض'' سے بدل دیا گیا ہے۔ اس بحث میں اور بھی کئی بار ''طبعی وظیفہ'' اصطلاح استعمال ہوئی ہے جسے کتاب میں ''طبعی فرض'' سے بدل دیا گیا ہے۔

۵۲۔ کتاب میں لفظ ''محض'' حذف کر دیا ہے۔

۵۳۔ کتاب میں ''دماغی قوت'' کی جگہ ''دماغی طاقت'' استعمال ہوا ہے۔

۵۴۔ کتاب میں ''خرابیں'' کی جگہ ''خرابیاں'' استعمال ہوا ہے۔

۵۵۔ اس مقام پر فرید وجدی کی کتاب پر مولانا ابوالکلام کے تبصرے کی پہلی قسط ختم ہو جاتی ہے لیکن مضمون جاری اور بحث مسلسل ہے۔

۵۶۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ، بابت ماہ نومبر ۱۹۰۵ء، ص ۱۵ تا ۲۹

اَلمراۃُ المُسلمَہ

(۲)

عورتوں کی آزادی کے متعلق پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ

''انسان فطرتاً آزاد ہے پھر وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر عورتیں اس آزادی سے محروم رکھی جاتی ہیں۔''

اس اعتراض میں یہ امر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ عورتیں آزادی سے محروم ہیں، لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ کیوں کر؟ تو جواب میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

ا۔عورتوں کو تعلیم نہیں دی جاتی، دنیا کے عام تمدّنی اور سیاسی مشاغل میں شریک نہیں کیا جاتا!

۲۔ان کو پردے میں تقید کے ساتھ رکھا جاتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مردوں کی طرح آزاد نہیں ہیں!

قاسم امین بک نے بھی انھی دو دلیلوں پر زور دیا ہے اور مختلف واقعات پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ پردے میں عورتوں کو مقید رکھنا اور مردوں کی طرح عام تمدّنی مشاغل میں شریک نہ ہونا، عورتوں کی غلامی اور فطری آزادی سے محرومی کا بین ثبوت ہے۔(۱)

فرید وجدی نے اس کے جواب میں دور از کار بحثوں سے چشم پوشی کر کے صرف عورتوں کا طبعی وظیفہ پیش کر دیا ہے۔ جس کو تم پہلے حصے (۲) میں پڑھ آئے ہو۔ اس پر ایک نظر ڈالو اور غور کرو کہ کیا اس سے بہتر جواب ممکن ہے؟

پہلی دلیل کا جواب ظاہر ہے کہ جس گروہ کے طبعی فرایض ایسے اہم اور دشوار ہوں کیا وہ مردوں کی طرح عام تعلیم حاصل کر کے دنیا کی تمدّنی اور سیاسی کشمکش میں شریک ہو سکتا ہے؟

عورتوں کو مردوں کے جبر نے ان مشاغل سے دور نہیں رکھا بلکہ خود فطرت نے مردوں کی دنیا سے عورتوں کو الگ کر دیا ہے، اس لیے اعتراض قدرت پر ہونا چاہیے، نہ کہ مردوں پر!

پردے کی بحث مستقل عنوان سے آگے آئے گی، لیکن عورتوں کے طبعی فرایض پر نظر کرتے ہوئے کیا اس امر کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر ہو سکتا ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں کو کسی قدر (۳) تقید میں رہنا چاہیے۔ قدرت نے ہر گروہ کے فرایض مقرر کر دیے ہیں اور اقتضائے فرایض کے لحاظ سے ایک خاص حد تک مقید بھی کر دیا ہے۔ مذہب اور تمدّن کی دنیا میں یہی کام ہے۔ اس بنا پر اگر عورتوں کی آزادی کو کسی معتدل حد تک مقید نہ کیا جائے تو طبعی فرایض کی انجام دہی میں سخت خرابیں (۴) پیدا ہو جائیں۔

عورتوں اور مردوں میں صرف اختلافِ صورت ہی نہیں ہے، بلکہ طبیعت، ذہن، اثر اور فرایض کے لحاظ سے بالکل دو مختلف گروہ ہیں (۵)۔ اس لیے ان دونوں کے میدانِ عمل کو الگ الگ کر کے پردے کو بیچ میں حدِ فاصل قرار دیا گیا، تاکہ ہر گروہ اپنے میدانِ عمل میں محدود رہے۔ اس حدِ فاصل کے اُٹھانے کی جب کوشش کی جاتی ہے تو تمدّن و معاشرت کی بنیادوں میں حرکت پیدا ہو کر دنیا کو خبردار کر دیتی ہے کہ عن قریب عمارت گرنے والی ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، ''یورپ'' کی موجودہ حالت کافی ہے۔

قاسم امین بک نے آزادی کی تعریف ان جملوں میں کی ہے:

> ''آزادی سے ہماری غرض یہ ہے کہ مذہب اور تمدّن نے جو حدود قایم کر دیے ہیں، ان سے واقف ہونے کے بعد انسان اپنے خیالات، اعمال اور ارادے میں مستقل بالذات ہو۔'' (۶)

جب مذہب اور تمدّن کی قید ضروری اور مسلّم ہے تو ناظرین اس امر کا فیصلہ آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ:

> ''کیا عورتوں کا طبعی وظیفہ اس امر کا مقتضی ہے کہ ان کو مردوں کے تمدّنی اور سیاسی مشاغل میں شریک کیا جائے؟ اور کیا مذہب اور تمدّن کے مصالح اقتضائے فرایض کے لحاظ سے عورتوں کو ایک خاص حد تک مقید رکھنا ضروری نہیں قرار دیتے؟''

یورپ کے مشہور مصنفوں کے جو اقوال، دوسرے مسئلے کی بحث میں (۷) درج کیے جائیں گے، ان کے دیکھنے کے بعد تم خود اندازہ کرلو گے کہ یہ صرف فرید وجدی ہی کی تنہا رائے نہیں ہے (۸) بلکہ یورپ کے تمام چیدہ مصنفین اس مسئلے میں اس کے (۹) ہم زبان ہیں، ان کی متفقہ آواز پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

''عورتوں کا طبعی فرض نوع انسان کی حفاظت اور تربیت ہے۔ اس دایرے سے عورت جب قدم باہر نکالتی ہے تو شایستہ عورت (۱۰) نہیں رہتی بلکہ عورت اور مرد کے علاوہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جاتی ہے۔''

وہ یورپ کی عورتوں کو ''عورت'' تسلیم کرنے میں سخت تامّل (۱۱) ظاہر کرتے ہیں اور آزادی اور آزادی کی خواہش کو ایک خالص خبط اور نری وحشت قرار دیتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ (۱۲)

(الف) عورتوں کو تعلیم دی ہی نہیں گئی، اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں علمی ترقی کی صلاحیت نہیں!

(ب) آج یورپ کی جدید تشریحی تحقیقات اور علم فزیالوجی نے ثابت کردیا ہے کہ مرد اور عورت، ہر حیثیت سے برابر ہیں! (۱۳)

قاسم امین بک نے المرأۃ الجدیدہ میں جابجا اس امر پر زور دیا ہے کہ

''یورپ نے غفلت کے اس قدیم پردے کو اپنی علمی تحقیقات سے چاک کردیا ہے، جس نے اس وقت تک عورتوں کی اصلی حالت کو پوشیدہ رکھا تھا۔ علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات (۱۴) نے ثابت کردیا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا جسمانی یا دماغی فرق نہیں ہے اور جو علمی کام ایک مرد کے قوائے ذہنی انجام دے سکتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح ایک عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔''

صرف قاسم امین بک ہی کا یہ دعویٰ نہیں ہے بلکہ عام طور پر جب آزادیٔ نسواں کی بحث پیش ہوتی ہے تو فریقِ مخالف کی طرف سے عموماً یہ دعویٰ پر زور لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس لیے فرید وجدی کا ایک اہم فرض یہ بھی تھا کہ اس دعوے کی صداقت یا عدم صداقت کا فیصلہ کر دے۔ (۱۵)

قاسم امین بک نے اس دعوے کے ثبوت میں صرف تین قول پیش کیے ہیں (۱۶)۔ چناں چہ وہ لکھتا ہے، ''پروفیسر جیک لوربٹ (۱۷) علم فزیالوجی کا ایک مشہور عالم لکھتا ہے کہ:

''محض ان آثار ونتایج کی بنا پر جو اس وقت تک عورتوں سے صادر ہوئے ہیں ان کی طبیعت کے متعلق کوئی قطعی اور یقینی راے قایم نہیں کی جا سکتی۔ اگر عورت بھی اپنی فطری آزادی سے اسی طرح متمتع ہو، جس طرح مرد اپنی آزادی کے بالک ہیں اور عورت کو بھی اپنے عقل وشعور کی ترقی کے لیے اتنی مدت دی جائے جتنی مدت مردوں نے اپنی عقلی نشو ونما کے لیے صَرف کی ہے تو اس وقت بے شک کسی قسم کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔''

پروفیسر فرش لو لکھتا ہے کہ:

''میں نے ایک عرصے تک علم ریاضی، اخلاق اور فلسفے کی تعلیم دی ہے۔ میرے شاگردوں میں ایک بڑی تعداد عورتوں کی بھی تھی، مگر مجھ پر ہمیشہ یہی ثابت ہوا کہ مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں'' (۱۸)۔

ایک اور عالم ے تجازو، جو فزیالوجی کا پروفیسر اور اٹلی کی اکاڈیمی کا ممبر ہے، (۱۹) اپنی کتاب ''عورتوں کی فزیالوجی'' میں لکھتا ہے کہ:

''تشریحی تحقیقات کی رو سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' (۲۰)

پھر ان اقوال (۲۱) کی بنا پر یہ دعوی کیا ہے کہ:

''علم فزیالوجی (ترکیب اجسام حیوانی) کے وہ مشہور اور باعظمت علما، جو نہایت باریک نگاہ عورتوں کے مسائل پر رکھتے ہیں (۲۲) اس امر پر متفق ہیں کہ عورت تمام قواے عقلیہ میں مرد کے برابر درجہ رکھتی ہے (۲۳)۔

ان اقوال (۲۴) کو دیکھ کر ہر شخص یہی راے قایم کرے گا کہ یورپ کے مشاہیر علما عورتوں کو مردوں سے (۲۵) کسی بات میں کم نہیں سمجھتے اور قواے عقلیہ کے لحاظ سے دونوں کو ایک درجے میں رکھتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہی وہ دھوکا ہے جس میں ہندوستان کی تمام نئی

جماعت (۲۶) مبتلا ہے اور جس کی وجہ محض کوتاہ نظری اور معلومات کی کمی ہے۔ فرید وجدی نے ثابت کیا ہے کہ ان اقوال کے مقابلے میں یورپ کے مشاہیر علما کی راے اگر دیکھی جائے تو معلوم ہو جائے کہ یورپ کا قابل ترین حصہ ہرگز اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا، اس نے ان تین مصنفوں کے اقوال کے مقابلے میں بیسیوں اقوال پیش کیے ہیں اور ان لوگوں کے جو آج یورپ میں موجودہ مدنیت کے مجدد، بہترین مصنف اور فلسفۂ حسی کے مشہور عالم تسلیم کیے جاتے ہیں (۲۷)۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> ''یہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں عورتیں اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مردوں کے تسلط سے نکل کر بالکل آزاد ہو جائیں اور خود کو جسماً اور عقلاً ان کے برابر ثابت کر دیں تو ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے اور یہ افسوس اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال مضر تعلیم کے ذریعے مغرب سے مشرق کی طرف قدم بڑھا رہا ہے اور بعض نادان اور سادہ لوح اس کی ظاہری صورت پر فریفتہ ہو کر اس کے خیر مقدم کا سامان کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس فصل میں قطعی دلایل پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی مفروضہ آزادی کا خیال اور مردوں کے تسلط سے نکلنے کا خبط، محالات کے اقسام میں سے ایک قسم ہے جس کا پورا ہونا ناممکن اور محض ناممکن ہے۔ اس خیال کی کامیابی کے لیے جو شخص کوشش کرتا ہے، اس کی مثال اس مجنون کی سی ہے، جس کے سر میں قوانین قدرت کے تغیر و تبدل کا سودا سما جائے اور اپنی جہد و کوشش اس عبث اور انہونی بات کے لیے صَرف کر دے۔'' (۲۸)

اس کے بعد مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی اختلاف پر بحث کی ہے اور آخر الذکر کے طبعی ضعف کو علماے تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات سے ثابت کیا ہے۔ ہم ان تمام اقوال و آرا کا خلاصہ ترتیب وار یہاں درج کرتے ہیں (۲۹):

سب سے پہلے عورت کے جسمانی ضعف پر نظر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال لوگوں کا دعویِ مساوات کہاں تک صحیح ہے؟

(۳۰)......

۱۔علم تشریح کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کی جسمانی حالت عورت کی نسبت بہت زیادہ قوی ہے۔یہ جسمانی اختلاف محض قیاس اور ظن پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس یقینی درجے تک پہنچ چکا ہے، جس کو تسلیم نہ کرنا مشاہدات اور محسوسات کا انکار کرنا ہے۔اسی جسمانی اختلاف کی بنا پر یورپ میں بعض علمائے تشریح عورت کو موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ مرد کا حقیقی مقابل تسلیم نہیں کرتے،ان کا خیال ہے کہ عورت اس قدیم دنیا کی یادگار ہے(۳۱) جب انسان ابتدائی حالت میں تھا (۳۲) اور اس کے قوائے جسمانی وعقلی اپنے اصلی درجے تک نہیں پہنچے تھے۔انسان کی مزاحمت نے اس دنیا کو برباد کردیا اور اس زمانے کی عورتوں پر غلبہ حاصل کرلیا۔انھیں کی نسل سے یہ عورتیں ہیں۔(۳۳)

(انسائیکلو پیڈیا،لفظ ''عورت''،ص۳۰)

۲۔انیسویں صدی کی انسائیکلو پیڈیا کا مصنف لفظ ''عورت'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مرد اور عورت میں اعضائے تناسل کی ترکیب وصورت کا اختلاف اگرچہ ایک بڑا اختلاف نظر آتا ہے لیکن صرف یہی ایک اختلاف نہیں ہے۔عورت کے اور تمام اعضا سر سے پیر تک مرد کے اعضا سے مختلف ہیں، یہاں تک کہ وہ اعضا بھی جو بظاہر آخر الذکر سے بے حد مشابہ نظر آتے ہیں۔''

پھر علم تشریح کی تحقیقات کے موافق عورتوں کے اعضا پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور تمام بحث کا آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

''درحقیقت عورت کی جسمانی ترکیب،قریب قریب بچے کی جسمانی ترکیب کے واقع ہوئی ہے۔اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ بچے کی طرح عورت کا بھی حاسہ ہر قسم کے اثر سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے، بچے کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی رنج اور افسوس کا واقعہ پیش آئے تو فوراً رونے لگتا ہے، اور اگر کوئی خوشی کی بات ہو تو بے اختیار ہو کر اچھلنے کودنے لگتا ہے،قریب یہی حال عورت کا ہے کہ بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ اس قسم کے جذبات سے متاثر ہوتی ہے کیوں کہ یہ جذبات اس کے تصور پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ عقل کو ان سے لگاؤ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان میں استقلال نہیں ہوتا اور اسی لیے سخت وخوف ناک موقعوں پر عورت

ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔''

۳۔ علمی تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کی عمر کا اوسط، مرد کی عمر کے اوسط سے بارہ سینٹی میٹر کم ہے۔(۳۴) یہ فرق کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے اسی طرح متمدن ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔(۳۵)

۴۔ جس طرح عمر کے اوسط میں اختلاف پایا جاتا ہے(۳۶) اسی طرح جسم کے وزن اور ثقل میں بھی اختلاف ہے۔ مرد کے جسم کا متوسط ثقل سینتالیس کیلیو ہے۔ مگر عورت کے جسم کا متوسط ثقل بیالیس کیلیو، اور نصف سے کسی حالت میں زیادہ نہیں ہوتا یعنی عورت کے جسم کا ثقل مرد کے ثقل سے پانچ کیلیو کم ہوتا ہے۔

۵۔ عضلات کے حجم وقوت کے لحاظ سے بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ڈاکٹر ووفاری انسائکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ:

> ''مجموعی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو عورت کے جسم کے عضلات، مرد کے عضلات سے اس درجے مختلف ہیں اور حجم وقوت کے لحاظ سے اوّل الذکر کے عضلات اس قدر ضعیف ہیں کہ اگر ان کی طبعی قوت کے تین حصے کیے جائیں تو دو حصے قوت مرد کے حصے میں آئے گی اور صرف ایک حصہ قوت عورت میں ثابت ہوگی۔ عضلات کی حرکت کی سرعت اور ضبط کا بھی یہی حال ہے۔ مرد کے عضلات جسمی عورت کی نسبت حرکت میں زیادہ تیز اور اپنے فعل میں زیادہ قوی ہیں۔''

۶۔ قلب جو انسانی زندگی کا اصل مرکز ہے، اسی طرح اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ علمی تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا قلب مرد کے قلب سے ساٹھ ڈرام چھوٹا اور خفیف ہوتا ہے۔

۷۔ قوتِ تنفس کے لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں عظیم الشان اختلاف ہے۔ مرد ایک گھنٹے میں تقریباً گیارہ ڈرام کاربون ایسڈ صرف کرتا ہے اور عورت ایک گھنٹہ میں چھ ڈرام سے بھی کچھ کم صرف کرسکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی طبعی حرارت مرد سے بدرجہا کم ہے۔'' (۳۷)

(۳۸)......

یہ تمام تحقیقات اور اقوال عورت کے جسمانی ضعف کو کن قطعی دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں؟ قاسم امین بک کے دعویِ مساوات پر کس قسم کا اثر ڈالتے ہیں؟ اس کا فیصلہ ناظرین کے طبع سلیم پر چھوڑ کر، اب، ہم اس مسئلے کے دوسرے پہلو پر متوجہ ہوتے ہیں اور عورت اور مرد کا معنوی اختلاف اور اوّل الذکر کا دماغی ضعف وضاحت کے ساتھ دکھلاتے ہیں:

۱۔ مشہور اشتراکی (۳۹) فلاسفر علامہ پروڈن اپنی کتاب ابتکار النظام میں لکھتا ہے کہ:

"عورت کا وجدان، بہ مقابلہ مرد کے وجدان کے اسی قدر ضعیف ہے، جس قدر اس کی عقلی قوت مرد کی قوتِ عقلیہ کے مقابلے میں ضعیف نظر آتی ہے۔ اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قایم کرتی ہے، وہ بہ نسبت مرد کی رائے کے عموماً ناقص ہوتی ہے (۴۰)۔ پس عورت اور مرد میں عدم مساوات کوئی عارضی امر نہیں ہے، بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے۔"

۲۔ حواس خمسہ، جس پر انسان کی عقلی اور دماغی نشو و نما کا دارومدار ہے، اس میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ نیکولس اور علامہ وبیلیہ (۴۱) نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواسِ خمسہ مرد کے حواس سے ضعیف ہیں۔ (۴۲)

الف۔ عورت کی قوت شامہ کی طاقت سے یہ امر باہر ہے کہ وہ دور سے (۴۳) عطر لیموں کی خوشبو محسوس کر سکے۔ برخلاف مرد کے کہ اس کی قوتِ شامہ قوی ہے اور وہ نہایت آسانی سے محسوس کر سکتا ہے۔ (۴۴)

ب۔ اسی طرح تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت براسک ایسڈ کی بو ۱/۲۰۰۰۰ کی نسبت سے اور مرد ۱/۱۰۰۰۰ سے محسوس کر سکتا ہے جو ضعف و قوت (۴۵) کی بین دلیل ہے۔

ج۔ ذوق اور سمع کا حاسہ بھی عورت سے مرد کا بہت زیادہ قوی ہے، اس کے لیے کسی تشریحی دلیل کی ضرورت نہیں، انسائیکلوپیڈیا نے تصریح کر دی ہے کہ:

"اسی ضعف کا نتیجہ ہے کہ طعام کی عمدگی اور بدمزگی کے پہچاننے والے آواز کے پرکھنے والے، اور پیانو کے راگوں کے نقاد کل کے کل مرد ہیں۔ ایک عورت نے

بھی خود کو ان باتوں میں باکمال ثابت نہیں کیا۔"

د۔قوت لامسہ کے متعلق علامہ لومبروزو اور سیرجی وغیرہ استادوں کی متفقہ تحقیق ہے کہ عورت میں یہ قوت مرد کی نسبت بہت ضعیف پائی جاتی ہے۔ان کی محققانہ دلیل یہ ہے کہ جن آلام اور تکالیف کی عورت متحمل ہوتی ہے، مرد اس قدر نہیں ہوسکتا۔ یہ ظاہر فرق بتلا رہا ہے کہ مرد کی نسبت عورت کی قوتِ احساس ضعیف بلکہ ضعیف تر ہے۔ علامہ لومبروزو کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

"حمل اور وضع کی شدید تکالیف پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ عورت دنیا میں کیسے کیسے آلام اور مصایب کی متحمل ہوتی ہے۔اگر مرد کی طرح اس کا احساس قوی ہوتا تو ان تمام سختیوں کی کیوں کر متحمل ہوسکتی؟" (۴۶)

۳۔قوتِ ادراک کا اصلی مرکز انسان میں بھیجا ہے، اسی کی کمی اور زیادتی اور ضعف وقوت پر ادراک کی تیزی اور سستی کا دارومدار ہے، لیکن جب علم سائی کولوجیا (۴۷) کے تجارب کو پیشِ نظر رکھ کر ہم غور کرتے ہیں تو اس میں بھی عورت ضعیف تر ثابت ہوتی ہے۔علم مذکور نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے۔مرد کے بھیجے کا اوسط، عورت کے بھیجے سے سو ڈرام زیادہ ہے۔ (۴۸) اگر کوئی اس کے جواب میں کہے کہ یہ زیادتی عورت اور مرد کے جسمانی اختلاف پر مبنی ہے، تو یہ بھی غلط ہے۔ کیوں کہ یہ تحقیق ہوچکا ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اس کی جسمی حالت سے وہ نسبت رکھتی ہے جو چالیس کے عدد کو ایک سے ہوتی ہے۔مگر عورت کا بھیجا اس کی جسمانی قوت سے چوالیس اور ایک کی نسبت رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کے بھیجے کی کمی جسمانی ضعف پر مبنی ہے تو مقابلۃً یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟

(۴۹)......

اسی طرح بھیجے کے اس جوہر میں جو قوتِ ادراکی کا نقشۂ حقیقی ہے، محسوس اختلاف پایا جاتا ہے۔

قاسم امین بک......

قاسم امین بک اس تشریحی اور فزیالوجی اختلاف سے بے خبر نہ تھا۔اس نے اٹلی کے ایک

مصنف مے تجاز و کے قول سے استشہاد کر کے پہلے سے پیش بندی کر دی، وہ لکھتا ہے کہ:

''اس میں شک نہیں کہ آج کل عورت مرد سے ہر حیثیت میں کم نظر آتی ہے۔ لیکن ہم کو اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ اس کا طبعی اور خلقی ضعف ہے، یا تربیت کی خرابی اور مدت کی غلامی نے اس کو اس ادنیٰ حالت پر (۴۹/الف) پہنچا دیا ہے؟'' (۴۹/ب)

پھر مے تجازو کی رائے نقل کی ہے کہ:

''سب سے بڑا فرق جو مرد اور عورت کے دماغی قویٰ میں پایا جاتا ہے، اس کی وجہ وہ حالت غلامی ہے جس میں ایک زمانۂ دراز سے عورت محیط ہے'' (۵۰)۔

عام طبیعتیں ممکن ہے کہ اس اعتراض (۵۱) کے رعب میں آ جائیں، لیکن فرید وجدی پر اس کا جادو (۵۲) کارگر نہیں ہو سکتا۔ فزیالوجی، اور ''علم النفس والقویٰ'' (۵۳) کے محققانہ اصول اس کے پیشِ نظر تھے۔ اس نے ایک سیدھی سی بات پیش کر کے ثابت کر دیا کہ یہ اعتراض بھی مدافعت کے لیے کافی نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

''ممکن ہے کہ ایک شخص ان تمام دلایل تشریح کو دیکھ کر یہ اعتراض کرے کہ جو دماغی اختلاف تم نے ثابت کیا ہے وہ نتیجہ ہے مردوں کے تسلط، جبر، ظلم اور بے رحمی کا، ایک زمانۂ دراز سے عورتیں حالتِ غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور تہذیب و شایستگی تعلیم و تمدن سے، جو عقلی قوت کی نشو و نما کا باعث ہوتا ہے، قطعی محروم ہیں۔ اگر ان کو ایک طول طویل زمانے تک اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ مردوں کی طرح تعلیم و شایستگی حاصل کریں اور قوائے عقل کے زنگ کو دور کریں تو کیا عجب ہے کہ ان کے دماغی قویٰ ترقی کر کے مرد کے قویٰ کے مساوی ہو جائیں اور وہ ضعف جو ان دونوں جنسوں میں مابہ الامتیاز قرار دیا جاتا ہے مفقود ہو جائے، لیکن درحقیقت یہ اعتراض بھی پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکا۔'' (۵۴)

اوّل تو وہ قومیں جو ایک زمانۂ دراز سے حالتِ وحشت میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور جن کا بڑا حصہ دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہے، اس اعتراض کی غلطی پر شاہد ہیں۔ اُن میں

اگر تعلیم اور تمدّن نہیں ہے تو کسی ایک جنس ہی میں نہیں ہے، بلکہ مرد اور عورت دونوں میں نہیں ہے۔ اگر ان میں وحشت پائی جاتی ہے تو صرف عورتوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ مرد اور عورت دونوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر اگر یہ اعتراض صحیح ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ جسمانی اور دماغی فرق متمدّن ممالک کی طرح، ان میں بھی باہم پایا جاتا ہے؟ کیا افریقہ کی وحشی قوموں نے بھی عورتوں کو تعلیم اور شائستگی سے محروم کر رکھا ہے، کیا وحشت کے ساتھ ان میں بھی یہ امتیاز پایا جاتا ہے؟

دوم یہ کہ اگر یہ اختلاف مردوں کے تمدّنی مشاغل میں عدم مشارکت کا نتیجہ ہے، اور اس امر پر مبنی ہے کہ مردوں کے تسلط سے عورتوں کو آزادی نصیب نہیں ہوئی، تو سوال یہ ہے کہ وحشی اقوام میں یہ فرق کس بنا پر پایا جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ممالکِ حارّہ کے رہنے والے وحشی اقوام میں، مردوں کی طرح عورتیں بھی بالکل آزاد اور مستقل ہیں! یہاں تک کہ تمام خارجی کام بھی مثل زراعت اور آبپاشی وغیرہ کے عورتیں ہی کیا کرتی ہیں؟ پھر متمدّن ممالک کی طرح، یہ دماغی اور جسمانی اختلاف ان اقوام میں کیوں پایا جاتا ہے؟ (۵۵)

(۵۶)......

ایک عجیب بات یہ ہے کہ ادھر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی گذشتہ وحشت نے ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کو ضعیف کر دیا اور ادھر یورپ کے بعض مصنفین (۵۷) کا یہ خیال ہے کہ تمدّن کی ترقی عورت اور مرد کے طبعی اختلاف کو اور زیادہ کر رہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے:

''مرد اور عورت کا اختلاف تمدّن کی ترقی سے اور زیادہ بڑھ رہا ہے۔'' (۵۸)

حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کا جسمانی اور دماغی اختلاف، ایک طبعی اختلاف ہے، جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی، فرض کر لو کہ تشریح اور فزیالوجی کی یہ تمام دقیق بحث سر سے پیر تک غلط ہے، یہ بھی تسلیم کر لو کہ اگر اختلاف پایا بھی جاتا ہے تو صرف اسی حد تک، جس حد تک خارجی اثرات نے عورتوں کو ضعیف کر دیا ہے لیکن اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ حیوانات اور نباتات کی طبعی حالت بھی اس اختلاف کی صاف صاف شہادت دے رہی ہیں! صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک کیمسٹری کی علمی تحقیقات اور تجارب نے پتا لگایا ہے، جمادات بھی اس اختلاف سے محفوظ نہیں،

عود، خرمہ اور کیلا کے درختوں میں جہاں نراور مادہ کا امتیاز ثابت ہوا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ نر درخت کو مادہ درخت پر طبعی قوت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ حیوانات میں نر کو جو تسلط اور غلبہ اپنی مادہ پر ہوتا ہے، اس کے لیے علمی دلایل کی ضرورت نہیں، روزانہ کا مشاہدہ کافی ہے۔ نر اپنی مادہ کی خبر گیری اور حفاظت کرتا ہے، حمل کے زمانے میں اس کو آرام سے رکھتا ہے، خود پر اس کو ترجیح دیتا ہے، نسبتاً زیادہ محنت کرتا ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ مادہ سے نر کا قد و قامت عموماً زیادہ ہوتا ہے۔ تشریح نے ثابت کر دیا ہے کہ نر کے جسمانی قویٰ، خارجی اور داخلی اعضا، مادہ سے بہت زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ طب کا محققانہ اصول ہے کہ مادہ کی نسبت نر کا گوشت زیادہ قوی اور زیادہ طاقت بخش ہوتا ہے، کیا یہ تمام باتیں اس امر کا بیّن ثبوت نہیں ہیں کہ مخلوقات میں جنس اناث اور رجال کا اختلاف خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ خود فطرت نے جسم و دماغ تقسیم کرتے ہوئے عورتوں کو مردوں سے کم حصہ بخشا ہے۔ فرید وجدی نے جس قدر دلایل پیش (۵۹) کیے ہیں اگر وہ ثبوتِ دعویٰ کے لیے کافی نہ سمجھے جائیں تو ابھی اور بیسیوں اختلاف دکھلائے جا سکتے ہیں۔

فزیالوجی کا یہ مسلم اصول ہے کہ انسان کی عقلی قوت وضعف کا سرچشمہ دماغ ہے، احمقوں اور بے وقوفوں کا دماغ، مشاہیر عقلا کے دماغ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو لوگ زندگی میں احمق اور لایعقل مشہور تھے، جب ان کے دماغ کو وزن کیا گیا تو تیئیس اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا، لیکن جن لوگوں کی عقل کی تیزی، ذہن کی سرعت، خیال کی بلندی عام طور پر مسلم تھی، ان کے دماغ تولے گئے تو ساٹھ اوقیہ سے بھی وزن میں متجاوز ثابت ہوئے۔ یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلہ عورت سے کئی درجہ (۶۰) بڑھا ہوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ۴۹۱/۲ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴۔ دو سو اٹھتر مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۳۴ اوقیہ ثابت ہوا۔ لیکن جب دو سو اکانوے دماغ عورتوں کے وزن کیے گئے تو سب سے زیادہ وزنی دماغ ۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا، کیا یہ اختلاف اس امر کا بہترین ثبوت نہیں ہے کہ عورت کے عقلی قویٰ مرد کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہیں؟ (۶۱) دماغ جو قوائے عقلیہ کا اصلی مرکز ہے، جب اس کا یہ حال ہے تو پھر عورتوں کا یہ دل گردہ کہاں (۶۲) جو مردوں کی برابری کا دعویٰ کر سکیں؟ (۶۳)

لیکن آؤ، دل اور گردوں کا بھی امتحان کرلیں! فزیالوجسٹ جماعت کا اس تحقیق پر اتفاق ہے کہ مردوں کے دل کا وزن دس سے بارہ اوقیہ تک ہوتا ہے اور عورت کے دل کا وزن زیادہ سے زیادہ دس اوقیہ ورنہ عام اوسط آٹھ اوقیہ ہے۔ اس فرق کو جسمانی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ مرد کے دل کو اس کی جسمانی قوت سے، ایک اور ایک سو انسٹھ کی نسبت ہے، مگر عورت کا دل تمام جسم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو ایک کو ایک سو انتالیس سے ہوتی ہے۔

گردوں کے وزن میں مرد اور عورت اس قدر مختلف ہیں کہ سخت حیرت ہوتی ہے۔ مرد کے گردوں کا وزن چھ اوقیہ سے ساڑھے چھ اوقیہ تک تحقیق ہوا ہے، مگر عورتوں کے گردوں کا وزن زیادہ سے زیادہ نصف اوقیہ! ورنہ عموماً نصف اوقیہ سے بھی کسی قدر کم! (۶۴)

جو لوگ یورپ کی معمولی سی معمولی آواز کو بھی وحی الٰہی سمجھتے ہیں ان کے لیے قاسم امین بک کا یورپ کے دو تین قولوں کو پیش کردینا، یہ حکم رکھتا ہے کہ اس کے آگے اطاعت کا سر فوراً جھکا دیں اس لیے ان تمام رایوں کے پیش کرنے کے بعد فرید وجدی نے ان کی بھی قلعی کھول دی (۶۶) اور بتلا دیا کہ ان بے شمار اقوال کے مقابلے میں، جو آزادی کی مخالفت کر رہے ہیں، مے تجاز و اور فرش لو کی شخصی رائیں ہرگز وقعت کی نظر سے نہیں دیکھی جاسکتیں۔ چناں چہ وہ لکھتا ہے کہ:

> ''جو اقوال ہم نے (۶۶) پیش کیے ہیں وہ ان لوگوں کے ہیں جو آج یورپ میں مشاہیر فلاسفہ میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہم نے جا بجا انسائیکلو پیڈیا کے اقوال سے استشہاد کیا ہے اور انسائیکلو پیڈیا علوم عصریہ کا عطر، اور انیسویں صدی کے اعاظم اور کبار علما کی رایوں کا خلاصہ ہے، اس کے مقابلے میں مے تجاز و وغیرہ کے اقوال وہ نسبت رکھتے ہیں جو قولِ احاد کو جمہور کی رائے سے ہوتی ہے۔'' (۶۷)

عورت میں اس تمام تشریحی ضعف کے ساتھ، انفعال اور ہیجان کی قوت مرد سے بہت زیادہ ہے (۶۸) اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت کا پلہ مرد سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قوت سے بھی عورت کوئی فایدہ نہیں اٹھا سکتی۔ کیوں کہ ہیجان اور احساس کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت عقلی دایرے میں اور زیادہ ناکام ہوگئی ہے۔ چناں چہ فرید وجدی نے انسائیکلو پیڈیا سے پروفیسر وفاریٹی کا قول نقل کیا ہے (۶۹) کہ:

> ''یہ اختلاف، ان دونوں جنسوں کے ظاہری ممیزات سے بالکل مطابق ہے۔ مرد

میں زکاوفہم، اورادراک کا مادہ زیادہ ہے اورعورت میں انفعال اور ہیجان کا جذبہ بڑھا ہوا ہے۔" (۷۰)

ایک اور مشہور مصنف علامہ تروسیہ ہیجان کی زیادتی سے عورت کے طبعی ضعف پر استدلال کرتا ہے۔اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

"عورت کے عصبی ضعف کا یہ نتیجہ ہے کہ تم اس کے مزاج میں مرد کی نسبت زیادہ ہیجان پاتے ہو اور اس کی توجہ اپنے طبعی وظیفہ (۷۱) حمل، وضع اور ارضاع کی طرف اس کو مختلف قسم کی تکلیفوں اور خطروں میں ڈال دیتی ہے۔"

ابوالکلام آزاد دہلوی
ندوہ۔ لکھنؤ (۷۲)

حواشی

۱۔ دیکھو "تحریر المراۃ والمراۃ الجدیدہ۔"

۲۔ کتاب میں "پہلے حصے" کی جگہ "پہلی فصل" نے لے لی ہے۔

۳۔ کتاب میں جملہ "کسی قدر" "ایک خاص حد تک" سے بدل گیا ہے۔

۴۔ "خرابیں" کتاب میں بدل کر "خرابیاں" ہو گیا ہے۔

۵۔ عبارت "عورتوں اور مردوں...... تا...... گروہ ہیں" مختصر ہو کر کتاب میں: "عورتیں اور مرد دو مختلف گروہ ہیں" رہ گئی ہے۔

۶۔ المراۃ الجدیدہ، فصل دوم

۷۔ کتاب میں "دوسرے مسئلے کی بحث" کی جگہ "تیسری فصل" کے الفاظ ہیں۔

۸۔ کتاب میں "فرید وجدی" کے نام کی جگہ لفظ "ہماری" ہے۔

۹۔ "اس کے" کی جگہ کتاب میں لفظ "ہمارے" ہے۔

۱۰۔ شایستہ عورت کی جگہ کتاب میں صرف "عورت" ہے۔

۱۱۔ "سخت تامل" کی جگہ کتاب میں صرف "تامل" ہے۔

۱۲۔ "دوسرا مسئلہ" کے ذیل میں الف اور "ب" میں جو سوالات درج کیے ہیں، ان میں سے اس مقام پر دوسرے سوال سے بحث کی گئی ہے۔ علم تشریح کی تحقیقات کی روشنی میں عورت اور مرد کی صلاحیتوں اور خصوصیات پر الندوہ میں مضمون کی دوسری قسط کے ساتھ ساتھ یہ بحث ختم ہو جاتی ہے۔ مضمون کی تیسری قسط کا آغاز الف میں اٹھائے گئے سوال پر بحث سے ہوتا ہے۔

۱۳۔ کتاب میں "دوسرا مسئلہ" اور الف اور ب کے سوالات کے بعد سوا صفحے میں ایک تمہید بیان بھی ہے جس کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے۔ یہ تمہید عنوانِ ذیل کے ساتھ کتاب میں اس طرح ہے:

"مرد اور عورت جسمانی اور دماغی قوی میں برابر ہیں؟

سر قضا کہ در تحقیق غیب منزلیست
مستانہ اش نقاب ز رُخسارہ بر کشیم

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یورپ میں عورتیں اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مردوں کے تسلط سے نکل کر بالکل آزاد ہو جائیں اور اپنے آپ کو جسماً اور عقلاً ان کے برابر ثابت کر دیں تو ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے اور یہ افسوس اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال مضر اور ناقص تعلیم کے ذریعے مغرب سے مشرق کی طرف قدم بڑھا رہا ہے اور بعض نادان اور سادہ لوح اس کی ظاہری صورت کی مصنوعی دل فریبی پر شیفتہ و فریفتہ ہو کر اس کے خیر مقدم کا سامان کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس فصل میں علمی دلایل پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی مفروضہ آزادی کا خیال اور مساوات کا خبط محالات کے اقسام میں سے ایک ایسی قسم ہے، جس کی طرف صرف اس شخص کا ذہن منتقل ہو سکتا ہے، جو حواس کی دولت برباد کر چکا ہو اور دیوانگی اور جنون کے دیو کا رُعب اس کے دماغ کو معطل کر چکا ہو۔ ہم یورپ کے مشاہیر عقلا اور سر برآوردہ علما کی سائن ٹی فک رائیں نقل کر کے بتلانا چاہتے ہیں کو جو شخص اس خیال کی کامیابی کے لیے کوشش کرتا ہے، اس کی مثال بعینہٖ اس مجنون کی سی ہے، جس کے سر میں قوانینِ قدرت کے تغیر و تبدل کا سودا سما جائے اور وہ اپنی قیمتی جہد و کوشش اس اَن ہونی اور عبث بات کے لیے صرف کر دے۔ (مسلمان عورت: ص ۳۱، ۳۲)

اس تمہید کے بعد ''قاسم امین بک نے......'' سے مضمون الندوہ اور کتاب کا یکساں ہو جاتا ہے۔

''اس مضمون میں بار بار یورپین مصنفوں کے نام آئیں گے اور ان کا لہجہ اور تلفظ متغیر ہو گا لیکن ہم مجبور ہیں، فرنچ اور جرمنی وغیرہ ناموں کی تصحیح آسانی سے نہیں ہو سکتی اور نہ ایک معمولی مضمون کے لیے تصحیح میں غیر معمولی اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ عربی خراد پر چڑھ کر جو صورت ناموں نے اختیار کر لی ہے بغیر کسی تغیر و تبدل کے ہم درج کر دیتے ہیں، اصلی غرض محض مطلب سے ہے اور اس پر ناموں کی اس خفیف غلطی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

۱۴۔ کتاب میں یہ جملہ ''اور تجارب'' کے اضافے کے ساتھ اس طرح ہے ''فزیالوجی کی تحقیقات اور تجارب نے......''

۱۵۔ ان تین سطور کی عبارت نے کئی تبدیلیوں اور اضافوں کے بعد کتاب میں یہ شکل اختیار کر لی ہے: ''بلکہ جب کبھی عورتوں کی آزادی کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو فریق مخالف کی طرف سے عموماً یہی دعویٰ پر زور لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہمارا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ اس دعوے کی قطعی صداقت کا فیصلہ کر دیں۔'' (مسلمان عورت: ص ۳۲)

۱۶۔ کتاب میں صرف دو قول پیش کیے ہیں۔

۱۷۔ اس مقام پر مولانا آزاد نے پروفیسر جیک لوربٹ کا نام اور اس کی تحقیق کا حوالہ کتاب میں حذف کر دیا ہے۔

۱۸۔ پروفیسر فرش لو کے قول میں جملہ ’’مگر مجھ پر...... تا...... فرق نہیں۔‘‘ اس طرح بدل گیا ہے ’’مگر میں نے تعلیمی ترقی کے لحاظ سے عورتوں میں کسی قسم کا دماغی ضعف نہیں پایا اور مجھ پر ہمیشہ یہی ثابت ہوا کہ مرد اور عورت کے دماغی قویٰ میں ذرہ بھر فرق نہیں ہے۔‘‘ (مسلمان عورت: ص ۳۳)

۱۹۔ کتاب میں ’’سے تجاوز‘‘ کے تعارف کے جملے حذف کر دیے ہیں۔

۲۰۔ اس اقتباس میں ’’کوئی فرق نہیں‘‘ کی جگہ ’’کسی قسم کا فرق ثابت نہیں ہوتا ہے۔‘‘ اس اقتباس کے خاتمے پر یہ حوالہ ہے: ’’دیکھو: المرأۃ الجدیدہ: قاسم امین بک‘‘

۲۱۔ کتاب میں ’’ان اقوال‘‘ کی جگہ ’’ان دونوں راؤں‘‘ ہے۔

۲۲۔ کتاب میں یہ عبارت ’’عورتوں کے مسایل پر رکھتے ہیں‘‘ کی جگہ اس طرح ہے: ’’عورتوں کی جسمانی اور دماغی حالت پر رکھتے ہیں۔‘‘

۲۳۔ المرأۃ الجدیدہ

۲۴۔ کتاب میں ’’اقوال اور دعاوی......‘‘ ہے۔

۲۵۔ کتاب میں ’’عورتوں کو مردوں سے‘‘ کی جگہ ’’عورت کو مرد سے‘‘ بنا دیا ہے۔

۲۶۔ کتاب میں ’’تمام نئی جماعت‘‘ کو ’’ہر نئی جماعت‘‘ سے بدل دیا گیا ہے۔

۲۷۔ کتاب کی اس عبارت: ’’فرید وجدی نے...... تا...... کیے جاتے ہیں۔‘‘ بڑی تبدیلی ہوگئی ہے۔ اب وہ اس طرح ہے: ’’اگر دو راؤں کے مقابلے میں یورپ کے محقق علما کی رائیں دیکھی جائیں تو معلوم ہو جائے کہ یورپ کا فاضل ترین حصہ ہرگز اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا، ہم ان دو قولوں کے مقابلے میں بیسیوں اقوال پیش کریں گے اور ان لوگوں کے جو آج یورپ میں موجودہ مدنیت کے مجدد، بہترین مصنف اور فلسفہ حسی کے جلیل القدر عالم تسلیم کیے جاتے ہیں۔‘‘

۲۸۔ المرأۃ المسلمہ: فصل سوم ص ۳۰

۲۹۔ گذشتہ اقتباس سے پہلے جملہ ’’چناں چہ وہ لکھتا ہے‘‘ سے لے کر ’’یہاں درج کرتے ہیں‘‘ تک کی کل عبارت کتاب میں حذف کر دی گئی ہے۔

۳۰۔ اس مقام پر ’’(ا) علم تشریح کی......‘‘ کے اوپر ’’عورت کا جسمانی ضعف‘‘ سب ہیڈنگ ہے۔

۳۱۔ عورت اس قدیم دنیا کی یادگار ہے۔‘‘ کتاب میں اس جملے کو ’’عورت اس قدیم مخلوق کی یادگار ہے‘‘ بنا دیا گیا ہے۔

۳۲۔ ''اس مقام پر یہ جملہ'' جب انسان ابتدائی حالت میں تھا'' حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ یہ جملہ اضافہ کیا گیا ہے: ''جو ترکیبِ جسمانی اور خلقی کم زوری میں اس کے مشابہ تھا۔''

۳۳۔ اس جگہ کی عبارت: ''انسان کی مزاحمت......تا...... یہ عورتیں ہیں'' کتاب میں اس طرح بدلی گئی ہے: ''انسان کی مزاحمت نے اس مخلوق کو فنا کر دیا اور اس کی عورتوں میں غلبہ حاصل کر لیا۔ اسی کی نسل سے موجودہ دور کی عورتیں پیدا ہوئیں۔'' (مسلمان عورت: ص ۳۴)

۳۴۔ کتاب میں یہ امتیاز عورت کے قد کے بارے میں ہے، نہ کہ عمر کے بارے میں! کتاب میں یہ بیان اس طرح ہے: ''علمی تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے قد کا اوسط طول مرد کے قد کی اوسط درازی سے بارہ سینٹی میٹر کم ہے۔'' یہی درست بھی ہے۔ الندوہ میں کتابت کی غلطی ہوگئی تھی۔ کتاب میں درست کر دیا گیا ہے۔

۳۵۔ اس مقام پر یعنی (۳) کے آخر میں کتاب میں یہ جملہ زیادہ ہے: ''اور جوانوں کی طرح بچے بھی اس اختلاف کی شہادت دیتے ہیں۔''

۳۶۔ اوپر کے پیراگراف (۳) میں قد کی جگہ ''عمر'' درج ہوگیا ہے۔ اسی خیال کے مطابق پیراگراف (۴) میں بھی کاتب کے قلم سے ''عمر'' نکلا۔ حال آں کہ سیاق وسباق کا صاف اشارہ ہے کہ یہ ''قد'' کی مثال کا موقع ہے۔ یہ غلطی کتاب کے متن میں بھی درست ہونے سے رہ گئی۔

۳۷۔ اس بحث میں ''قوت تنفس'' اور ''طبعی حرارت'' کی جگہ کتاب میں ''سرعتِ تنفس'' اور ''حرارتِ غریزی'' کی طبعی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور پہلے جملے میں دعوے کے ثبوت میں کافی وضاحت اور استدلال سے کام لیا ہے۔ کتاب میں یہ مکمل بیان اس طرح ہے: ''سرعتِ تنفس کے لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں عظیم الشان اختلاف ہے۔ علمی تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سانس کے ذریعے سے کاربونک ایسڈ کے جوذرات باہر آتے ہیں، وہ اندرونی حرارت کی گرمی سے بخارات بن کر سانس میں ملے ہوئے نکلتے ہیں۔ اس تجربے کی بنا پر تحقیق کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مرد ایک گھنٹے میں تقریباً گیارہ ڈرام کاربون کی مقدار جلا دیتا ہے، مگر عورت چھ ڈرام سے کچھ زاید جلاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی حرارت غریزی بھی مرد کے مقابلے میں بہت کم یا نصف سے کچھ ہی زاید ہے۔''

۳۸۔ اس مقام پر قوت تنفس پیراگراف (۷۔ کی بحث کے بعد کے دماغی ضعف کی بحث کے شروع میں کتاب میں ''عورت کا دماغی ضعف'' کی ذیلی سرخی ہے۔

۳۹۔ کتاب میں ''اشتراکی'' کے لیے مولانا آزاد نے ''نہلسٹ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

۴۰۔ کتاب میں یہ جملہ ''وہ بہ نسبت......تا......ناقص ہوتی ہے۔'' اس طرح ہے: ''وہ مردوں کی رائے سے مطابق نہیں ہوتی۔''

۴۱۔ کتاب میں اس محقق کا نام ''بیلی'' استعمال ہوا ہے۔

۴۲۔ کتاب میں جملہ ''ضعیف تر'' ہے۔

۴۳۔ کتاب میں ''دور سے'' کی بجائے ''ایک خاص فاصلے سے'' ہے۔

۴۴۔ الف کے تحت آخری جملہ کتاب میں اس طرح بن گیا ہے: ''......اس کی قوت شامہ اس قدر قوی ہے کہ وہ اس درجے کی خوشبو کو آسانی سے محسوس کر لیتا ہے، جس سے دو چند مقدار کی خوش بوسے عورت کو احساس ہوسکتا ہے۔''

۴۵۔ ''ب'' کی ضمنی عبارت کے آخری جملے میں ''ضعف وقوت'' سے کتاب میں ''وقوت'' حذف کر دیا گیا ہے۔

۴۶۔ اس اقتباس میں کتاب کی عبارت میں ذیل کی چند سطور زیادہ ہیں: ''درحقیقت نوع انسان کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے اس کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے۔ ورنہ بنی نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی۔''

۴۷۔ سائی کولوجیا کا عربی ترجمہ مصنف نے ''علم النفس بالتجارب'' کیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس سے انسان کے نفس اور دماغ کی اصلی ہیئت معلوم ہوتی ہے۔'' (دیکھو: چمبرز ڈکشنری: ص ۴۰۵)

۴۸۔ مصنف نے دماغی اختلاف پر بحث کرتے ہوئے دماغ کے وزن اور مخیخ کے اختلاف پر قصداً یا سہواً توجہ نہیں کی۔ حال آنکہ عورتوں کے عقلی ضعف کی بنا اسی اختلاف پر ہے۔ دماغ کے وزن کا اختلاف ہم آگے چل کر دکھلائیں گے لیکن بھیجے کی بحث میں مخیخ کے اختلاف کو جگہ دینی ضروری ہے۔ اصطلاح تشریح میں دماغ کے آخری حصے کو مخیخ کہتے ہیں۔ مرد کے دماغ میں بھیجے کے ساتھ مخیخ کی نسبت (۱) اور (۸۴/۷) کی ثابت ہوئی ہے مگر عورتوں کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ (۱) اور (۸۱/۲) کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مخیخ دماغ کے ان اجزا میں سے ہے جن کی مقدار کی زیادتی پر عقل اور فکر کی تیزی اور عمدگی کا دارومدار ہے۔ (دیکھو: التوضیح فی اصول التشریح، ص ۴۲۲)

۴۹۔ اس مقام پر کتاب میں یہ مضمون زیادہ ہے:

(۴) ''علاوہ اس کے عورت کے سر کے بھیجے میں خم و پیچ نہایت کم ہیں اور اس کے پردوں کا نظام

بھی نامکمل ہے۔علماے سائی کولوجی نے اس اختلاف کو ان دونوں جنسوں کے ممیزات میں ایک اہم اُمر قرار دیا ہے۔''

(۵) اسی طرح مرد اور عورت کے بھیجوں کے جوہر سنجابی میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔جوہر سنجابی قوت ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے۔اس لیے یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے۔

ایک اعتراض اوراس کا جواب:

ممکن ہے کہ ایک شخص ان تمام تشریحی دلایل کو دیکھ کر یہ اعتراض کرے کہ جو دماغی اختلاف تم نے ثابت کیا ہے، وہ نتیجہ ہے مردوں کے تسلط، جبر، ظلم اور بے رحمی کا! ایک زمانۂ دراز سے عورتیں غلامی میں زندگی بسر کررہی ہیں اور تہذیب وشایستگی تعلیم وتمدن سے (جو عقلی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں) قطعی محروم ہیں۔اگر ان کو ایک طول طویل زمانے تک اس امر کا موقع دیا جائے کہ مردوں کی طرح تعلیم وشایستگی حاصل کریں اور قواے عقلی کے زنگ کو دور کریں تو کیا عجب ہے کہ ان کے دماغی قویٰ ترقی کر کے مرد کے قویٰ کے مساوی ہوجائیں اور وہ ضعف جو ان دونوں جنسوں میں مابہ الامتیاز قرار دیا جاتا ہے، مفقود ہوجائے۔(مسلمان عورت: ص۴۰، ۴۱)

۴۹/الف۔ ''حالت پر'' کی جگہ کتاب میں ''حالت تک'' ہے۔

۴۹/ب۔ اس مقام پر کتاب میں ذیل کی عبارت زیادہ ہے:

''پھر یورپ کے دو مصنفوں کے اقوال سے استشہاد کیا ہے۔چنانچہ لاربٹ پروفیسر فزیالوجی لکھتا ہے:

محض ان آثار اور نتائج کی بنا پر، جو اس وقت تک عورت کے متعلق دریافت ہوئے ہیں، اس کی طبیعت کے متعلق کوئی قطعی رائے قایم نہیں کی جاسکتی ہے۔اگر عورت بھی اپنی فطری آزادی سے اسی طرح متمتع ہو جس طرح مرد اپنی آزادی کے مالک ہیں، اور عورت کو بھی اپنے عقل وشعور کی ترقی کے لیے اتنی مدت دی جائے جتنی مدت مرد نے اپنی عقلی نشوونما کے لیے صرف کی ہے تو اس وقت بے شک کسی قسم کا صحیح فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔''

۵۰۔ المرأۃ الجدیدہ: قاسم امین بک، فصل چہارم۔کتاب میں ''عورت محیط ہے'' کی جگہ ''عورت گرفتار ہے'' بنادیا گیا ہے۔

۵۱۔ کتاب میں ''اِس اعتراض'' کی جگہ ''اِن اقوال'' نے لے لی ہے۔

۵۲۔ ''فرید وجدی پر اس کا جادو'' کی جگہ ''ہم پر ان کا جادو'' کے جملے نے لے لی ہے۔

۵۳۔ ''علم النفس والقویٰ'' کی جگہ کتاب میں ''سائی کالوجی'' کی معروف اصطلاح نے لے لی ہے۔

۵۴۔ یہ پورا اقتباس ''کافی نہیں'' کے بعد سے ''نہیں پہنچ سکا'' تک کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۵۵۔ المراۃ المسلمہ: فصل سوم، ص۳۴و۳۶

۵۶۔ اس مقام پر پروفیسر دوفاریٹی کی رائے کا مندرجہ ذیل حوالہ کتاب میں اضافہ ہے:

''انسائیکلوپیڈیا بھی اس رائے میں ہم سے متفق ہے۔ اس کا فاضل ایڈیٹر پروفیسر دوفارینی لکھتا ہے:

جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدّن شہر کے شایستہ باشندوں میں نظر آتا ہے، بعینہٖ اسی طرح امریکہ کی وحشی ترین اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔''

۵۷۔ کتاب میں ''مصنفین'' کے ساتھ ''عقلاً'' کا اضافہ بھی کر دیا ہے یعنی ''مصنفین اور عقلاً''

۵۸۔ کتاب میں انسائیکلوپیڈیا کا یہ حوالہ زیادہ مفصل اور اس طرح ہے:

''پروفیسر ددوفارینی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے:

تمدّن کے بڑھنے کے ساتھ ہی قدرتی اختلاف کی وضاحت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ چناں چہ گوری رنگت کے مردوں اور عورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے، وہ سیاہ فام رنگت کے وحشی مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاف سے کئی درجہ بڑھا ہوا ہے۔'' (فصل سوم، ص۳۷)

۵۹۔ ''فرید وجدی نے جس قدر دلایل......'' کی جگہ کتاب میں جملہ اس طرح ہے: ''گذشتہ صفحات میں جو دلایل......''

۶۰۔ ''کئی درجے'' کی جگہ کتاب میں ''بدرجہا'' ہے۔

۶۱۔ اس جملے میں ''عورت'' اور ''مرد'' کے الفاظ واحد استعمال ہوئے ہیں۔ کتاب میں انھیں بہ صیغۂ جمع ''عورتوں'' اور ''مردوں'' استعمال کیا گیا ہے۔

۶۲۔ ''عورتوں کا یہ دل گردہ کہاں جو مردوں کی......'' کتاب میں اس طرح ہے: ''عورتوں کا یہ دل گردہ کہاں کہ وہ مردوں کی......''

۶۳۔ (التوضیح فی اصول التشریح ص ۴۰۷) کتاب مذکور ڈاکٹر ''یوحنا ورتبٹ'' پروفیسر تشریح وفزیالوجی کی مستند تصنیف ہے، جدید تشریح میں اس سے بہتر کوئی کتاب عربی میں نہیں لکھی گئی۔ پہلی مرتبہ مصر میں چھپی، پھر ترمیم و تہذیب کے بعد بیروت سے شایع ہوئی، بیروت کا ایڈیشن پیشِ نظر ہے۔

۶۴۔ کتاب میں ان دونوں پیراگرافوں کو ''لیکن آہ! دل اور گردوں......تا......کسی قدر کم!'' اور اس کا حوالہ ''التوضیح والتشریح، ص ۴۰۷''، حذف کر دیا گیا ہے۔

۶۵۔ ''فرید وجدی نے ان کی بھی قلعی کھول دی'' کتاب میں یہ جملہ اس طرح تبدیل ہو گیا ہے: ''ہم ان کی بھی قلعی کھول دیتے ہیں۔''

اس جملے کے بعد کی عبارت ''اور بتلا دیا ہے۔۔۔۔۔۔تا۔۔۔۔۔۔کر رہے ہیں۔'' کتاب میں حذف کر دی گئی ہے۔

۶۶۔ کتاب میں جملہ اس طرح ہے: ''ہم نے جو اقوال۔۔۔۔۔۔''

۶۷۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۱۷

۶۸۔ اس مقام پر کتاب میں یہ جملہ زیادہ ہے: ''اس کے دماغ میں احساس اور تہیج کے مرکز مرد کے دماغ کی نسبت زیادہ بہتر ترکیب رکھتے ہیں۔''

۶۹۔ کتاب میں یہ جملہ ''چناں چہ فرید وجدی:۔۔۔۔۔۔تا۔۔۔۔۔۔نقل کیا ہے۔'' اس طرح ہے: ''انسائی کلوپیڈیا میں پروفیسر ووفارینی لکھتا ہے۔''

۷۰۔ المرأۃ المسلمہ: ۳۶

۷۱۔ ''طبعی وظیفہ'' کی جگہ کتاب میں ''طبعی فرائض'' جملہ استعمال ہوا ہے۔

۷۲۔ اس مقام پر ''المرأۃ المسلمہ'' کی دوسری قسط مطبوعہ الندوہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۵ء ختم ہو جاتی ہے۔

اَلمراۃُ المُسلمَہ

(۳)

رازِ درونِ پردہ، ز رندانِ مست پُرس
کین حال نیست صوفی عالی مقام را!

ارادہ نہیں تھا کہ اس ریویو کو رسالے کی حد تک پہنچا دیا جائے، لیکن بحث بڑھ گئی اور زیادہ کارآمد حصہ رہ گیا، اس لیے تیسرا نمبر پیش کر کے یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

دوسری بحث کے ہم نے دو حصے کیے تھے:

(الف) عورتوں کو اس وقت تک تعلیم سے محروم رکھا گیا، اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں علمی ترقی کی صلاحیت نہیں۔(۱)

(ب) آج یورپ کی جدید تشریحی تحقیقات اور علم فزیالوجی نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت ہر حیثیت سے برابر ہیں۔

آزادیٔ نسواں کی حامی پارٹی نے اس وقت تک جس قدر دلایل جمع کیے ہیں، اگر ان کی تحلیل کی جائے تو آخر میں صرف یہی عروۃ الوثقیٰ دلیل رہ جائے گی، جو اوپر کی دو سطروں میں محدود کر دی گئی ہے۔

اگر تمھارے دوستوں میں کوئی شخص پردے کا مخالف اور آزادی کا حامی ہے، اگر اس خیال کے کسی نوجوان سے تم کو گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے، تو اچھی طرح یاد کرو! بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ہوگا کہ یورپ کی نئی تحقیقات نے مرد اور عورت کو جسمی اور عقلی قوت کی ایک سطح پر پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا ہے۔ اس نے نہایت جوش میں بے باکانہ کہا ہوگا کہ مشرق کا یہ قدیم ظالمانہ خیال ہے کہ عورت مرد کی برابری نہیں کر سکتی، مگر آج یورپ نے اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیا اور

عورت کی اصلی صورت دنیا کو دکھلا دی۔اس نے بہت دیر تک مؤثر اور ہنگامہ خیز تقریر کی ہوگی، لیکن اس دعوے کے مرکز سے ایک انچ بھر نہ ہٹا ہوگا۔اس کی تمام تقریر سے اور تمام دلیلیں، ایک تشریح طلب عبارت ہوگی، جس کی تفسیر میں وہ کئی گھنٹے سرگرم سخن رہا ہوگا۔قاسم امین بک نے جب اس عنوان پر قلم اٹھایا، تو اس مرکز سے ہٹنے کی جرأت نہ کر سکا۔المرأۃ الجدیدہ اور تحریر المرأۃ کی سیر کرو! جہاں کہیں مساویانہ حقوق کی فریاد ہے، اسی دلیل کے بل پر ہے۔یہی وہ دعویٰ ہے، جس کے آگے پردے کی حامی جماعت دم بخود ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔مذہب کا زور دکھلایا جاتا ہے تو وہ بھی ناکام ہو کر الگ ہو جاتا ہے۔یورپ کا قول اور حال زبان کی بے خبری نے چھپا دیا، اس لیے اتنی قوت نہیں کہ جستجو کی کوشش کریں اور دعوے کی صداقت کا سراغ لگائیں۔

لیکن فرید وجدی (۲) پر اس دعوے کا جادو اسی طرح ناکام رہا جس طرح مذہب کا معجزہ مخاطب جماعت کے لیے بے سود تھا۔متعدد زبانوں کی واقفیت اور مذاق نے یورپ کا ذرہ ذرہ آئینہ کر دیا تھا، (۳) اس لیے جو کچھ مطلب کا دیکھا پیش کر دیا۔

گذشتہ نمبر (۴) میں ہم نے اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔کیا ممکن ہے کہ اس کے پیش کر دینے کے بعد بھی اس دعوے کا طلسم ٹوٹ کر ''ہباءً منثورا'' نہ ہو جائے؟ کہا جاتا ہے کہ یورپ نے مشرق کے قدیم پردۂ غفلت کو چاک کر دیا، لیکن گذشتہ نمبر (۵) اپنے سامنے رکھ لو اور منصفانہ کہو کہ کیا فرید وجدی (۶) نے مخالف پارٹی کے تیس برس کے پردۂ فریب کو چاک نہیں کر دیا؟ علم تشریح، فزیالوجی، اور سائی کالوجی کے جلیل القدر علما نے یورپ کے جو اقوال پیش کیے ہیں، کیا ان کے مقابلے میں کسی کی جرأت ہے کہ پھر اس دعوے کا اعادہ کر سکے؟ کیا ان اقوال کے پیش کرنے کے بعد (۷) بھی اس دعوے میں کچھ جان باقی ہے؟ اگر ہے تو آؤ آج اس کا بھی فیصلہ کر دیں۔

ہمارے دوستوں کو آزادی کا شور مچاتے ہوئے کامل ایک قرن گزر گیا، لیکن اس عرصے میں کسی تعلیم یافتہ شخص نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یورپ کی منتخب جماعت کی آواز کہاں تک ان کی تائید کرتی ہے؟ ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ کی عام علمی معلومات سے قاسم امین بک کا دایرہ علم بہت زیادہ وسیع ہے لیکن گذشتہ نمبر (۸) پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد کیا تم پر حیرت طاری نہیں ہو جاتی کہ جمہور کی اس بلند آواز سے کیوں کر اس باخبر شخص کی قوت سامعہ بے خبر رہی؟ یہ حیرت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔جب تم دیکھو گے کہ تشریحی اور فزیالوجی تحقیقات کے علاوہ عورت کے قدرتی

فرایض کے متعلق، اعاظم اور کبار علماے یورپ کی کیا راے ہے؟ کس طرح وہ عورتوں کو فطرۃً فرایض منزلی کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں اور کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کا اپنے قدرتی فرایض کے باہر قدم نکالنا، دنیا کی تباہی ہے، تمدّن کی بربادی ہے اور معاشرت کے لیے خوف ناک شگون ہے۔

قاسم امین بک نے اس دعوے کو جن اقوالِ ثلاثہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ پچھلے نمبر (۹) میں تمھاری نظروں سے گزر چکے ہیں، لیکن ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ دھوکا دینے والی عبارت میں یہ خیال ظاہر کیا ہے اور دعویٰ کر دیا ہے کہ یورپ کی تمام علمی جماعت یا تو عورتوں کی موجودہ حریت پر قانع ہے یا موجودہ آزادی سے بھی زیادہ آزادی کی خواست گار ہے لیکن ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو آزادی کا مخالف ہو۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

> ''اسی بنا پر یورپ اور امریکہ میں جو لوگ انسانی ترقی کے طالب ہیں اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ عورت جس آزادی اور استقلال کے درجے تک پہنچ چکی ہے، اس سے بھی اور زیادہ درجۂ کمال (۱۰) کی طرف ترقی کرے۔ ان کی اصلی غرض دنیا کی اس قدیم جہالت پر جہاد کرنے کی یہ ہے کہ انسان کی یہ دونوں جنسیں ایک نظر سے دیکھی جائیں اور ان میں باہم کوئی فرق باقی نہ رہے چناں چہ آج کل یورپ اور امریکہ میں دو جماعتیں ہیں، جو اس مسئلے کے متعلق دو مختلف رائیں رکھتی ہیں۔
>
> پہلی جماعت اس آزادی اور حریت کو عورتوں کے لیے کافی سمجھتی ہے جو مغربی عورتوں نے اس زمانے میں حاصل کر لی ہے۔
>
> دوسری جماعت موجودہ حالت پر اکتفا نہیں کرتی اور اس سے زیادہ بہتر حالت کی طلب گار ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ عورتیں یہاں تک ترقی کریں کہ ان میں اور مردوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔'' (۱۱)

فرید وجدی اس کے جواب میں کہتا ہے کہ (۱۲) صرف اس قدر کہہ دینا کافی نہیں! ان لوگوں کے نام پیش کرنا چاہیے (۱۳) جو موجودہ آزادی پر قانع، یا کلی مساوات کے طلب گار ہیں کیوں کہ جو جماعت علم و فضل کے لحاظ سے آج یورپ میں اعلیٰ درجے کی جماعت تسلیم کی جاتی ہے

ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ مساوات کا خواست گار ہونا ایک طرف، وہ موجودہ آزادی کو ایک خوف ناک تمدّنی مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر یہ اصول پیش کیا ہے کہ اگر ایک شخص کسی خاص ملک کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ وہاں کے لوگ فلاں خیال یا عقیدے کو تسلیم نہیں کرتے اور مخاطب کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہو تو اس کا فیصلہ بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ اس ملک کے اعاظم اور جلیل القدر علما کی رائیں جمع کی جائیں اور دیکھا جائے کہ وہ رائیں اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں یا وہ خیال ان میں بالکل نہیں پایا جاتا؟

ہم نے اسی اصول کو پیشِ نظر رکھا اور مشاہیر علمائے یورپ کی تصنیفات کی ورق گردانی کی۔ ہم پر ثابت ہوا کہ ان کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ ہم نے انسائیکلوپیڈیا کے اقوال پیش کیے جو علوم عصریہ اور علمائے یورپ کی رائیوں (۱۴) کا خلاصہ ہے۔ ہم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اجوسٹ کونٹ (۱۵) پروڈن، ژول سیمان، جیسے رؤسائے فلسفہ اور مستند علما کی شہادتیں نقل کیں جو آج یورپ میں آسمان علم کے آفتاب سمجھے جاتے ہیں۔

قاسم امین بک لکھتا ہے کہ یورپ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عورتوں کی موجودہ آزادی پر قناعت نہیں کرتے اور کلی آزادی کے طالب ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ صرف اس مسئلے پر موقوف نہیں۔ یورپ تو دنیا بھر کے متضاد اور عجیب وغریب خیالات کا مخزن ہے۔ یورپ میں وہ لوگ بھی ہیں جو مذہب کے قدیم سلسلے کے مخالف ہیں، وہ بھی ہیں جو اباحتِ عامہ کے قایل ہیں اور ہر قسم کی انسانی خواہشوں اور ارادوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو تمدّن و معاشرت کی تمام شاخوں (۱۶) کو فضول سمجھتے ہیں اور نظامِ حکومت کے دشمن ہیں۔ وہ بھی ہیں جو روحانیت کے خیال کو ایک خبط اور دحشت بتلاتے ہیں، تو کیا اہل مشرق پر واجب ہے کہ ہر قسم کی آواز جو سرزمین مغرب سے بلند ہو یا یورپ کی طرف منسوب ہو۔ اس کے آگے اطاعت اور تسلیم کا سر جھکا دیں؟ یورپ میں ہر خیال کے لوگ موجود ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون سی جماعت علم وفضل کے لحاظ سے سر برآوردہ اور قابلِ اعتماد واستناد سمجھی جاتی ہے، کس گروہ کا قول علم اور عقل کے معیار پر ٹھیک اترتا ہے؟ ہم نے ان لوگوں کے اقوال منتخب کیے ہیں جن کو ملک نے موجودہ مدنیت کے مجدد، فلسفہ حسی کے افضل ترین عالم اور علوم عصریہ کے اعلیٰ ترین معلّم تسلیم کرلیا ہے۔ جن کا قول علم وعقل کے موافق

ہے۔ ان کے مقابلے میں اگر چند غیر مستند لوگوں کے اقوال پیش بھی کیے جائیں تو ان کا کوئی اثر ہماری طبیعت قبول نہیں کرسکتی (۱۷)۔

اس کے بعد متعدد فصلوں میں عورتوں کے طبعی فرائض کے متعلق علمائے یورپ کے بے شمار اقوال نقل کیے ہیں اور اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر ان سے استدلال کیا ہے۔ جا بجا نہایت مفید اور کارآمد نتائج نکالے ہیں اور اوّل سے آخر تک طبیعی اصول پر بحث کی ہے۔ ہم ایک خاص ترتیب سے (جس کی طوالت کا یہ ریویو متحمل ہوسکتا ہے) بعض سربرآوردہ مصنفوں کے اقوال یہاں درج کرتے ہیں۔ ہمارے آرٹیکل کا یہ حصہ آخری اور اس لیے نہایت اہم ہے، مناظرین اس کی اہمیت کو نظرِ اغماض سے نہ دیکھیں۔ (۱۸)

(۱۹)......

قدرت نے نظام تمدّن کے دو حصے کر دیے ہیں، فرائض منزلی اور فرائض تمدّنی۔ پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا اور اس کو ''ربۃ العائلہ'' بنایا۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا اور اس کو تمدّنی مملکت کا تاج دار بنایا۔ اس لیے درحقیقت قدرت نے مرد اور عورت کو دو علیحدہ جنسوں میں منقسم نہیں کیا ہے بلکہ انسانی ضرورتوں پر نظر رکھتے ہوئے، دونوں کی مجموعی طاقت کو شخص کامل کی صورت میں مخلوق کیا ہے۔ مرد میں بذاتہ متعدد نقص ہیں جو کامل نہیں ہوسکتے، اگر عورت شریک حال نہ ہو۔ اسی طرح عورت میں بہت سے نقص ہیں جو مکمل نہیں ہوسکتے اگر مرد اس کی اعانت سے دست بردار ہو جائے۔ اس بنا پر مرد اور عورت عبارت ہیں ایک نوع کامل سے جن کی کوشش اور فرائض کی انجام دہی سے نظام تمدّن قایم ہے۔ جو لوگ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ عورت کو درجۂ استقلال حاصل ہو جائے، ان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو آکسیجن اور ہیڈروجن کی مجموعی طاقت کو ضایع کرنا چاہے اور اس خبط میں مبتلا ہو کہ ان میں سے کوئی ایک عنصر مستقل ہو جائے۔ حال آں کہ اس کو معلوم ہے کہ پانی عبارت ہے ان دونوں کی ترکیبی اور مجموعی قوت سے۔ اگر یہ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک عنصر دوسرے عنصر کی اعانت سے مستغنی ہو کر درجۂ استقلال حاصل کرے اور پانی کی طبعی تکوین میں بھی فرق نہ آئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ عورت، مرد کے مشاغل میں شریک ہو جائے اور نظام تمدّن بھی متزلزل نہ ہو، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ایسا ہونا محال قطعی ہے۔ جس طرح ہیڈروجن کے مقابلے میں آکسیجن ثقل میں زیادہ ہے اسی طرح عورت

کے مقابلے میں مرد کی جنسی اور دماغی قوت زیادہ ہے۔ جس طرح ہیڈروجن کے ثقل کی زیادتی، پانی کی طبعی تکوین کی مخالف ہے، بعینہ اسی طرح عورت کا استقلال نظام تمدن اور معاشرت کی تشکیل کے لیے سم قاتل ہے۔

علوم مادیہ کا افضل ترین عالم یورپ کا سربرآوردہ مصنف ژول سیمان اپنے ایک مضمون میں، جو ریویو آف ریویوز میں شایع ہوا تھا، لکھتا ہے:

> ''عورت کو چاہیے کہ عورت رہے۔ ہاں! بے شک! عورت کو چاہیے کہ عورت رہے۔ اسی میں اس کے لیے فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے، جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے اور قدرت کی یہ ہدایت ہے۔ اس لیے جس قدر عورت اس سے قریب ہوگی اس کی حقیقی قدرومنزلت بڑھے گی اور جس قدر دور ہوگی، اس کے مصایب ترقی کریں گے۔ بعض فلاسفر انسانی زندگی کو مکروہ اور پاکیزگی سے خالی سمجھتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی دل فریب، پاک اور بے حد پاکیزہ ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت اپنے ان مدارج سے واقف ہو جائے جو قدرت نے اس کے لیے قرار دیے ہیں اور اپنے ان فرایض کو ادا کرے، جو قدرت نے اس کے متعلق کر دیے ہیں۔''

تم کو حیرت ہوگی کہ یہ عظیم الشان فلاسفر عورت رہنے کی کیوں تعلیم دیتا ہے؟ حال آں کہ کوئی عورت اپنے جنسی دایرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ عورت عورت ہے اور مرد مرد! مگر یہ حیرت رفع ہو جائے گی جب تم کو معلوم ہوگا کہ عقلاے یورپ، یورپ کی عورتوں کو عورت تسلیم نہیں کرتے، کیوں کہ درحقیقت انھوں نے اپنے جنسی فرایض بھلا دیے ہیں اور اپنے طبعی دایرے سے باہر قدم نکالنا چاہتی ہیں۔ یہی عالم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

> ''جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ ایک ''عامل بسیط'' کا فرض انجام دیتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عورت نہیں رہتی۔ (۲۰)''

مشہور مصنف پروفیسر جیوم فریرو (۲۱) نے ۱۸۹۵ء میں ایک مضمون لکھا تھا، جو ریویو آف ریویوز میں شایع ہوا۔ اس مضمون میں نہایت دردانگیز الفاظ میں ان عورتوں کی افسوس ناک حالت

کی تصویر کھینچی ہے، جو یورپ میں موجودہ آزادی سے متاثر ہو کر مردوں کے مشاغل میں شریک ہو گئی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

"ان عورتوں کو معاشرت کے اصلی اصول زوجیت سے سخت نفرت ہے۔ قدرت نے جس غرض سے ان کو مخلوق کیا ہے اور جس کام کے لیے ان کو جسمانی اور دماغی اعضا عطا کیے ہیں، اس کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ ان میں وہ طبعی حاسہ اور جنسی امتیاز بالکل نہیں پایا جاتا جو ان کی ہم عمر عورتوں میں فطرتاً موجود ہے۔ ان کی حالت ایک ایسے درجے تک پہنچ گئی ہے جس کو مالی خولیا سے تعبیر کرنا چاہیے۔ درحقیقت نہ ان کو مرد کہا جا سکتا ہے اور نہ وہ عورت ہیں، بلکہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن گئی ہیں۔ اگر وہ مرد اس لیے نہیں ہیں کہ مردوں سے طبعاً اور ترکیباً مختلف الجنس ہیں تو عورت بھی اس لیے نہیں ہیں کہ ان کا عمل اور وظیفہ فرائض نسوانی سے بالکل مختلف ہے۔ جو علمائے یورپ اس عظیم الشان نقص مدنیت پر غور کر رہے ہیں، جو قوانین قدرت کے احکام کا منافی اور اس کے حدود کو توڑنے والا ہے اگر عورتوں کی یہ افسوس ناک حالت اسی طرح کچھ عرصے تک قایم رہی تو سمجھ لینا چاہیے کہ عن قریب سوسایٹی میں ایک عظیم الشان خلل پیدا ہونے والا ہے، جو تمدّن اور معاشرت کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گا۔ (۲۲)"

حیرت ہے کہ حریت کے طلب گار عورت کی غلامی کی فریادوں سے کنگورۂ عرش کو ہلانا چاہتے ہیں، مگر اس پر غور نہیں کرتے کہ قدرت نے مرد کو عورت کا کس طرح محکوم اور غلام بنا دیا ہے؟ قدرت نے مرد کا فرض قرار دیا ہے کہ عورت کے تغذیہ اور آرام و راحت کے لیے خود (۲۳) کو تمدّن کی مہلک موجوں میں ڈال دے اور جاں کاہ صدمات برداشت کر کے بے حد کدو کوشش سے (۲۴) سمندر کی تہ تک پہنچے اور موتیوں کا خزانہ نکال کر عورت کے قدموں پر ڈال دے۔

اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ عورت کے فرضی وکیل اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ خود عورت کو اپنی طبعی ضروریات کا کفیل ہونا چاہیے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو کر خود (۲۵) کو سیاست اور تمدّن کے مناقشات میں مبتلا کر دینا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت پر یہ ظلم اور بے حد ظلم نہیں ہے کہ ایک طرف فرائض منزلی اور بقائے نوع انسانی کا اس کو ذمے دار قرار دیا

جائے اور دوسری طرف تحقیق جرایم اور تلاش معاش کا بھی اس پر بار ڈالا جائے، کیا یہ غلامی نہیں ہے کہ مرد اپنا کام بھی عورتوں کے سپرد کر کے، طبعی فرایض کی انجام دہی سے سبک دوش ہو جائیں اور عورت کو فرایض منزلی کے ساتھ تمدّن وسیاست کے انتظام واہتمام کا بھی ذمہ دار قرار دیں؟ غور سے دیکھو! انصاف یہ ہے کہ عورت کو اس کے فرایض طبعی کے میدان میں آزاد اور مطلق چھوڑ دیا جائے اور وہ اس کام کو اطمینان اور راحت کے ساتھ انجام دے جس کی صلاحیت اور قدرت فطرت نے اس کو عطا فرمائی ہے۔ ساتھ ہی اس کشمکش سے محفوظ رہے جس کی صلاحیت اور قابلیت سے فطرت نے اس کو محروم رکھا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر تمدّنی ترقی اور کمال انسانی کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ عورت استقلال اور عام آزادی کے درجے تک صعود کر جائے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو جائے تو اس بنا پر کوئی وجہ نہیں کہ وحشی ممالک کو دنیا کا اعلیٰ ترین متمدّن حصہ نہ قرار دیا جائے! وہاں مرد خالی الذہن اور غیر مکلّف ہوتا ہے۔ تمام کام صرف عورتیں کرتی ہیں!

درحقیقت خود قدرت اس الزام کی ذمے دار ہے کہ کیوں عورتوں کو نظام تمدّن میں کافی حصہ نہیں دیا۔ عورت کی فطرت، داخلی اور خارجی اعضا کی سر سے پیر تک کی مجموعی ہیئت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ وہ اس کام کے لیے ہرگز مخلوق نہیں کی گئی ہے جس کو عورت کے فرضی وکیل اس کے لیے تجویز کر رہے ہیں۔ یورپ کے وہ عالم جو فلسفۂ حسّی کے مجدد، اعلیٰ ترین مصنف اور فلسفۂ جدیدہ کے مسلّم ارکان ہیں، پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کو گھر سے باہر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اس کا کام نوع انسانی کی حفاظت اور صرف فرایض منزلی کو انجام دینا ہے۔ مگر افسوس!

گوشِ سخن شنو! کجا! دیدۂ اعتبار کو!

مشہور اقتصادی فلاسفر (۲۶) علامہ پروڈن اپنی قابلِ قدر کتاب ابتکار النظام میں لکھتا ہے:

> ''عورت کو تمدّن انسانی میں قدرت نے بالکل حصہ نہیں دیا۔ وہ علم کا راستہ طے کرنا چاہتی ہے، مگر علم اس سے مساعدت نہیں کرتا! اسی کا نتیجہ ہے کہ خوف ناک نتایج کے ظہور پذیر ہونے کے ہم متوقع ہیں۔ نوع انسانی عورت کی کسی علمی اختراع یا صناعی، ایجاد یا اخلاقی اور سیاسی کوششوں کی ہرگز ممنون نہیں ہے (۲۷)،

بلکہ مرد ہی ایک اکیلی ذات ہے جو خود اختراع کرتی ہے، تکمیل تک پہنچاتی ہے، اس پر عمل کرتی ہے، اس سے نتائج پیدا کرتی ہے اور عورت کے تغذیے اور آرام و راحت کا انتظام کرتی ہے۔ (۲۸)

فلسفۂ حسّی کا موسس، اصولِ نظامِ تمدّن کا بانی، استاذ الاساتذہ اجوسٹ کونٹ اپنی مشہور تصنیف ''النظام السیاسی علی حسب الفلسفۃ الحسیہ'' میں لکھتا ہے:

''ہمارے زمانے میں جو کوششیں عورتوں کی آزادی کے لیے کی جارہی ہیں، وہ درحقیقت خیالی گمراہی ہے۔ قدرت کے طبیعی قانون نے عورتوں کی زندگی کو منزلی دایرے میں محدود کردیا ہے اور ہزار کوشش کی جائے مگر اس میں تغیر نہیں ہوسکتا۔'' (۲۹)

انسان پر موقوف نہیں، دنیا میں جتنی چیزیں مخلوق کی گئی ہیں سب میں جنسی امتیاز پایا جاتا ہے۔ قوت فاعلہ اور قوت منفعلہ کی مشترک حالت دنیا کا نظام تمدّن قایم رکھتی ہے۔ اس بنا پر عورت کا استقلال اور تمدّنی دنیا کی شرکت، یہ مفہوم رکھتی ہے کہ قوت منفعلہ سے قوت فاعلہ کا کام لیا جائے اور قدرت نے جو نظام مقرر کردیا ہے اس میں تغیر اور ردوبدل کیا جائے، **ومن یتعد حدود اللّٰہ فقد ظلم نفسہ**۔ (۳۰) یہی فیلسوف اعظم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

''مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوف ناک نتائج اور فساد پیدا ہورہے ہیں ان کا علاج یہی ہے کہ صاف صاف بتلا دیا جائے کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) اور جنس محبّ (عورت) کے مادی فرایض کیا ہیں؟'' (۳۱)

''مرد پر واجب ہے کہ عورت کے تغذیے کا انتظام کرے یہی وہ قانون طبعی اور ناموس الٰہی ہے جو جنس محبّ کی اصلی زندگی کو منزلی دایرے میں محدود کرتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جو ہیئت اجتماعی کے خوف ناک اور مہیب اشکال کو احسن اور اکمل کردیتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو عورت کو اپنے طبعی جذبات سے ترقی نوعِ انسانی جیسے شریف فرض کی بجا آوری پر آمادہ کرتا ہے۔ پس وہ تمام مادی ترقی اور علمی کمال جو عورت کی موجودہ حالت ہم سے طلب کررہی ہے، محال قطعی اور محض ناممکن ہے، کیوں کہ اس ناموس الٰہی اور قانون طبعی سے منطبق نہیں ہوسکتی اور

چوں کہ یہ خواہش ناموس الٰہی کی مخالف ہے اور اس کے حکم کو رد کرنا چاہتی ہے، اس لیے اس طبعی جرم کے اثر سے سوسایٹی کا کوئی علاقہ اور حصہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔'' (۳۲)

''سمویل سمائلس'' انیسویں صدی کا مشہور عالم اور انگلستان کے جدید تمدنی دور کا مسلم موسس ہے، جس کی اخلاقی تصنیفات آج یورپ کے تعلیمی نصاب کا ایک ضروری جز و سمجھی جاتی ہیں۔ یورپ کے تمام افاضل اور علما شہادت دے چکے ہیں کہ انیسویں صدی میں ہم تمام مصنفین میں ''سمائلس'' اخلاق کا سرخیل اور بزرگ ترین مصنف ہے۔ اس سے بڑھ کر مقبولیت کیا ہو سکتی ہے کہ علمی اور اخلاقی سوسایٹی کی طرح مذہبی سوسایٹی بھی اس کی تصنیفات کو بائبل کا ہم پلہ تسلیم کرتی ہے اور اس الماری کو منحوس سمجھتی ہے جس میں سمائلس کی تصنیفات کو جگہ نہ دی گئی ہو۔ یہی عالی دماغ اخلاقی فلاسفر اپنی گراں بہا تصنیف ''الاخلاق'' میں انگلستان کی آزاد عورتوں کی حالت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''قدیم اہل روما کے نزدیک شریف اور ''ربتہ العائلہ'' عورت کی سب سے زیادہ قابل تعریف اور اعلیٰ درجے کی قابلِ مدح بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھنے والی اور گھر سے باہر کی کشمکش سے محفوظ ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی کہا جاتا ہے کہ عورت پر جغرافیے کی تعلیم اس لیے واجب ہے کہ وہ اپنے گھر میں مناسب رخ اور صحیح سمت میں کھڑکیاں بنوا سکے اور علم کیمسٹری کی تحصیل اس لیے فرض ہے کہ جوش کی حالت میں دیگچی کی حفاظت کر سکے، کیوں کہ لارڈ بائرن باوجود اس میلان اور رغبت کے، جو اس کو عورتوں کی طرف تھی، یہ رائے رکھتا تھا کہ عورتوں کے کتب خانے میں بائبل اور طباخی کی کتاب کے سوا اور کوئی کتاب نہیں ہونی چاہیے۔ مگر یہ رائے عورتوں کے اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے غیر معقول اور ان کی ترقی میں ایک رکاوٹ سمجھی جاتی ہے۔''

قدیم اہل روما اور لارڈ بائرن کی رائے لکھ کر جس کا درحقیقت وہ مؤید اور حامی ہے۔ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق یورپ کی عام رائے نقل کرتا ہے اور اس کو ایک جنون اور مدنیت کے لیے بے حد مضر قرار دیتا ہے:

''اس رائے کی مخالف ایک اور رائے ہے جو آج تمام یورپ میں شایع اور عام ہو رہی ہے۔ اہل روما اور لارڈ بائرن کی رائے اگر عورتوں کی تہذیبی اور اخلاقی ترقی کے لیے مضر سمجھی جاتی ہے تو درحقیقت اس دوسری رائے کو دیوانگی اور خبط سمجھنا چاہیے کیوں کہ نظام طبیعت پر منطبق نہیں ہوتی۔ اس رائے کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو اس قدر مہذب بنایا جائے اور تعلیم سے آراستہ کیا جائے کہ اس میں اور مرد میں سوائے جنسی امتیاز کے اور کوئی فرق باقی نہ رہے اور حقوق سیاسی وعلمی کے لحاظ سے مرد اور عورت بالکل مساوی درجے میں سمجھے جائیں۔ (۳۳)''

قدرت نے مرد کو عورت پر فوقیت دی ہے۔ اس لیے عورت کا فرض ہے کہ وہ مرد کی حمایت میں رہے۔ اگر مرد کی حمایت اور فوقیت عورت کے لیے غلامی ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ عورت کو اس غلامی سے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ قدرت دنیا کی آسایش اور انتظام پر نظر رکھتی ہے، ہماری تمھاری رایوں پر نظر نہیں رکھتی۔ وہ تمھاری رائے کی تابع ہو کر کیوں عورت کو مستقل اور آزاد کر دے؟ جب کہ اس کا استقلال دنیا کے لیے اور دنیا کے تمدن کے لیے ایک خوف ناک بربادی ہو؟ اس لیے بیکار اور (۳۴) فضول شور وغل سے دست بردار ہو کر غور اور فکر کی نظر ڈالو! دیکھو کہ نظام تمدن میں عورتوں کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے؟ دنیا کس درجے ان کی محتاج ہے؟ اور کس امر میں محتاج ہے۔ خود مردوں کے فرایض کیا ہیں؟ دنیا میں اس وقت تک عورتوں کو کہاں تک تمدن میں شریک کیا گیا اور اب کہاں تک شریک ہیں؟ پھر جو کچھ علم وعقل کا فیصلہ ہو، اس پر شاکر ہو کر بیٹھ رہو! (۳۵) کیوں کہ قدرت کے قانون میں تغیر ممکن نہیں ولن تجد لسنة الله تبديلا (۳۶)

مشہور اشترا کی فلاسفر (۳۷) فیلسوف اعظم علامہ پروڈن ابتکار النظام میں لکھتا ہے:

''سوسایٹی کی تکوین درحقیقت ان تین عنصروں سے ہوتی ہے؛ علم، عمل، عدالت، اب دیکھو کہ مرد اور عورت کا ان عناصرِ ثلاثہ میں کس درجے حصہ ہے اور باہم کس قدر متفاوت ہیں۔ نظام تمدن ہم کو بتلاتا ہے کہ علم وعمل وعدالت کے لحاظ سے مرد اور عورت میں وہ نسبت ہے جو ۳×۳×۳ کو ۲×۲×۲ سے ہوتی ہے۔ یعنی (۲۷) اور (۸) کی نسبت ہے۔ اس لیے جو لوگ عورتوں کے لیے آزادی اور استقلال کے طالب ہیں، وہ درحقیقت عورتوں کو شقاوت کے قید خانے میں مقید

کرنا چاہتے ہیں وہ قید خانہ جو مفروضہ عبودیت کے قید خانے سے کچھ کم نہیں ہے۔ پس مرد اور عورت میں مساوات سخت مکروہ اور ایک قبیح خیال ہے، جو زوجیت کے سلسلے کو روکنے والا، محبت کو ہلاک کرنے والا اور نوع انسانی کے لیے آفت اور سخت آفت ہے۔ (۳۸)''

لطف یہ ہے کہ قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال حضرات تربیت اطفال کو ایک نہایت اہم فرض قرار دیتے ہیں مگر ساتھ ہی آزادی اور استقلال کی فریادیں بھی بلند کرتے ہیں۔ قاسم امین بک لکھتا ہے:

''جمہور کا خیال یہ ہے کہ اطفال کی تربیت ایک معمولی کام ہے، جس کو ایک جاہل عورت بھی اچھی طرح انجام دے سکتی ہے۔ مگر جو لوگ فطرت انسانی سے واقف ہیں اور علم کے زیور سے آراستہ، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شئونِ انسانیہ میں سے کوئی شے اس قدر اہم نہیں ہے اور دنیا کے تمام علمی اور تمدنی کاموں میں سے کوئی کام اس قدر دشوار نہیں ہے، جس قدر بچوں کی تربیت اور صحیح تربیت ہے۔ انسان کی تمام علمی اور اخلاقی خوبیوں کا دارومدار محض اس تربیت پر ہے، جو عالم طفولیت میں ماں کی توجہ سے انسان حاصل کرتا ہے اور انسان کی علمی ترقی اور اخلاقی کمال کا حقیقی سرچشمہ وہ قصیر زمانہ ہے، جب وہ اپنی ابتدائی عمر میں قدرت کے مقرر کیے ہوئے شفیق معلّم سے صحیفۂ فضل وکمال کے دیباچے کا درس حاصل کرتا ہے۔ علمی حیثیت سے دیکھو کہ تربیت اور صحیح تربیت ان تمام علوم کی محتاج ہے، جن کے ذریعے سے انسان کے جسمانی اور روحانی نشوونما کے قوانین سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ محنت اور توجہ کے لحاظ سے تربیت ہی ایک ایسی چیز ہے، جس میں بے انتہا صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ یوم ولادت سے سن بلوغ تک بچے کی نگہداشت کرنی، صبر اور تحمل سے اپنی کوشش اور توجہ کے نتایج کا انتظام کرنا اور تقریباً چودہ پندرہ برس کا طول طویل زمانہ اسی کوشش میں بسر کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ (۳۹)''

لیکن سوال یہ ہے کہ جس عورت کے طبعی فرایض میں ایسا اہم اور دشوار محتاج علوم ومشقت

کام داخل ہے، کیا وہ دنیا کے سیاسی اور علمی جھگڑوں میں بھی حصہ لے سکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ تربیت اطفال بے انتہا مشکل اور غیر معمولی توجہ کی محتاج ہے، لیکن کیا اس کی اہمیت اور دشواری اس امر کے لیے مستلزم ہے کہ انتظام حکومت اور سیاسی مناقشات کے انفعال کا بار بھی اس مظلوم اور مسکین عورت پر ڈالا جائے؟ تم کہتے ہو کہ عورت کی آزادی مردوں نے چھین لی ہے، ظلم وستم کا عادی بنا دیا ہے، لیکن سچ سچ بتلاؤ، عورت کو تمدّن کی کشمکش سے محفوظ رکھنا اور اس امر کا موقع دینا کہ فرائض تربیت کی انجام دہی میں منہمک رہے، انصاف اور حقیقی انصاف ہے یا تربیت جیسی اہم اور مشکل ذمے داریوں کے ساتھ سیاسی اور تمدّنی انتظام کا بھی ذمے دار بنانا انصاف اور خالص انصاف ہے؟

تم کہتے ہو کہ ہم انصاف نہیں کرتے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ تم عدالت سے کوسوں دور ہو، مرد کے فرائض کا بار بھی غریب عورت کے سر ڈالنا غلامی نہیں ہے، مگر عورت کو اس ناواجب اور خلاف احکامِ قدرت بوجھ سے بچانا ظلم اور انصاف سے بعید ہے؟ تم کہتے ہو کہ تربیت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی کام اہم اور دشوار نہیں۔ پھر کیوں عورت کو اس امر کا موقع نہیں دیتے کہ وہ اس اہم اور دشوار کام کو تعلیم قدرت کے مطابق انجام دے؟

حقیقت یہ ہے کہ تم اگر چہ عورتوں کی وکالت کا دعویٰ کرتے ہو، مگر تمھاری وکالت غریب عورتوں کے لیے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے، ہم ہیں عورتوں کے حقیقی اور سچے حامی کہ پکار پکار کر ان کو سمجھا رہے ہیں کہ قدرت اور قدرت کے قانون نے تم کو جس دایرے میں محدود کر دیا ہے، اے غریب اور شریف عورتو! اس دایرے سے باہر قدم نکالنے کی مجرم مت بنو!

قاسم امین بک نے امریکہ کے ایک چیف جسٹس کا قول نقل کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے کہ خارجی مشاغل عورت کے منزلی فرایض میں خلل انداز نہیں ہو سکتے، اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

> ”عام مشاغل اور گھر سے باہر کی زندگی عورت کے منزلی فرایض پر مؤثر نہیں ہو سکتی، وہ مشاغل عمومی میں بھی مشغول رہ سکتی ہے اور ساتھ ہی اس کے منزلی فرایض بھی انجام پا سکتے ہیں، چناں چہ میں نے اس وقت تک اس قسم کی کوئی خبر نہیں سنی کہ کوئی شخص اپنی بیوی کا اس لیے شاکی ہوا ہو کہ وہ مصالح عامہ میں بھی

شریک ہے۔'' (۴۰)

قاسم امین بک (۴۱) سے اور اس کے ہم خیال مصلحوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا امریکہ کے جج کا قول صحیح ہے؟ اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ تم تربیتِ اطفال کو ایک مشکل اور محتاج مشقت کام سمجھتے ہو؟ کیا ممکن ہے کہ ایک شخص اوّل الذکر رائے کو صحیح تسلیم کرکے، آخر الذکر رائے کی صحت کا بھی اعتراف کرے؟ کیا ممکن ہے کہ دو اور دو پانچ بھی ہوں اور دو اور دو چار بھی؟ جواب کی امید نہیں! اس لیے ہم خود جواب دیتے ہیں کہ یہ سب ممکن ہے۔ اگر یہ ممکن ہو کہ فطرت کے قوانین منسوخ ہو جائیں، اگر یہ ممکن ہو کہ خدا کے قرار دیے ہوئے فرایض بدل جائیں، اگر یہ ممکن ہو کہ مغرب مشرق ہو جائے اور جنوب شمال **فطرة الله التي فطر الناس عليها لاتبديل لخلق الله** (۴۲)

قاسم امین بک لکھتا ہے کہ

''ابتدائے تخلیقِ عالم سے اس وقت تک کی مجمل تاریخ عورت کی یہ ہے کہ اس پر چار دور گزرے ہیں،

دور اوّل میں انسان بالکل ابتدائی حالت میں تھا، اس لیے عورت حر مطلق اور بالکل آزاد تھی۔

پھر عایلہ (۴۳) کی تشکیل ہوئی، عورت کے لیے یہ دوسرا دور تھا، اس دور میں آکر عورت استعباد اور مردوں کی غلامی میں مبتلا ہو گئی اور اس کی فطری حریت مردوں نے چھین لی۔ اس کے بعد

تیسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں انسانی حالت نے کمال کی طرف ترقی کی اور تمدّنی اثر آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اس لیے عورت کی غلامی نے ایک کروٹ لی اور اس کے حقوق کی طرف توجہ ہوئی لیکن مرد کی خود غرضی نے پسند نہیں کیا کہ عورت کے جن حقوق کو اس نے تسلیم کیا ہے، ان سے فایدہ اٹھانے کا اس کو موقع دے، لیکن

چوتھے دور میں جب تمدّن درجہ، کمال کو پہنچا اور فطرت کے بخشے ہوئے حقوق پر متمدّن انسان کو توجہ ہوئی، تو عورت کی حریت تامہ کو مردوں نے تسلیم کرلیا اور مرد اور عورت کا درجہ مساوی ہو گیا۔

یہ ہے عورت کی مجمل تاریخ اور تمدّن عالم کے ادوار اربعہ!'' (۴۴)

فاضل مصنف نے عورتوں کی مجمل تاریخ بیان کردی، مگر یہ نہیں بتلایا کہ دورِ اوّل میں وہ کس طرح آزاد تھی؟ اور دورِ دوم میں کس طرح استعباد اور غلامی پر راضی ہوگئی؟ عایلہ کی تشکیل کے ساتھ ہی عورت کا ابتدائی استقلال کیوں مفقود ہوگیا؟ اور کیوں مردوں کی غلامی سے اس نے خود (۴۵) کو آزاد نہیں کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہیں، جن پر غور کرنے کی اگر قاسم امین بک تکلیف گوارا کرتا، تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان میں سے ہر ایک دور کے لیے ایسے اسباب اور لوازم تھے، جن سے عورت کسی حالت میں بچ نہیں سکتی تھی۔ لیکن ہم اس بحث سے الگ ہو کر صرف پہلے سوال کو دہرانا چاہتے ہیں کہ دورِ اوّل میں عورت کا کیا حال تھا اور اس کی حریت اور استقلال کی کیا صورت تھی؟ کیوں کہ جب دورِ اوّل زمانہ، آزادی تھا۔ اور دورِ دوم میں عورت گرفتار استعباد ہوگئی اور اب پھر آزادی اور استقلال کی طالب ہوئی تو ہم کو تلاش کرنا چاہیے کہ دورِ اوّل میں عورت کی کیا حالت تھی؟ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اب پھر اسی حالت کو تم عورتوں کے لیے پسند کرتے ہو!

انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے:

''یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا پہلا زمانہ وہ زمانہ تھا، جب عایلہ کی بنا نہیں پڑی تھی۔ اور عورت تمام قیود سے آزاد اور استقلال کے آخری درجے تک پہنچی ہوئی تھی، مگر اس استقلال کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی حالت انتہائی درجے کی حقیر اور ذلیل تھی اور اس کی بے حد اہانت کی جاتی تھی۔ لیکن جب عایلہ کی بنیاد پڑی تو عورت کی حالت میں تغیر ہوا اور بالکل ایک نئی قسم کی حالت شروع ہوگئی، کیوں کہ عایلہ کے دایرے میں قدم رکھتے ہی درجۂ استقلال سے یکا یک گر پڑی اور تقیدات میں مبتلا ہوگئی، مگر اس کے مقابلے میں ایک معنوی درجہ اس نے حاصل کیا جو اس سے پیشتر مفقود تھا۔ (۴۶)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت دورِ اوّل میں اگرچہ آزاد اور مستقل تھی، لیکن اس کی حقیر حالت اور ذلت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ جس سے زیادہ حقارت اور ذلت نہیں ہوسکتی۔ پھر عایلہ کی تشکیل سے استقلال مفقود ہو گیا لیکن ایک ایسا معنوی درجہ حاصل کیا جو اس سے پیشتر اس کو میسر نہ تھا۔ عورتوں کے فرضی وکیل اس کوشش میں ہیں کہ پھر آزادی اور استقلال کے درجے پر عورت صعود کر

جائے (۴۷) جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورت کو معنوی درجہ چھوڑ کر ذلت اور حقارت کا درجہ حاصل کرنا چاہیے۔ پس اگر یہ خیال صحیح ہے، تو ہم سدراہ ہونے کی تکلیف گوارا کرنا نہیں چاہتے۔ قدیم وحشت اور حیوانی حالت کا شوق ہے تو چھوڑ دو مدنیت کو، یا دوسرے لفظوں میں ترک کر دو انسانیت کو اور پھر عورت کو اس وحشت کے میدان کی سیر کرا دو، جس سے آزاد ہو کر اس نے معنوی درجۂ کمال و مدنیت حاصل کیا تھا۔

اسلام اور اسلام کی خالص مدنیت نے عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ ایک منصف مؤرخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ آج یورپ میں حد اعتدال سے گزری ہوئی آزادیِ نسواں نے جو نتائج پیدا کیے ہیں، ان کو دیکھ کر یورپ کے افاضل وہی طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، جو اب سے تیرہ سو برس پیشتر اسلام نے دنیا کو بتلایا تھا۔ اگر مسلمان اسلام کے مجموعۂ تعلیم وہدایت میں عورتوں کی حریت یا عدم حریت کے مناقشے کا قول فیصل تلاش کریں اور ڈھونڈیں کہ اسلام نے عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، کہاں تک اس کو آزادی دی ہے، کس درجے تک اس کے حقوق تسلیم کیے ہیں؟ غلامی اور مفرط آزادی کی خرابیوں کا کیوں کر علاج کیا ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی تعلیم سے مستغنی ہو جائیں۔ ہمارے آرٹیکل (۴۸) کا موضوع اس بحث میں قدم نہیں رکھ سکتا، ورنہ ہم دعوے کے ساتھ اسلام کے فیصلے کو پیش کرتے اور بتلاتے کہ دنیا کے تمام بنائے ہوئے قانون اور انسان کے تمام بنائے ہوئے طریقے، اس الٰہی اور روحانی قانون کے آگے ہیچ ہیں۔ مگر یہاں ہم صرف اتنا بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے اس محتاج عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، جس کا شوہر دنیا سے کوچ کر چکا ہو اور کوئی محافظ اور کفیل نہ ہو۔ کیا اس کو گھر سے باہر کی زندگی میں قدم رکھنا چاہیے اور کیا اس کو اپنی معاش کا انتظام خود اپنے ہاتھوں انجام دینا چاہیے؟ یا اس کے لیے کسی دوسری صورت کا انتظام ہونا چاہیے؟

درحقیقت یہ ایک ضروری سوال ہے۔ قاسم امین بک نے بھی اس کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس صورت میں عورت گھر سے باہر نکل کر اپنی ضروریات کے انتظام کرنے پر مجبور ہے اور لامحالہ اس کو آزادی اور استقلال کی اجازت دے کر منزلی دایرے میں محدود رہنے کے قانون کو توڑنا پڑے گا۔ اسلام نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے، وہ آج ہم یورپ کے مشاہیر عقلا کی زبانی سُن رہے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کی محتاج اور لاوارث عورتوں کی ضروریات کا انتظام

مسلمانوں کو بیت المال سے کرنا چاہیے۔ بیت المال مسلمانوں کا مشترکہ فنڈ ہے جو امیر وقت کی نگرانی میں ہمیشہ اس قسم کے محتاجوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ پس اسلام نے سوسایٹی یا قوم پر محتاج عورتوں کی امداد واجب کردی ہے (۴۹) تاکہ معاش کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر عورت کو منزلی دایرے سے باہر قدم نہ نکالنا پڑے۔ یورپ کے دانش مندا کابر آج اسی تعلیم پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور کوشش کررہے ہیں کہ گورنمنٹ ان عورتوں کے نفقات کا انتظام قومی فنڈ سے کردے۔ علامہ اجوسٹ کونٹ (۵۰) انظام السیاسی میں لکھتا ہے:

''شوہر یا کسی اور قریبی رشتے دار کی عدم موجودگی میں سوسایٹی کا فرض ہے کہ عورت کی ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے، تاکہ معاش کی ضرورت سے مجبور ہو کر اسے گھر سے باہر کی زندگی میں خود کو مبتلا نہ کرنا پڑے، کیوں کہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دایرے میں محدود رہنا چاہیے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ عورت خارجی زندگی کے مصایب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اس کو جس دایرے میں محدود کردیا ہے، اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔
ہمارا ارادہ تھا کہ ریویو کو اس نمبر پر ختم کرڈالیں، مگر ابھی ایک ضروری بحث باقی ہے، یعنی یورپ میں درحقیقت متمدّن عورتوں کا کیا حال ہے؟ آزادی ان کو ترقی کی طرف لے جارہی ہے یا تنزل کی طرف؟ مگر مضمون کو یہاں ختم کردیتے ہیں۔ آیندہ نمبر میں ایک مستقل عنوان سے اس پر نظر ڈالیں گے۔''

ابو الکلام آزاد دہلوی
ندوہ۔ لکھنؤ (۵۱)

حواشی

۱۔ کتاب میں از ''ارادہ نہیں تھا......تا......صلاحیت نہیں'' سطروں کو حذف کر دیا ہے۔

۲۔ ''لیکن فرید وجدی پر'' جملے کی جگہ پر کتاب میں ''لیکن ہم پر'' جملہ ہے۔

۳۔ ''متعدد زبانوں کی واقفیت......تا......آئینہ کر دیا تھا'' اس جملے کی جگہ کتاب میں یہ جملہ ہے ''یورپ کے مشاہیر علماء کی رائیں پیشِ نظر تھیں۔''

۴۔ گذشتہ نمبر، مبدل بہ ''گذشتہ فصل'' ہو گیا ہے۔

۵۔ یہاں بھی گذشتہ نمبر، بدل کر ''گذشتہ فصل'' ہو گیا ہے۔

۶۔ ''فرید وجدی'' مبدل بہ ''ہم'' ہو گیا ہے۔

۷۔ جملہ ''پیش کرنے کے بعد'' کتاب میں ''پیشِ نظر کر دینے کے بعد'' بن گیا ہے۔

۸۔ گذشتہ نمبر ''گذشتہ فصل'' سے بدل گیا ہے۔

۹۔ ''پچھلے نمبر'' کی جگہ ''گذشتہ فصل'' نے لے لی ہے۔

۱۰۔ یہ جملہ کتاب میں ''زیادہ تر درجۂ کمال'' ہو گیا ہے۔

۱۱۔ دیکھو المرأة الجدیدہ، قاسم امین بک

۱۲۔ ''فرید وجدی اس کے جواب میں کہتا ہے کہ'' اس پورے جملے کی جگہ کتاب میں صرف ایک لفظ ''لیکن'' نے لے لی ہے۔

۱۳۔ ''پیش کرنا چاہیے۔'' کتاب میں یہ جملہ ''پیش کرنا چاہیں'' سے بدل دیا گیا ہے۔

۱۴۔ ''رائیوں'' کی جگہ کتاب میں ''راؤں'' ہے۔

۱۵۔ کتاب میں اس مصنف کے نام کا املا ''آگسٹ کونٹ'' ہے۔

۱۶۔ کتاب میں ''شاخوں'' کی بجائے ''خواہشوں'' ہے۔ میرا خیال ہے کہ ''شاخوں'' ہی درست ہے۔ اس لیے کہ خواہشوں کا مفہوم تو اباحتِ عامہ'' کے نظریے میں پہلے سے موجود ہے!

۱۷۔ المرأة الجدیدہ: ص ۵۵

۱۸۔ یہ پیراگراف جو ''اس کے بعد'' سے شروع ہو کر ''نظر اغماض سے نہ دیکھیں'' پر ختم ہوتا ہے، کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۱۹۔ کتاب میں اس مقام سے ''عورتوں کی آزادی اور فرایض کے متعلق علمائے یورپ کا فیصلہ'' کے زیرِ عنوان نئی بحث شروع ہوتی ہے۔

۲۰۔ المرأة المسلمہ: ص ۶۱

۲۱۔ کتاب میں پروفیسر جیوم فریرو کے نام کے بعد اس کے تعارف میں مولانا نے قوسین میں ایک جملے کا اضافہ کیا ہے وہ جملہ یہ ہے: ''جو اطوار انسانی کا مشہور نقاد ہے۔''

۲۲۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۸۴

۲۳۔ کتاب میں ''خود'' کی جگہ ''آپ'' ہے۔

۲۴۔ کتاب میں اس جملے ''بے حد کروکوشش سے'' کو نکال دیا ہے۔

۲۵۔ کتاب میں ''خود'' کی جگہ ''آپ'' نے لے لی ہے۔

۲۶۔ کتاب میں ''اقتصادی فلاسفر'' کے بجائے ''سوشلسٹ فلاسفر'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔

۲۷۔ اس مقام پر کتاب میں یہ عبارت زیادہ ہے: ''وہ علم کی شاہراہ پر بغیر عورت کی مساعدت کے چلی ہے اور اس نے خود ہی حیرت انگیز عجائبات ظاہر کیے ہیں۔''

۲۸۔ مصنف المرأۃ المسلمہ نے مرجع اور انگریزی کتابوں کے ناموں کا اپنے طور پر ترجمہ کرلیا ہے۔ ہم نے بھی انھیں کی نقل پر اکتفا کیا۔

۲۹۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۱۹

اسی مقام پر اسی مصنف کا جو اقتباس کتاب میں درج کیا گیا ہے، وہ اس سے قدرے مختلف اور طویل ہے۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ''جس طرح ہمارے زمانے میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں، اسی طرح تغیر نظام تمدن اور آدابِ معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ مگر وہ لاز آف نیچر جو جنس محب (عورت) کو منزلی زندگی کے لیے مخصوص رکھتا ہے، اس میں کبھی کوئی اہم تغیر واقع نہیں ہوا۔ یہ قانونِ الٰہی درجہ صحیح اور محقق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سیکڑوں باطل خیالات قایم ہوتے رہے مگر یہ بغیر کسی تغیر یا نقصان کے سب پر غالب آتا رہا۔''

۳۰۔ قرآن حکیم کی سورۂ اخلاف (۶۵) کی آیت نمبر ۱ کا ٹکڑا

۳۱۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۸۷۔ اس اقتباس کے آخری خط کشیدہ جملے اپنی تالیف اور تفصیل میں کتاب میں مختلف ہیں۔ اس لیے انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے: ''ان کا علاج یہی ہے کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) پر جنس محب (عورت) کے جو مادی فرایض ہیں، ان کی حد بندی اور تعیین کردی جائے۔''

اس اقتباس کے بعد کتاب میں اس مقام ''سمویل سمائلس'' کے بارے میں مولانا ابوالکلام نے ذیل کے چند جملوں کا اضافہ کیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

> ''تم جانتے ہو کہ یہ کس شخص کا قول ہے؟ یہ اس شخص کا قول ہے جو علم عمران کا استاذ الاساتذہ اور فلسفۂ حسی کا بانی ہے اور فلسفہ حسی وہ علم ہے جس کو نوع انسانی کی دماغی ترقی کا آخری زینہ تصور کیا جاتا ہے، کیوں کہ اشیاء کی حقیقت پر محسوس باتوں کے لحاظ سے حکم لگانے کا صحیح اور تنہا قانون یہی

تسلیم کیا گیا ہے۔" (مسلمان عورت: ص ۶۱،۶۲)

۳۳۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۱۹۳

۳۴۔ اس جملے سے کتاب میں "بیکار اور" نکال دیا گیا ہے۔

۳۵۔ کتاب میں "بیٹھ رہو" کی بجائے "بیٹھ جاؤ" ہے۔

۳۶۔ کتاب میں استدلال کی یہ آیت (سورۂ احزاب۔۳۳:۶۲) نظر نہیں آئی!

۳۷۔ "اشترا کی فلاسفر" کو مولانا نے "نہلسٹ فلاسفر" لکھا ہے۔

۳۸۔ مولانا ابوالکلام نے یہ حوالہ المرأۃ المسلمہ کے ص ۴۰ سے دیا تھا۔لیکن کتاب میں اس اقتباس کی آخری تین سطریں ("پس مرد اور......تا......آفت ہے") حذف کردی ہیں۔اور اسی مقام پر اسی فلاسفر کا ایک اور اقتباس اضافہ ہے۔اقتباس یہ ہے: "یہی نہلسٹ عالم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

چوں کہ عورت کو صرف معنوی خوبیاں عطا کی گئی ہیں اس لیے اس حیثیت سے وہ ایک بیش بہا جواہر اور اس صفت میں مرد پر سبقت لے جانے والی ہے۔عورت کی ان خوبیوں کا ظہور مرد کی ماتحتی میں رہنے سے ہی ہو سکتا ہے۔کیوں کہ عورت کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ اس بے بہا عطیۂ قدرت کو اپنے لیے محفوظ رکھے جو دراصل اس کی مستقل خاصیت نہیں بلکہ ایک ایسی صفت، شکل اور حالت ہے جو اس پر شوہر کی حکومت ماننے کو لازم قرار دیتی ہے۔پس عورت کا مرد کے ساتھ دعویٰ ہم سری کرنا، اس کو نہایت مکروہ اور بدنما بنانے والی بات ہے جس کی وجہ سے وہ تعلقاتِ زوجیت کو توڑنے والی، محبت کو مٹانے والی اور نوع انسانی کو ہلاک کرنے والی بن جاتی ہے۔"
(مسلمان عورت: ص ۶۵)

۳۹۔ المرأۃ الجدیدہ: (فصل چہارم) قاسم امین بک

۴۰۔ المرأۃ الجدیدہ: (فصل پنجم) قاسم امین بک

۴۱۔ "قاسم امین بک" سے پہلے کتاب میں "لیکن ہم" جملہ اضافہ ہے۔

۴۲۔ سورۂ روم (۳۰): ۳۰

۴۳۔ خاندان یا معاشرہ

۴۴۔ المرأۃ الجدیدہ: فصل سوم

۴۵۔ کتاب میں "خود" کی جگہ "اپنے آپ" نے لے لی ہے۔

۴۶۔ اس المرأۃ المسلمہ: ص ۶۷

۴۷۔ کتاب میں یہ جملہ اس طرح ہے: "عورت کو صعود کر دیا جائے۔"

۴۸۔ کتاب میں "آرٹیکل" کو "رسالے" سے بدل دیا گیا ہے۔

۴۹۔ کتاب کے اس جملے کی تالیف میں ایک خفیف و لطیف فرق ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

"پس اسلام میں سوسایٹی یا قوم پر محتاج عورتوں کی امداد واجب کر دی گئی ہے۔"

۵۰۔ کتاب میں اس نام کی تصحیح شدہ شکل "اگسٹ کونٹ" ہے۔

۵۱۔ اس مقام پر الندوہ بابت ماہ فروری ۱۹۰۶ء میں المرأۃ المسلمہ کی تیسری قسط ختم ہو جاتی ہے۔ الندوہ میں یہ سلسلۂ مضمون اس سے آگے نہیں بڑھا۔

علمی خبریں

(۱)

انگلستان میں جنون:

یورپ اور یورپ میں بالخصوص انگریز حفظانِ صحت کا بے حد خیال رکھتے ہیں اور علوم وتمدّن کی ترقی نے جو اسباب، صحت اور حفاظت کے مہیا کر دیے ہیں، ان سے پورے طور پر متمتع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجود اس ممتاز خصوصیت کے انگلستان میں دیوانوں کی تعداد روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ سنہ رواں میں جو تعداد سرکاری طور پر مشتہر کی گئی ہے، ایک لاکھ اُنیس ہزار آٹھ سو اُنتیس ہے۔ جب ہم اس تعداد کو انگلستان کی عام مردم شماری کے مقابلے میں رکھتے ہیں تو اوسط طور پر ہر دو سو بچاسی آدمیوں کے بعد ایک آدمی دیوانہ ثابت ہوتا ہے۔ حال آں کہ دس سال پہلے عام اوسط ۱/ ۳۱۹ تھا! اور اس سے پیشتر اس سے بھی کم۔ انگلستان کی طبی جماعتوں نے جب اس خوف ناک ترقی کے اصلی اسباب تلاش کیے تو بحث وتجربہ کے بعد دو وجہیں ثابت ہوئیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ انگلستان میں شراب نوشی کی عادت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ شراب کا اصلی جزو الکہل ہے اور الکہل دماغی قوت کے لیے سم قاتل ہے۔

دوسری وجہ، انگلستان کے اس مظلوم طبقے کی ذلیل اور غلیظ معاشرت ہے جو تمدّن وعلوم کے مرکز میں رہ کر تمدّنی آرام وآسایش سے قطعی محروم ہے۔ انگلستان میں فقرا اور مساکین کا گروہ نہایت وسیع ہے۔ لندن کا ایک بڑا حصہ، انھیں آوارہ گرد فاقہ مستوں سے بھرا ہے۔ رات کو خوفناک سردی سے بچنے کے لیے نہ کسی ڈیوک کی فیاضی انھیں ایک پرانا کمبل بخشتی ہے۔ نہ تین گھنٹہ سونے کے لیے کسی باعظمت لارڈ کی ڈیوڑھی جگہ دیتی ہے۔ ہم دردی، نوعِ انسان کی محبت، ابنائے جنس پر

رحم، یورپ کے وہ جذبات ہیں جو یا تو ٹرکی کی حکومت میں سرکش عیسائیوں کو آزادی دلانے کے لیے حرکت میں آتے ہیں، یا مشنریوں کے مقدس گروہ کی زبانی مخالف مذہب کے مظلوم بھائیوں کو عیسائی بنانے کے لیے ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر خود دار الحکومت ان جذبات کے اثر سے نا آشنا ہے، جو ہزاروں میل کے فاصلے پر، ٹرکی میں دِکھلائے جاتے ہیں، یا سمندر پار ایشیا میں۔

یہ وسیع گروہ چوں کہ مجبوراً قابل نفرت حالت میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس لیے طبعی طور پر مختلف قسم کے عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ من جملہ ان کے ایک جنون بھی ہے۔ چناں چہ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ سو دیوانوں میں اکانوے دیوانے اسی گروہ کے ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال دو ہزار چھ سو تیس دیوانوں میں، دو ہزار پانچ سو چھ دیوانے فاقہ مست اور فقیر تھے۔

ہر سال دیوانوں کی مجموعی تعداد کے ساتھ فرداً فرداً یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ کن کن عوارض اور اسباب کے دیوانوں سے یہ تعداد پوری ہوئی ہے۔ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۳ء تک کے پانچ سالوں کی مجموعی تعداد میں مندرجۂ ذیل اسباب سے خاص خاص تعداد کے دیوانے دریافت ہوئے:

	دماغی عوارض	مرد	عورت
۱۔	خانگی پیچیدگیوں اور صدمات سے	۳۶	۸۸
۲۔	خلاف توقع ناکامیابی کے صدمے سے	۵۶	۳۵
۳۔	قوائے عقلی کو بے حد محنت میں ڈالنے سے	۵۵	۵۹
۴۔	مذہبی اثرات سے	۱۱	۱۲
۵۔	عشق کے صدمات سے	۵	۱۹
	جسمانی عوارض		
۶۔	کثرتِ استعمال مسکرات سے	۲۲۷	۹۷
۷۔	آفتاب کی حرارت کے صدمے سے	۱۳	۱
۸۔	ناگہانی صدمات سے	۴۳	۸
۹۔	بخار کی شدت سے	۱۲	۸
۱۰۔	بھوک کی شدت سے	۹	۹
۱۱۔	بڑھاپے سے	۷۱	۸۵

۱۲۔ مختلف بدنی امراض سے	۱۴۰	۱۳۱
۱۳۔ خاندانی اثرِ وراثت سے	۱۸۸	۲۴۹

اس جدول میں سب سے زیادہ تعداد نمبر ۶، ۱۲ اور ۱۳ کی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شراب نوشی اور زنا کاری کی کثرت جنون کی زیادتی کا اہم ترین سبب ہے۔

الکہل:

الکہل، ایک مسکر مادہ کا نام ہے۔ جو شراب کا جزِ اعظم ہے۔ اس بنا پر شراب کی جتنی مضرتیں بیان کی جاتی ہیں وہ فی الحقیقت کہل کی مضرتیں ہیں۔ شراب کے علاوہ کہل مختلف امراض کی دوائیوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اب سے کچھ عرصے پہلے عام خیال یہ تھا کہ شدت ضعف کی حالت میں مریض کو فوری تقویت پہنچانے کے لیے اور اعضا میں چستی پیدا کرنے کے لیے کہل سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں، لیکن آج کل شراب کی مضرتیں یورپ میں اس درجہ مسلم ہوگئی ہیں کہ ایک بڑی جماعت مرض کی حالت میں بھی کہل کا استعمال جائز نہیں رکھتی، اس جماعت کے مقابلے میں قدیم رائے کی جماعت بھی موجود ہے جو کہل کی مضرت کو تسلیم نہیں کرتی۔ حال میں لندن کے محکمۂ طبیہ کے سیکرٹری، ڈاکٹر ڈوسن بیرنس نے اس اختلاف کے متعلق ایک محققانہ مضمون شایع کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ جو لوگ شراب کے اصلی جزو کہل کو عام طور پر، یا بعض حالتوں میں مفید قرار دیتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں کیوں کہ شراب اور کہل، انسان کی جسمانی اور دماغی صحت کے لیے ہر حالت میں مضر ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے مضمون کا خلاصہ حسب ذیل ہے؛

۱۔ یورپ میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا ہے کہ کہل اکثر امراض کے لیے مفید ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں

۲۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ عصبات اور عضلات کے انحطاط پر انسان کے لیے کہل مفید ہوتا ہے۔

۳۔ بعض حالتوں میں دیکھا گیا ہے کہ شدت ضعف کے موقع پر کہل سے فایدہ ہوا لیکن اوّل تو اس قسم کا فایدہ ضرور نہیں کہ ہر حالت میں ثابت ہو، دوسرے یہ کہ اگر نادر صورتوں میں ہوتا بھی ہے تو وہ ایک وقتی اثر ہے، جس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

آج کل مصر اور قسطنطنیہ میں دو قابل ذکر کتابیں چھپ رہی ہیں:

۱۔ کتاب الفہرست ابن الندیم، مسلمانوں کی قدیم علمی کوششوں کی ایک بے نظیر یادگار ہے۔ سب سے پہلے یورپ نے اس کا سراغ لگایا اور لیپزگ کے مشہور عالم پریس میں چھاپ کے شایع کیا لیکن چوں کہ یورپ کی تمام کتابوں کی طرح اس کی قیمت بھی بہت گراں تھی اس لیے معمولی استطاعت کے علم دوست اشخاص اس سے فایدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ ناظرین نہایت مسرت سے سنیں گے کہ اب اس کی نقل قسطنطنیہ کے ایک تاجر نے چھپوانی شروع کر دی ہے۔

۲۔ الاصابہ، فی معرفتہ اسماء الصحابہ، رجال کی مشہور کتاب ہے جس کو ۱۸۴۸ء میں ایشیاٹک سوسایٹی بنگال نے کلکتہ میں چھپوا کر شایع کیا تھا۔ اب مصر کی ایک نئی شرکت (کمپنی) اس کی نقل چھاپ رہی ہے۔ پہلا حصہ عن قریب شایع ہوگا۔

سنہ رواں (۱۹۰۵ء) میں ۹۷،۹،۲۸،۶۴،۱ گینی، اشاعت علوم و معارف پر انگلستان میں صرف کی گئی۔

بابر نامہ:

الیاس وِلکنس، موجودہ زمانے میں یورپ کا ایک جلیل القدر مستشرق (اورینٹلسٹ) گزرا ہے جس کو مشرق کی تین مشہور زبانوں، عربی، فارسی اور ترکی سے خاص طور پر دل چسپی تھی۔ یورپ میں بڑے بڑے اہم کام معمولی لوگوں کی شخصی توجہ سے انجام پاتے ہیں اور آگے چل کر عظیم الشان صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ الیاس وِلکنس نے جب ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا تو اس کی شفیق والدہ نے ایک معقول رقم اس کام کے لیے وقف کر دی کہ یورپ کے منتخب اور فاضل مستشرقوں کی ایک انجمن قائم کی جائے جس کا مقصد مشرقی علوم والسنہ کے آثار کی حفاظت ہو۔ عربی، فارسی اور ترکی کی ان نایاب اور نادر کتابوں کا سراغ لگائے۔ جن کا نام صفحہ روزگار سے مٹ رہا ہے اور تصحیح و تہذیب کے بعد چھاپ کر شایع کرے۔ غرض یہ تھی کہ بیٹے کی یادگار میں ایک ایسی انجمن قایم ہو، جو اس کے مذاق اور دل چسپی کے کام کو ہمیشہ جاری رکھے۔ چناں چہ اس انجمن کا نام بھی یادگار الیاس وِلکنس رکھا گیا اور ایک منتخب جماعت اس کام میں مشغول ہوگئی۔

اس انجمن کی کوششوں سے اس وقت تک دو کتابیں شایع ہو چکی ہیں:

۱۔ تاریخ طبرستان

۲۔ بابرنامہ

بابرنامہ سلطنت مغلیہ ہند کے موسّسِ بابر شاہ کی سوانح عمری ہے۔ جس کو خود بابر نے چغتائی ترکی میں روزنامچے کے طرز پر مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں شایع ہو چکا ہے، لیکن اصل کتاب نایاب تھی۔ انجمن مذکور نے نہایت کوشش سے سر سالار جنگ مرحوم کے کتب خانے کا ایک نسخہ بہم پہنچایا جو نہایت خوشخط، صحیح اور قدیم ہے اور اس کا نفیس عکس لے کر کتاب کو اصلی صورت اور وضع میں شایع کیا۔ یورپ کی مستشرق جماعت مشرقی علوم و آثار کی جو خدمت کر رہی ہے، اس کا ایک ادنیٰ پیمانے پر نمونہ، اس کتاب کی اشاعت ہے۔

بابرنامہ (۳۸۲) صفحوں کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ چوں کہ اصل کتاب میں جابجا مختلف تاریخی واقعات کا ذکر ہے، سیکڑوں شہروں اور لوگوں کے نام آئے ہیں، اس لیے (۱۰۱) صفحوں کی ایک مبسوط انڈکس تیار کر کے آخر میں لگادی ہے جس سے ہر نام اور ہر واقعے کا فوراً پتا لگ سکتا ہے۔

''حقوق المراۃ فی الاسلام''، احمد بک آجایف ایک مشہور مسلمان روسی مصنف ہے جس نے اسلام کے متعلق متعدد کتابیں روسی زبان میں تصنیف کی ہیں۔ حال میں اس نے ایک نئی کتاب اس عنوان پر شایع کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب اور عجم میں عورتوں کی کیا حالت تھی! اور اسلام نے ان کی صلاح اور ترقی کی کہاں تک کوشش کی! اور کیا کیا حقوق عطا کیے؟ مصر میں اس کا عربی ترجمہ بھی شایع ہو گیا ہے اور تقریباً بارہ آنے قیمت ہے۔ دفتر الہلال مصر سے مل سکتا ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

دارالعلوم، ندوہ، لکھنؤ(۱)

۱۔ ماہنامہ الندوہ۔ لکھنؤ، دسمبر ۱۹۰۵ء، ص ۲۷ تا ۳۲

علمی خبریں

(۲)

اللغۃ العامہ: بیسویں صدی کی حیرت انگیز ایجادات اور انکشافات نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو تمدّنی، علمی اور تجارتی تعلقات پیدا کر دیے ہیں، وہ روز بروز ایک ایسے ذریعے کی ضرورت ظاہر کر رہے ہیں جو بطور ایک مشترک زبان کے باہم مستعمل ہو۔ یورپ کے علمی اثرات نے مشرق میں متعدد مغربی زبانیں رائج کر دی ہیں اور یورپ کے سیاح اور تاجر اس کی بدولت ہر جگہ اپنی زبان کے سمجھنے والے موجود پا کر کچھ بہت زیادہ دقتوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ خود یورپ میں فرنچ زبان ایک مشترک زبان کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ یورپ کے ہر حصے میں اس کے جاننے والے بہ کثرت موجود ہیں۔ اس بنا پر درحقیقت اگر کسی عام زبان کی ضرورت ہے تو مغربی تعلقات کی بہ دولت صرف مشرقی ممالک کو کیوں کہ ہندوستان کے باشندے برٹش حکومت کی وجہ سے یورپ کی زبانوں میں سے صرف انگریزی سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے انگلستان کے علاوہ یورپ کے دیگر حصوں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مگر یورپ کی آسایش پسند اور زیادہ بہتر حالت کی طلب گار طبیعتیں فرانسیسی زبان کی آسانیوں پر قانع نہیں ہیں۔ بیسیوں فاضل اور السنۂ عالم کے ماہر اس کوشش میں مصروف ہیں کہ تمام دنیا کے لیے نہیں تو کم از کم یورپ بھر کے لیے ایک آسان، سہل، خوش لہجہ زبان وضع کی جائے جس کو معمولی توجہ سے ہر شخص حاصل کر سکے اور تمام اقوامِ یورپ میں ایک مشترک ذریعۂ گفتگو ہو۔ اس وقت تک اس مقصد میں علمائے یورپ کو جس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کی اجمالی کیفیت ایک علمی خبر کی صورت میں یہاں درج کی جاتی ہے۔

''مسلمانوں کی گذشتہ علمی ترقی'' ایک عجیب سبجیکٹ ہے، جس پر یورپ کی متضاد نگاہیں

پڑ رہی ہیں۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، نہ انھوں نے کوئی نئی بات دریافت کی، نہ کسی علمی مسئلے کو ایجاد کیا، دوسری طرف بعض مستشرقین کی جماعت مسلمانوں پر اس قدر مہربان ہے کہ دنیا بھر کے علمی مسایل اور تحقیقات کے بانی مسلمانوں ہی کو قرار دیتی ہے۔ فرانس کا مشہور مستشرق لیون فائیس کا دعویٰ ہے کہ عام اور مشترک زبان کے موجد بھی مسلمان ہیں۔ سب سے پہلے شیخ محی الدین عربی نے چھٹی صدی میں صوفیوں کے لیے ایک خاص زبان تیار کی، جس میں عربی، فارسی اور عبرانی زبانوں سے الفاظ منتخب کر کے جمع کیے تھے اور بلبیلان نام رکھا تھا۔ مصنف مذکور اس نام کا مطلب بھی بتلاتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بلبیلان کے معنے زندہ زبان کے ہیں کیوں کہ واضع کا نام بھی محی الدین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لیون فائیس نے اس تحقیق سے ہم پر ایک بڑا احسان کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ مستشرقین کے اور بہت سے احسانوں کی طرح اس احسان کو بھی ہم قبول نہیں کر سکتے۔ شیخ محی الدین عربی کی تصنیفات ان کے خاص وضع کردہ اصطلاحات سے بھری ہوئی ہیں، اگر ''بلبیلان'' سے مراد یہ اصطلاحات ہیں تو سخت غلطی ہے اور اگر کوئی اور زبان مراد ہے تو اس کے ذکر سے ہماری تاریخیں خاموش ہیں۔

یورپ میں سب سے پہلے سولھویں صدی کے مشہور فلاسفر لارڈ بیکن نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ مگر غالباً اس کو کوشش کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بیکن کے بعد دیکرت ولینس وبشر نامی ایک عالم نے اس ضرورت پر توجہ کی۔ الفاظ وضع کیے، صرف ونحو مرتب کی اور ایک مستقل کتاب میں اپنی کوششوں کے نتایج درج کیے۔ یہ پہلی کتاب ہے، جو یورپ میں اس عنوان پر لکھی گئی۔ اس کے بعد اور بہت سے لوگوں نے کوششیں کیں، بعض زبانیں خاص خاص جماعتوں میں رائج بھی ہو گئیں لیکن چوں کہ ان تمام زبانوں میں بے انتہا نقص تھے اور عام ہونے کی کافی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں، اس لیے کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۸۷۹ء میں یکایک ایک نئی کتاب چھپ کر شایع ہوئی، جس کو اس عنوان پر پہلی کامیاب کتاب سمجھنا چاہیے۔ اس کا مصنف جرمنی کا مشہور عالم السنہ ڈاکٹر شیلیر تھا۔ جس نے کامل بیس برس کی محنت میں یورپ کی تمام زبانوں سے مختلف الفاظ جمع کر کے ایک آسان زبان تیار کی اور اس کے اصول وقواعد اس کتاب میں ترتیب دیے۔ کتاب کے شایع ہوتے ہی یورپ بھر میں از سر نو توجہ پیدا ہو گئی۔ جرمنی اور وسط یورپ میں عام طور پر اس زبان کو لوگ حاصل کرنے لگے۔ سیکڑوں

آدمیوں میں باہمی بول چال اور خط وکتابت کا ایک ذریعہ بن گئی۔ایک انجمن بھی قائم کی گئی جس کا مقصد اس زبان کی اشاعت اور ترقی تھا۔کچھ عرصے میں جب اس نئی زبان کے جاننے والے بہ کثرت پیدا ہوگئے تو ایک کانفرنس بھی قایم کی گئی،جس کے اجلاس مختلف مقاموں میں منعقد ہوتے تھے اور اسی زبان میں تقریریں کی جاتی تھیں۔خاص خاص اخبارات بھی جاری کیے گئے جس میں تمام خبریں اور مضامین اسی زبان میں درج کیے جاتے تھے۔یہ تمام کارروائی اس امر کا عمدہ ثبوت تھی کہ یورپ کی اس ضرورت کو ڈاکٹر شیلیر کی بست سالہ کوشش نے پورا کردیا اور یہ زبان تھوڑے ہی عرصے میں تمام یورپ کے باہمی تعلقات کا ذریعہ بن جائے گی۔لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہ خیال غلط ثابت ہوگیا اور شوراشوری بےنمکی سے مبدل ہوگئی۔انیسویں صدی کے آخری برسوں میں جب اس زبان کی ترقی کی کوششوں کو تلاش کیا گیا تو یورپ میں کہیں ان کا نشان نہ تھا۔

ڈاکٹر شیلیر ہی کے زمانے میں ایک اور شخص بھی اپنی کوششوں کے نتایج کا انتظار کررہا تھا۔اس شخص کا نام ڈاکٹر زامنوف تھا۔بارہ برس کی محنت کے بعد کامیاب ہوا اور اس طرح کامیاب ہوا کہ جس ضرورت کے لیے شیلیر کی بست سالہ کوشش مفید نہ ہوئی اس کو بارہ سال کی محنت سے پورا کردیا۔

ڈاکٹر موصوف نے اس زبان کا نام ''اسپرنٹو'' رکھا اور ''معلم اسپرنٹو'' کے نام سے اس کے اصول وقواعد ایک رسالے کی صورت میں شایع کیے۔

''اسپرنٹو'' ایک سلیس اور آسان زبان ہے،جس کے مادے بتیس ہزار سے زاید نہیں۔یورپ کی تمام زبانوں سے ایسے الفاظ منتخب کیے ہیں جن سے زیادہ سلیس الفاظ ان زبانوں میں نہیں مل سکتے۔ہر مفہوم کے لیے انھیں منتخب الفاظ میں سے ایک مناسب لفظ قرار دیا ہے۔اور کوشش کی ہے کہ ترکیب،مخارج،آواز،اُسلوب کے لحاظ سے کوئی لفظ مشکل نہ ہو۔''اسپرنٹو'' صرف یورپ کے باہمی تعلقات کی آسانی اور سہولت کے لیے وضع کی گئی ہے،اس لیے صرف یورپ ہی کی زبانوں سے الفاظ چنے گئے،تاکہ ہر زبان کا بولنے والا اپنی زبان کی شمولیت کی وجہ سے آسانی کے ساتھ سیکھ سکے اور صحت کے ساتھ بول سکے۔منتخب الفاظ کے علاوہ سینتالیس لفظ اور وضع کیے جن میں سے تیس لفظ منتخب لفظوں کے ساتھ ترکیب پاکر مختلف معانی پر دلالت کرتے ہیں اور سترہ الفاظ ترکیب پاکر معانی میں تصریفی تغیر پیدا کرتے ہیں۔اس زبان کی کل کاینات صرف

اتنی ہے، لیکن انھیں الفاظ سے کروڑوں الفاظ ترکیب پاسکتے ہیں۔

''معلم اسپرنٹو'' کے شایع ہوتے ہی یورپ بھر میں اس نئی زبان کا چرچا ہونے لگا اور سہولت اور آسانی کی وجہ سے نہایت قلیل عرصے میں ہزاروں آدمی بے تکلف سیکھ گئے۔ روس، جرمنی اور فرانس میں عام طور پر رائج ہوگئی اور نہایت سرعت سے یورپ کے دیگر حصص میں پھیلنے لگی۔ خود ڈاکٹر زامنھوف نے معلّم اسپرنٹو کو یورپ کی بارہ زبانوں میں چھاپ کے شایع کیا تاکہ ایک ہی وقت میں یورپ کا تمام حصہ اسپرنٹو سے واقف ہوجائے۔

یہ زبان آج یورپ میں جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ مختلف علوم و مذاق کی ایک سو پچیس سے زاید کتابیں اسپرنٹو میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ ہومر، ورجیل، شکسپیر، بومر کی وہ نظمیں جو قدیم و جدید یورپ کی شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، مدت ہوئی اسپرنٹو میں شایع ہوچکی ہیں، ترجمے کے علاوہ خاص مستقل تالیفات اور تصانیف کی تعداد بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ متعدد اخبارات بھی شایع ہوتے ہیں۔ سینٹ لوئیس کی نمایش میں جہاں دنیا بھر کی علمی زبانوں کی تصنیفات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا تھا۔ وہاں یہ نوخیز زبان بھی اپنی عمر کے لحاظ سے ایک معقول سرمایہ لیے ہوئے موجود تھی، (۲۵۰) کتابیں مختلف علوم اور مذاق میں، (۳۰۰۰) ڈاک کے خطوط، (۲۵) اخبار جو یورپ کے مختلف شہروں سے شایع ہوتے ہیں۔ نہایت قلیل عرصے میں اس قدر ترقی کچھ کم حیرت انگیز اور عجیب نہیں ہے۔

آج یورپ میں اسپرنٹو کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے جس میں سے دس ہزار سے زیادہ صرف فرانس میں موجود ہیں۔

اگست ۱۹۰۴ء میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یورپ کے تمام حصوں سے اسپرنٹو کے بولنے والے جمع ہوئے تھے۔ کانفرنس کی تمام کارروائی اسی زبان میں ہوئی اور اسپرنٹو کی ترقی اور اشاعت کی تدابیر پر غور کیا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو دن کے لیے ایک چھوٹا سا شہر آباد ہوگیا ہے جہاں کے باشندوں کی بولی اسپرنٹو ہے۔

اسپرنٹو جس ضرورت کے پورا کرنے کے لیے وضع کی گئی اس کا منشا صرف یہ تھا کہ ایک ایسی عام اور مشترک زبان تیار کی جائے جس کا تلفظ آسان ہو اور بغیر انہماک اور غیر معمولی توجہ کے ہر شخص تھوڑی سی کوشش سے سیکھ سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسپرنٹو نے اس ضرورت کو اس

خوبی کے ساتھ پورا کردیا جس سے بہتر صورت غالباً ممکن نہیں۔ آسانی اور سہولت اس سے زیادہ کیا ہوسکتی ہے کہ اوڈیسہ میں ایک شخص کو اسپرنٹو کا شوق ہوا تو ایک دن کی کوشش میں بے تکلف بولنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس قدر سہل اور آسان زبان اگر تھوڑے ہی عرصے میں تمام متمدّن ممالک کی مشترک زبان بن جائے تو کیا تعجب ہے۔ مگر چوں کہ اسپرنٹو کا مادہ صرف یورپ کی زبانوں سے لیا گیا ہے اس لیے درحقیقت یورپ ہی کے لیے آسان اور مفید ہوسکتی ہے۔ مشرق کی کسی زبان کا بولنے والا جو مغربی زبانوں کے لہجہ اور تلفظ سے قدرتاً نامانوس ہے، ہرگز اسے آسانی سے حاصل نہیں کرسکتا جو کسی مشترک زبان کے لیے ضروری ہے۔ تاہم بہ نسبت یورپ کی منتظم اور قدیم زبانوں کے اس کا حاصل کرنا مشرق کے لیے آسان اور بہت زیادہ آسان ہے۔

کتاب الحیوان:

جاحظ کی تصنیفات میں سے دو کتابیں مشہور ہیں:

۱۔ کتاب البیان والتبیین

۲۔ کتاب الحیوان

پہلی کتاب ۱۳۱۱ ہجری میں چھپ کر شایع ہوچکی ہے۔ دوسری کتاب نایاب تھی مگر حال میں مصر کے ایک مشہور تاجر محمد سامی نامی نے اپنے اہتمام میں چھپوانا شروع کردیا ہے۔ پوری کتاب سات جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد شایع ہوگئی ہے جس کے دو سو صفحات ہیں۔ مصر میں اس کتاب کے صرف دو نسخہ تھے۔ ایک مشہور ادیب محمود شنقیطی کے کتب خانے میں، دوسرا ایڈیٹر المقتطف کے کتب خانے میں۔ کتاب نہایت سرعت سے چھپ رہی ہے۔ امید ہے کہ باقی جلدیں بھی عن قریب نکل جائیں گی۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

ندوہ، لکھنؤ (۱)

۱۔ ماہنامہ الندوہ۔ لکھنؤ، جنوری ۱۹۰۶ء، ص ۲۶ تا ۳۱

علمی خبریں

(۳)

کتاب الام، جو امام شافعی کی مشہور، ضخیم اور مبسوط تصنیف ہے اور جس کے زیر طبع ہونے کی خبر کسی گذشتہ اشاعت میں درج ہو چکی ہے، اس کی چار جلدیں مطبع میری بولاق سے چھپ کر شایع ہو گئیں۔ کتاب کی کل سات جلدیں ہیں، باقی جلدیں بھی نہایت سرعت سے چھپ رہی ہیں۔ حاشیہ پر امام صاحب کی تین وہ کتابیں بھی چھاپی ہیں، جن میں مسند اور اختلاف الحدیث دو قابل ذکر کتابیں ہیں۔ کتاب الام میں پہلی کتاب کتاب الطہارۃ ہے اور آخری کتاب الشروط، اور اس طرح عبادات اور معاملات کے تمام ابواب آ گئے ہیں۔

اس کتاب کے پبلشر سیّد احمد بک حسینی ہیں اور انھیں سے مکتبہ السید مصطفےٰ البابی، محلہ خان الخلیل کے پتے سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ زراعت پر چاند کی مختلف حالتوں اور روشنی کا اثر پڑتا ہے، لیکن حال کے تجربوں سے یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مشہور فرانسیسی ہیئت دان، ایم کسیتول فلاماریون نے آلو اور بعض اور چیزوں کی کاشت ایسے موقعوں میں کی، جب چاند ٹھیک عروج کے درجوں میں تھا، مگر ثابت ہوا کہ چاند سے زراعت ذرہ بھر متاثر نہیں ہوتی، تجربہ کا سلسلہ جاری ہے۔

حال میں امریکہ کے ایک مضمون نگار نے یہودیوں کی موجودہ تعداد کے متعلق ایک دل چسپ مضمون لکھا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ آج تمام دنیا میں ۱۱،۸۱،۲۳۴،۱ یہودی ہیں جس میں سے نصف تعداد تمام دنیا میں اور باقی صرف ممالک روس میں آباد ہے۔ اس نے یہودیوں کی

خوشحالی اورغربت کا بھی اندازہ کیا ہے۔اس کا بیان ہے کہ یہودیوں میں دس فی صدی متمول اور امیر ہیں اور تیس فی صدی غربا اور فقرا۔

ابوالکلام آزاد دھلوی
دارالعلوم،ندوہ،لکھنؤ(۱)

ا۔ ماہنامہ الندوہ۔لکھنؤ، مارچ ۱۹۰۶ء، ص ۴۰

ایڈیٹوریل نوٹس

ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان

کتب خانے کی ضرورت!

سولھویں صدی کے مشہور فلاسفر لارڈ بیکن نے انسانی تعلیم کے دو ذریعے بتلائے ہیں:

۱۔ معلّم ذی روح اور

۲۔ معلّم غیر ذی روح!

معلّم غیر روح قوم کے افضل ترین حصے کی علمی جدوجہد کے تحریری نتایج ہیں۔ جن کے پَر تو تعلیم نے مسلمانوں کے قدیم دور کو دنیا بھر میں روشن اور ممتاز بنا دیا تھا۔ موجودہ دنیا میں یورپ کی مہذب قومیں آخر الذکر معلّم کی تعلیم سے جس طرح اپنے ضمیر کو منور کرتی ہیں۔ وہ آج ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ یورپین سلطنت کے اثر اور تعلیمی تحریک نے ہندوستان میں بھی اس معلّم کی طرف توجہ دلا دی ہے۔ ملک میں جا بجا فاتح زبان کی درس گاہیں قایم ہیں اور ان کی شان دار عمارتوں کا ایک حصہ اِس معلّم کے لیے بھی وقف ہے۔ انگریزی علوم کے مستقل کتب خانے بہ کثرت نہیں تو تھوڑے بہت موجود ہیں، لیکن اگر معلّم غیر ذی روح کے پرتو تعلیم سے خالی ہیں، تو عربی کی درس گاہیں! اور اگر اس طریقِ تعلیم سے غافل ہیں، تو عربی کے نام لیوا! مطابع کی ایجاد نے دنیا کی تمام علمی زبانوں کو مشترک فایدہ پہنچایا ہے۔ عربی اور فارسی کی سیکڑوں کتابیں چھپ کر شایع ہوگئی ہیں، مگر ہمارے لیے ان کا وجود وعدم برابر ہے، کیوں کہ ہماری نظروں سے چھاپے خانے کے وہ فواید جو عربی علوم نے حاصل کیے ہیں، پوشیدہ ہیں۔ اگر ایک مسلمان تعلیم یافتہ اپنی قوم کے قدیم علمی کارناموں کو تلاش کرنا چاہے تو کہاں جائے......؟ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا ہو چلا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عربی کا مذاق رو بہ تنزل، مگر پھر بھی عربی کے جاننے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے اور گورنمنٹ کی نئی توجہ اس جماعت کو وسیع کرنا چاہتی ہے، لیکن اگر یورپ اور ممالکِ اسلامیہ

کی چھپی ہوئی قیمتی کتابوں سے وہ فایدہ اُٹھانا چاہیں تو کدھر کا رُخ کریں؟ کیا ملک بھر میں ایک بھی پبلک کتب خانہ ہے جہاں علوم عربیہ کی تمام نادر اور بیش قیمت کتابوں کا ذخیرہ موجود ہو؟ نہیں ہے، اور افسوس کہ نہیں ہے!

کتب خانہ بانکی پور:

بانکی پور کا مشہور کتب خانہ، اس میں شک نہیں کہ اپنے بانی کی علمی فیاضی کا قابلِ قدر نمونہ ہے، مگر چوں کہ پورے طور پر پبلک نہیں ہے (۱) اس لیے قوم کی علمی ضرورتوں کے لیے اس کا وجود سودمند بھی نہیں ہے۔ ضرورت ہے ایک ایسے کتب خانے کی، جس میں نایاب قلمی کتابوں کے ساتھ عربی کا تمام مطبوعہ ذخیرہ موجود، پبلک ہو اور اس کا فایدہ کسی خاص شہر تک محدود نہ ہو۔

ندوۃ العلماء کا مقصدِ قیام:

ندوۃ العلماء نے قوم میں روشن خیال، محافظِ علوم، ہمدردِ ملک علما کا پیدا کرنا اپنا مقصد قرار دیا ہے۔ وہ قوم کی اخلاقی اور علمی حالت کی اصلاح اور اس لیے علوم عربیہ کا ایک دارالعلوم قایم کرنا چاہتا ہے تاکہ دنیاوی علوم کے ایک عظیم الشان مرکز کی موجودگی میں مذہبی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے والا مرکز قوم میں موجود ہو۔ اس لیے اس کا ایک اہم فرض یہ بھی تھا کہ علوم عربیہ کا ایک عظیم الشان کتب خانہ اپنی سرپرستی میں قایم کرے اور جو لوگ اس کے حلقۂ تعلیم میں شامل ہو کر اپنی زندگی مذہبی اور علمی خدمات میں صرف کرنا چاہتے ہیں، وہ معلّم غیر ذی روح کے پرتو تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ ندوۃ العلما نے اس ضرورت پر توجہ کی اور اس کی بنیاد قایم کر کے ایک حد تک اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب قوم کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے کہ اسے تکمیل تک پہنچا دے۔

کتب خانے کا قیام:

اس مقصد کے متعلق علمی کام شاہ جہان پور کے اجلاس سے شروع ہوا۔ سب سے پہلے مولوی عبدالرافع صاحب ڈپٹی کلکٹر نے تقریباً تین ہزار کتابوں کے بیش بہا عطیے سے اس کا بنیادی پتھر رکھا۔ پھر پٹنہ کے اجلاس میں مولوی عبدالعظیم صاحب نے دو سو کتابوں کا اس پر اضافہ کیا اور

مولوی سیّد عبدالغنی صاحب نے تاریخ وادب کی ایک سو ایک کتابیں عطا فرمائیں۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً بعض اور عطیے بھی اس سرمایے کو وسیع کرتے رہے، جن میں نواب عالم گیر محمد خان صاحب بہادر جاگیردار بھوپال، سیّد حمید الدین صاحب رئیس پٹنہ، مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم لکھنؤ، دایرۃ المعارف حیدر آباد دکن، سیّد احسن شاہ صاحب کے عطیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کتب خانے کے بعض نوادر:

اس وقت تک جس قدر کتابیں جمع ہو چکی ہیں، ان میں بعض ایسی نادر اور نایاب کتابیں بھی ہیں جو مجوزہ کتب خانے کی زینت اور افتخار کا باعث ہوں گی۔ یعقوب کندی مامون الرشید کے زمانے میں ایک مشہور حکیم گزرا ہے جس کو اسلام میں سب سے پہلے فیلسوف کا اعلیٰ خطاب دیا گیا۔ اس کے رسایل کا نادر الوجود مجموعہ اگر کوئی خوش قسمت کتب خانہ پیش کر سکتا ہے تو وہ دار العلوم ندوۃ العلما کا غریب کتب خانہ ہے۔ مدینۃ العلوم ارنیقی، تذکرۂ ہفت اقلیم امین رازی یہ دو کتابیں بھی کتب خانے کی قلمی کتابوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اوّل الذکر کے متعلق اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ کشف الظنون، جو مسلمانوں کے علوم وفنون کی واحد فہرست سمجھی جاتی ہے، اس کا ایک ماخذ ارنیقی کی یہی کتاب مدینۃ العلوم ہے۔ امین رازی کا تذکرۂ شعرا فارسی کے بہترین تذکروں میں ایک ممتاز تذکرہ ہے، جو اور تذکروں کی طرح اس وقت تک حلیۂ طبع سے محروم رہا۔ مگر دار العلوم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دورِ اکبری کے علمی تراجم کا غلغلہ ایک عرصے سے ملک میں بلند ہو رہا ہے، لیکن اس قصے کے سوا جس سے ابوالفضل کی زبانی ہماری قوت سامعہ متاثر ہوئی ہے اور کچھ معلوم نہ ہوا۔ دار العلوم کے کتب خانے میں چند کتابیں ایسی موجود ہیں، جن سے ہماری موجودہ معلومات پر بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اکبر کے علاوہ شاہ جہانی دور میں بھی سنسکرت سے کتابیں ترجمہ کی گئیں جن میں سے فن موسیقی کے متعلق ایک مبسوط کتاب دار العلوم کی بدولت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ فن موسیقی کے علاوہ موسیقی کے باکمالوں کا تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل ہے، جس سے دور مغلیہ کے اکثر باکمالان موسیقی کی خدمت میں ہم باریابی حاصل کر سکتے ہیں۔ سیّد احسن شاہ صاحب کا عطیہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ دو بیش بہا کتابیں ان کی توجہ سے کتب خانے کو میسر آ گئیں۔ حجۃ الاسلام غزالی کی تصنیفات میں جواہر القرآن ایک بے نظیر کتاب ہے، جو

اگر چہ چھپ کر شایع ہو چکی ہے، مگر کامل نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے علمی اشتیاق کو پورا نہیں کر سکتی۔ سیّد صاحب نے جواہر القرآن کا ایک قلمی نسخہ عنایت فرمایا ہے جو صحیح اور صاف ہونے کے ساتھ مکمل بھی ہے۔ دوسری کتاب قاموس کا ایک شاہی نسخہ ہے، جس پر مختلف شاہان مغلیہ کی مہریں ثبت ہیں اور عالم گیر کی مہر صاف پڑھی جاتی ہے۔

کتب خانہ شبلی کی جامعیت:

اس وقت تک تقریباً چار ہزار کتابیں مختلف علوم وفنون کی جمع ہو چکی ہیں۔ مگر درحقیقت موجودہ حالت کو اس اصلی صورت سے کوئی نسبت نہیں، جس کو ہماری آنکھیں دارالعلوم کے ایک شان دار ایوان میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہندوستان مٹ چکا ہے مگر پھر بھی سیکڑوں زر و جواہر موجود ہیں۔ افسوس کہ ان سے کوئی فایدہ اُٹھانے والا نہیں! ضرورت ہے ایک ایسے کتب خانے کی، جو ان تمام بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹ کر اپنی سرپرستی میں لے (۲) اور ان کی مجموعی قوت کے ذریعے معلّم غیر ذی روح کی تعلیم سے قوم کے ضمیر کو روشن کرے۔ ندوۃ العلما ایک ایسے ہی کتب خانے کو دارالعلوم میں قایم کرنا چاہتا ہے اور ایک حد تک قایم کر چکا ہے۔ موجودہ صورت اگر چہ معقول نہیں ہے لیکن ان شاء اللہ عنقریب معقول ہو جائے گی، جب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا پرائیویٹ کتب خانہ اس کتب خانے میں شامل ہو جائے گا۔ علوم عربیہ کے ہم درد بے حد مسرت سے اس خبر کو سنیں گے کہ مولانا نے قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ اپنا قیمتی کتب خانہ، جو ساری عمر کی علمی تلاش کا نتیجہ ہے، قوم کے لیے وقف کر دیں اور چوں کہ دارالعلوم سے بہتر کوئی مقام عربی علوم کے کتب خانے کے لیے نہیں ہو سکتا اس لیے دارالعلوم کے کتب خانے کو اس کا بہترین مستحق سمجھنا ایک واقعی بات ہے۔ مولانا کے کتب خانے کی ہم نے سیر کی ہے اس لیے ہم خوش ہیں کہ مولانا کی توجہ سے قوم کے لیے ایک بے بہا خزانہ وقف عام ہو جائے گا۔ مولانا کی تصنیفات کا بڑا حصہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے عام خیال یہ ہوگا کہ ان کے پرائیویٹ کتب خانے میں تاریخی ذخیرے کے سوا اور علوم کی کتابیں خال خال ہوں گی، مگر درحقیقت یہ خیال صحیح نہیں! مولانا کا مذاق جس طرح جامع واقع ہوا ہے اسی طرح ان کا کتب خانہ بھی مختلف علوم پر حاوی ہے۔ تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، سب ہی کچھ ان کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ فارسی لٹریچر اور شاعری کے مذاق نے

فارسی لٹریچر کا عطر بھی مہیا کر دیا ہے۔ قیمتی ہونے کے لحاظ سے اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ ممالک اسلامیہ کے علاوہ یورپ کی چھپی ہوئی اکثر کتابیں اس کتب خانے میں موجود ہیں۔ مطبوعہ ذخیرے کے علاوہ وہ کتابیں بھی ہیں جو اس وقت تک دنیا میں شایع نہیں ہوئیں اور ممالک اسلامیہ یا ہندوستان کے بعض نامور کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا کی علمی جستجو نے ان کا سراغ لگایا اور بیش بہا رقمیں صرف کر کے ان کی نقلیں مہیا کیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ایک بڑی بات یہ ہے کہ بغیر کسی کوشش اور جاں فشانی کے قوم کے لیے اسلامی لٹریچر کا اعلیٰ ترین منتخب حصہ مہیا ہو جائے گا، جس کی قابل سے قابل اور فاضل سے فاضل ممبروں کی کمیٹی سے بھی ہم کو توقع نہیں۔ مولانا کے کتب خانے میں کسی کتاب کا نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ کتاب ہمارے موجودہ علمی لٹریچر کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتی۔

حضرت شبلی کا عزم ایثار:

دارالعلوم کی موجودہ حالت محض ایک بنیاد ہے کہ قوم کی فیاضیوں پر آس لگائے اس کی اصلی صورت کا خاکہ کھینچ رہے ہیں۔ اس لیے دارالعلوم میں کوئی ایسا عمدہ ہال موجود نہیں ہے، جس میں کتب خانے کو سجایا جائے اور تعلیمی حصے کا بھی ہرج نہ ہو۔ اس بنا پر مولانا نے اس عطیے کو اس شرط پر مشروط کر دیا ہے کہ جب تک کتب خانے کے لیے کوئی عمدہ اور مناسب عمارت مہیا نہیں کی جائے گی، کتب خانہ دارالعلوم کے کتب خانے میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اب اس امر کا فیصلہ قوم کے ہاتھ میں ہے کہ مولانا کے علمی عطیے سے ہم کو فایدہ اُٹھانا چاہیے اور اس لیے اس شرط کے پورا کرنے کا سامان مہیا کرنا چاہیے، یا اپنی خاموشی سے ثابت کر دینا چاہیے کہ علمی احساس تو مدت ہوئی رخصت ہو چکا ہے، مذہبی احساس سے بھی اب ہاتھ دھو لینا چاہیے۔

مولانا شبلی نعمانی کی افسوس ناک علالت کی خبر اخباروں میں مشتہر ہو چکی ہے۔ مگر الحمدللہ! اب طبیعت رو بہ صحت ہے۔ الٰہ آباد سے تشریف لے آئے ہیں اور بہ دستور اپنے مشاغل میں مصروف ہیں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

ندوہ، لکھنؤ (۳)

حواشی

۱۔ بانکی پور کا تاریخی کتب خانہ اب اپنے بانی کے اسم سامی وگرامی کے حوالے سے اپنے نئے نام ''خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ'' سے بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ اب ''یہ پورے طور پر پبلک ہے۔'' اور اپنے نامور ذخیرۂ مخطوطات کے حوالے سے دنیا کی چند اہم لائبریریوں کی صف میں شامل ہے۔ اس کی شکل میں ابوالکلام آزاد کے علمی خواب کی تعبیر کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ (ا۔س۔ش)

۲۔ ندوۃ العلماء کا کتب خانہ حضرت علامہ شبلی کے نام سے موسوم ہے۔ وہ اگرچہ اپنی ابتدائی حالت سے گزر چکا ہے اور حضرت علامہ کی شرط کے مطابق ایک مستقل اور شان دار عمارت میں قایم ہے اور اپنے ذخیرۂ علمی کے لحاظ سے ملک کے چند اہم کتب خانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے، لیکن بہ حیثیت کتب خانے کی جامعیت اور وقت کی ضرورت کے مولانا ابوالکلام کی دعوتِ ایثار والتفات اب بھی اپنی حقیقی تعبیر کی محتاج ومنتظر ہے۔ (ا۔س۔ش)

۳۔ ماہنامہ الندوہ۔ لکھنؤ، بابت ماہ فروری ۱۹۰۶ء، ص ۱تا۶

القضاء فی الاسلام

قضاءت یا ججی اس زمانے سے دنیا میں چلی آتی ہے جب کہ انسان نے آئے دن کے باہمی جھگڑوں سے تنگ آکر سلطنت اور حکومت کے تقیدات بخوشی قبول کرے۔ قضاءت ہی کی ضرورتوں نے حکومت کی بنیاد ڈالی اور قضاءت کی ضرورتوں نے شخصی سلطنت کا استحقاق دنیا سے منظور کرالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دو شخصوں کا باہمی جھگڑا بغیر تیسرے شخص کی مداخلت کے کسی صورت میں فیصل نہیں ہوسکتا۔ زید کا دعویٰ ہے کہ زمین کا فلاں حصہ میری ملکیت میں داخل ہے۔ عمر اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس حصے پر فلاں زمانے سے میرا تصرف قایم ہے۔ اگر مدعی کا دعویٰ صحیح ہے تو گذشتہ زمانے میں کیوں نہیں مطالبہ کیا گیا؟ زید اس کے جواب میں متعدد وجوہ پیش کرتا ہے اور مختلف دلایل سے ثابت کرتا ہے کہ اتنے زمانے کی خاموشی اس امر کے لیے مستلزم نہیں ہے کہ میں حق ملکیت سے دست بردار ہو جاؤں۔ فرض کرو کہ اس مقدمے میں زید برسرِ حق ہے۔ مگر جب عمر اس زمین پر قبضہ کر چکا ہے اور اس کا مدعا یہی ہے کہ اس زمین کو ناجایز طریقے سے حاصل کرلے تو ایسی حالت میں زید کے مسکت دلایل اور قاطع سے قاطع شواہد عمر پر کیا اثر کر سکتے ہیں؟ اس طرف سے دلیلیں پیش کی جائیں گی اور اس طرف سے جواب اوّل کا اعادہ! ظاہر ہے کہ اس صورت میں فیصلہ ممکن نہیں لیکن اگر ان دونوں شخصوں نے بکر کو اپنا جج مقرر کرلیا اور اس کے ہر فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے تو اس صورت میں آسانی ہے، فیصلہ ہوسکتا ہے اور اکثر حالتوں میں حق حق دار کو مل سکتا ہے۔ جج غور کرے گا کہ مدعی کا دعویٰ کن دلایل پر مبنی ہے؟ مدعا علیہ اس کی مدافعت میں کیا دلیل پیش کرتا ہے؟ مثلاً صورت مفروضہ میں زید نے جو وجوہ پیش کیے ہیں، وہ قرائنِ صحیح سے، واقعات کے اتفاق سے اور دلایل و شواہد کی تائید سے بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ عمر اس کے جواب میں صرف جواب اوّل کا اعادہ کرتا ہے۔ یہ اس

امر کی دلیل ہے کہ اس کے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ لہٰذا زید کی اس دلیل کو تسلیم کر کے کہ ''اتنے زمانے کی خاموشی اس امر کے لیے مستلزم نہیں کہ میں حق ملکیت سے محروم ہو جاؤں'' بکر زید کے حق میں ڈگری دے گا۔ یہی وہ ضرورت ہے جس نے ابتدا میں انسان کو مجبور کیا کہ وہ ایک تیسرے وجود کو اپنا حکم قرار دے اور یہیں سے قضاۃ کی بنا پڑی، لیکن آگے چل کر جب تمدّن نے ترقی کی اور انسانی ضرورتوں اور تعلقات کا دامن وسیع ہوا تو قضاۃ کے اصول و قوانین میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں اور بہت سی نئی نئی باتیں اس میں داخل ہو گئیں۔ مثلاً مدعی اور مدعا علیہ کے خاص خاص فرائض قرار پائے۔ ثبوت دعویٰ کے طریقے زیادہ وسعت کے ساتھ اختیار کیے گئے۔ غرض کہ اسی طرح بہت سی نئی باتیں پیدا ہو گئیں اور رفتہ رفتہ یہاں تک ترقی کی کہ آج قانون کے پیمانے کا بڑا حصہ اسی مسئلے کی باریکیوں سے لبریز ہے۔

اسلام دین و دنیا کا جامع ہے، اس لیے اس کے مجموعۂ تعلیم میں اعتقادات اور عبادات کے ساتھ معاملات کا بھی مکمل حصہ موجود ہے۔ لیکن مخالفین کا دعویٰ ہے کہ اسلام آخری حصے سے تہی دست تھا، اس لیے رومن لا کی دریوزہ گری کر کے اس کمی کو پورا کیا گیا۔ اس مضمون میں ہم قانون کے حصۂ قضاۃ سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور دکھلانا چاہتے ہیں کہ بانی اسلامؐ نے کس جامعیت کے ساتھ اس مسئلے پر نظر ڈالی اور کس خوبی اور شائستگی سے اس کے قواعد اور قوانین ضبط کیے۔ اس بنا پر اس مضمون کے تین حصے ہوں گے:

۱۔ مدعی اور مدعا علیہ کے فرائض

۲۔ ثبوتِ دعویٰ کا طریقہ

۳۔ شہادت کے اصول

آج دنیا کے مہذب قوانین کی اگر تحلیل کی جائے تو آخر میں قضاۃ کے اصلی اصول یہی تین حصے نظر آئیں گے۔ لیکن اصل بحث سے پیشتر بہ طور تمہید کے ہم آداب قضاۃ اور آداب عدالت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اسلام نے قضاۃ اور عدالت کے جو آداب بتلائے ہیں، وہ قضاۃ کے اصلی مقصد امن اور صلاح کاری کے لیے کہاں تک مفید ہیں؟

آدابِ قضاۃ:

قاضی کا اصلی فرض یہ ہے کہ ملک میں امن قایم رکھے اور سوسایٹی کی باہمی مخاصمت کو دور کرے۔ دو شخصوں میں کسی خاص مسئلے کے متعلق خصومت پیدا ہوگئی ہے، ان کی خواہش ہے کہ قاضی کا انصاف ہمارے جھگڑے کا فیصلہ کردے، اس لیے قاضی کا فرض ہے کہ فریقین کے دعوے اور دلایل کو انصاف کے کانوں سے سنے اور قوت مرجحہ کا جو فیصلہ ہو، ٹھیک ٹھیک ان کو سنادے۔ لیکن بسا اوقات بعض جذبات ایسے طاری ہوجاتے ہیں اور بعض حالات اس قسم کے پیش آجاتے ہیں کہ قاضی اپنے فرض کی انجام دہی میں قاصر رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات دانستہ اور بعض اوقات نادانستہ ایسا فیصلہ کردیتا ہے، جو حق دار کو حق سے محروم کرنے والا اور ظالم کو ظلم کا عادی بنانے والا ہوتا ہے۔ دنیا کا مادی قانون اس خرابی کے صحیح علاج سے عاجزِ محض ہے۔ اس نے قانون بنادیا ہے، ضابطہ تیار کردیا ہے اور حکم کرتا ہے کہ قاضی اس پر عمل کرے لیکن قاضی کے دل یا کانشنس پر اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ واقعی وہ عمل کرے۔ مذہب کا کام دنیا میں یہ ہے کہ جو کام مادی قانون نہیں کرسکتا اس کو اپنے روحانی اور الٰہی قانون کے ہاتھوں انجام دے۔ دنیا کا قانون واقعات اور حالات کا تابع ہے، اس کی حکومت زبان پر ہے مگر مذہب دل کو دیکھتا ہے اور کانشنس پر اس کی حکومت قایم ہے۔ اس لیے اسلام نے اس نقص کا علاج کیا۔ ایک طرف قوانین وضع کرکے قاضی کے سامنے پیش کردیے اور دوسری طرف اپنی روحانی وعیدوں سے اس کے دل کو انصاف پر آمادہ کیا، حالات جمع ہوگئے ہیں، ناانصافی اور طرف داری کے جذبات کا ہجوم ہے، لیکن مسلمان قاضی کے سامنے اسلام کا مجموعۂ ہدایت رکھا ہے اور وہ سختی کے ساتھ بے انصافی سے روک رہا ہے۔ جرأت کرتا ہے مگر مخبرِ صادق کی سچی وعید عذاب اُخروی کا نقشہ سامنے پیش کردیتی ہے اور جھجک کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس لاعلاج مرض کا علاج ہے تو اسلام نے جو صورت اختیار کی ہے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔

حقیقی انصاف کا پہلا اصول یہ ہے کہ فریقین میں درجے اور حقوق کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق جایز نہ رکھا جائے، جو برتاؤ اور سلوک ایک فریق کے ساتھ کیا گیا ہے دوسرے فریق سے بھی وہی ملحوظ رہے اور دونوں کو ایک نظر سے دیکھا جائے۔

مساوات بین الخصمین:

مہذب دنیا میں مساوات اور حریت کا شور مچا ہوا ہے، لیکن وہاں کی عدالتیں بھی کلی مساوات کے منظر سے خالی ہیں۔ اگر مدعی معمولی عزت کا آدمی ہے اور مدعا علیہ اعلیٰ پوزیشن کا، تو عدالت آخرالذکر کے ساتھ رعایت سے پیش آتی ہے، عزت اور احترام کرتی ہے۔ عام قاعدہ کے خلاف کرسی دیتی ہے حال آں کہ عدالت کی دنیا کو عام دنیا کی حالت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ایک شخص دولت مند یا ذی خطاب ہے تو اپنے دایرے میں عدالت کو اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ عدالت میں مدعا علیہ مدعا علیہ کی حیثیت رکھتا ہے اگر چہ عدالت سے باہر خان بہادر۔ سی۔ آئی۔ اے ہو۔ اسلام دنیا کا اکیلا مذہب ہے، اسلامی قانون دنیا میں تنہا قانون ہے جس نے اس حقیقی اور اصلی مساوات کو دنیا میں قایم کیا۔

(۱)

(عن ام سلمہ) قال رسول اللہ صلعم من ابتلے بالقضاء بین المسلمین فلیعدل بینھم فی لخظۃ واشارتۃ ومقعدۃ ر ومجلسۃ ولا یر فع صوتہ علےٰ احد الخصمین مالا یر فع علی الاخر ......(۱)

(آنحضرت ﷺ نے فرمایا) جس شخص پر قضاۃ کا بوجھ پڑ جائے اس کا فرض ہے کہ نشست میں، طریق نشست میں، اشارات میں، تخاطب میں غرضے کہ ہر بات میں (مابین الخصمین) عدل کرے، یہاں تک کہ اگر ایک فریق سے چلا کر بات کرے، تو دوسرے سے بھی اسی طرح مخاطب ہو۔ اگر ایک فریق سے آہستہ بات کرے تو دوسرے سے بھی آہستہ گفتگو کرے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک فریق سے پیش آئے اسی طرح دوسرے سے سلوک کرے۔

(۲)

(عن علی علیه السّلام) ان رسول الله صلعم قال له، یاعلی! اذاجلس الیک خصمان، فلا تقض بینهما حتی تسمع من الا خر کماسمعت من الاوّل فانک اذافعلت ذلک تبین لک القضاء......(۲)

(حضرت علی کو آنحضرت ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ) اے علی، جب تمھارے پاس دو لڑتے ہوئے آدمی آئیں اور تم فیصلہ کرنا چاہو تو یاد رکھو کہ اس وقت تک فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک دوسرے فریق کی بھی اسی طرح نہ سن لو جس طرح فریق اوّل کی باتیں تم نے سنی ہیں۔

پہلی حدیث میں مسلمانوں کی شرط ہے **من ابتلی بالقضاء بین المسلمین،** مگر دوسری حدیث میں حکم مساوات عام ہے۔ اس لیے محققین علما کا فیصلہ ہے کہ اگر فریقین میں کوئی فریق نصرانی یا یہودی ہو تو بھی قاضی کا فرض ہے کہ مساویانہ سلوک سے پیش آئے۔ حضرت علی سے ایک حدیث مروی ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل کیا **لاتساؤ وهم فی المجالس.** ھم کی ضمیر ذمیوں کی طرف راجع ہے۔ لیکن محدثین کی عام تحقیق یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے چناں چہ محدث ابن جوزی نے اس کو علل میں شمار کیا ہے۔

رشوت کی سخت ممانعت:

انصاف سے باز رکھنے والی چیزوں میں ایک بے حد مؤثر چیز ''رشوت'' بھی ہے۔ قانون نے اس کو جرم قرار دیا ہے اور تحقیق پر قید کی دھمکی دی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ باوجود اس خوف اور وعید کے آج سیکڑوں مقدمے رشوت کی بہ دولت حق دار کو اپنے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ اسلام نے اس کا یہ علاج کیا کہ خدا کی بادشاہت کی اخروی عدالت کا قانون سنا کر سمجھا دیا کہ اگر رشوت لے کر دنیا کی قانونی سزا سے محفوظ رہ گئے تو یہ سمجھ لو کہ مرنے کے بعد ایک دوسری عدالت بھی انصاف کرنے کے لیے موجود ہے، جس کی سزا سے کوئی متنفس نہیں بچ سکتا۔ فرض کرو کہ قاضی نے

مدعاعلیہ سے رشوت لے کر مدعی کو حق سے محروم کردیا۔کارروائی اس احتیاط اور پوشیدگی کے ساتھ کی گئی کہ قانون کے متجسس کانوں تک اس کی خبر نہیں پہنچی۔ایسا ہونا ممکن ہے اور قانون اس کا کوئی علاج نہیں کرسکتا لیکن اگر قاضی مخبر صادقؐ کے پیرووں میں شامل ہے اور اسلام کی وعید اس کے کانوں تک پہنچ چکی ہے تو اگرچہ افشائے راز کا خوف نہ ہو، احتیاط اور پوشیدگی کا سامان مہیا ہو لیکن خدائی عدالت کا خوف اس کو رشوت خوری سے مانع آئے گا اور ایک غیر محسوس قوت اس بے انصافی سے اس کو روکے گی اور اس طرح روکے گی کہ کوئی مادی قوت اور دنیاوی طاقت اس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

(۱)

(عن عبد اللہ بن عمرؓ) قال رسول اللہ صلعم لعن اللہ الراشی والمرتشی......(۳)

(آنحضرت ﷺ نے فرمایا) خدا کی لعنت ہے رشوت لینے والے پر اور اس شخص پر، جو رشوت دے!

(۲)

(عن ثوبان) قال لعن رسول اللہ صلم الراشی والمرتشی والرایشی......(۴)

ثوبان روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر لعنت بھیجی جو رشوت لے اور اس پر بھی جو رشوت دے اور راشی اور مرتشی کے درمیان جو کوشش کرے۔

غضب اور غصہ کی ممانعت:

انصاف سے باز رکھنے والے اسباب میں وہ سبب زیادہ خطرناک ہے جس کا احساس خود قاضی کو نہیں ہوتا اور اضطراری حالت میں ایسا فیصلہ کردیتا ہے جو حق دار کو حق سے محروم کردیتا ہے اور غاصب کو غصب وظلم پر جرأت دلا دیتا ہے۔ یہ خطرناک سبب غصہ اور غضب ہے۔

بسا اوقات بعض حالات ایسے پیش آتے ہیں کہ قاضی کو طیش آجاتا ہے اور غصے کی حالت میں بغیر ارادے اور احساس کے ناانصافی کر بیٹھتا ہے۔ چوں کہ غصے کے جوش میں دلایل اور شواہد کی تنقید نہیں کر سکتا اس لیے اس کا فیصلہ اکثر حالتوں میں غلط ہوتا ہے۔ اسلام نے نہایت سختی سے اس کی ممانعت کی ہے۔

(عن ابی بکر) قال "سمعت رسول الله صلعم" یقول لایقضین حاکم بین اثنین، وھو غضبان. (۵)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حاکم کو کسی مقدمے کا ایسی حالت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ غضب اور غصے میں مبتلا ہو یعنی حالت غضب میں فیصلہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ غصہ اور غضب کے اثر سے فیصلہ محفوظ رہے۔

قاضی کے دروازے کو ہر وقت مظلوموں کے لیے کھلا رہنا چاہیے:

دنیا کی کوئی چیز اور کوئی ادا منفعت کے ساتھ ضرر سے خالی نہیں۔ تہذیب وتمدّن کی ترقی نے قاعدے اور ضبط اوقات کا دنیا کو عادی بنادیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کو یہ عادت بے حد فایدہ پہنچاتی ہے لیکن بعض حالتوں میں نقصان بھی ہوتا ہے۔ ایک مظلوم لٹ رہا ہے، ظالم کا دست تظلم اس کو تباہ کررہا ہے مگر وہ اپنی فریاد جب تک باضابطہ پیش نہ کرے، عدالت اس پر توجہ نہیں کرسکتی۔ ایسی حالت میں وہ مظلوم جو بدقسمتی سے غریب ومفلس بھی ہوگیا ہے، کہاں جائے اور کس کے آگے اپنی مظلومی کا قصہ دہرائے؟ عدالت کی فلک نما عمارت ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو وقت پر آئیں، ضابطے کو اپنا دستور العمل بنائیں اور مال و دولت صرف کرکے لٹی ہوئی دولت کو عدالت کی مدد سے واپس لیں۔ مگر غریب اور مفلس طبقہ اس ضابطے اور تمدّن کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اسلام دنیا میں امن قایم کرنا چاہتا ہے۔ تمدّنی شوکت اور ضابطے کی پیچیدگیوں کا طالب نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ایسے قوانین وضع کیے اور اس قسم کی شرطیں مقرر کیں، جو سادگی میں ڈوبی ہوئی ہیں، آسان ہیں، سہل ہیں اور امرا سے لے کر مفلس قلاش تک کے لیے مفید ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ قاضی کو ہر مظلوم اور فریادی کی فریاد پر کان دھرنا چاہیے اور ہر حالت میں اس کی مدد کرنا چاہیے۔

دربان اور پاسبان روک ٹوک کرتے ہیں اور مظلوموں کو قاضی کے حضور میں آنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس لیے قاضی کو چاہیے کہ اس کی ڈیوڑھی دربانوں اور پاسبانوں سے بالکل خالی ہو۔ آنے والوں کے لیے کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ جس کا جی چاہے بغیر کسی انتظار اور دقت کے قاضی تک پہنچے اور اپنی فریاد سنا کر کامیاب واپس ہو۔

(عن عمر بن مره) قال "سمعت رسول الله صلعم یقول" مامن امام اووال یغلق بابه دون ذوی الحاجه والخله الا اغلق الله دونه ابواب السماء دون خلتو حاجته و مسکنته......(۶)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کہ جو قاضی یا گورنر اہلِ حاجت پر اپنے دروازے کو بند کرتا ہے، اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آسمان کے دروازے بھی اس پر اسی طرح بند ہو جائیں گے۔

حاکم اور قاضی کو تحفہ و ہدیہ:

انصاف سے باز رکھنے والے اسباب میں ایک اہم سبب ہدیہ بھی ہے۔ بہت سے لوگ بہ ظاہر محتاط معلوم ہوتے ہیں، رشوت کو حرام قطعی سمجھتے ہیں لیکن جن لوگوں کی غرضیں ان سے وابستہ ہیں، ان سے بلا تکلف تحفہ تحایف قبول کر لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ بھی ایک قسم کی شایستہ رشوت ہے، جو قاضی کی زبان کو بند کر دیتی ہے اور ہدیہ دینے والے کا احسان یاد آ کر قاضی کو اس سے باز رکھتا ہے کہ اس کے مقاصد کے مخالف فیصلہ صادر کرے۔ عام طور پر اس قسم کے ہدیے ایک پرائیویٹ تعلق پر مبنی سمجھ کر معیوب نہیں سمجھے جاتے، لیکن چوں کہ ناانصافی کا بیج بونے والے ہیں اس لیے اسلام نے نہایت سختی سے ان کے لینے کی ممانعت کر دی۔

(۱)

(عن ابی، حمید الساعدی) ان رسول الله صلعم قال "هدایا العمال غلول" ......(۷)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو عمال ہدیہ لیتے ہیں، وہ درحقیقت خیانت کے

مرتکب ہوتے ہیں۔

(۲)

(عن بریدہ) عن النبی صلعم انه قال استعملناه علی عمل ورزقناه رزقاً، فما اخذه بعد ذلک فهو غلول......(۸)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو ہم کسی مقام کا گورنر مقرر کرتے ہیں تو اس کی ضروریات کے لیے ایک رقم بھی منظور کر لیتے ہیں، اگر اس کے علاوہ وہ کچھ اور لے تو یہ خیانت ہے۔

(۳)

(عن علی علیه السّلام) عن النبی صلی الله علیه وسلم اخذ الامیر الهدیه، سحت وقبول القاضی الرشوه کفر ......(۹)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو امیر لوگوں سے ہدیہ لیتا ہے وہ ایک حرام فعل کا مرتکب ہوتا ہے، اور جو قاضی رشوت لیتا ہے وہ گویا کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

ندوہ، لکھنؤ (۱۰)

حواشی

۱۔ دار قطنی، طبرانی، بیہقی

۲۔ ابوداؤد، ترمذی، مسند امام احمد

۳۔ بخاری، مسلم

۴۔ مسند امام احمد

۵۔ بخاری، مسلم

۶۔ ترمذی

۷۔ مسند امام احمد، بیہقی، کنز العمال

۸۔ ابوداؤد

۹۔ مسند امام احمد

۱۰۔ الندوہ۔ لکھنؤ، فروری ۱۹۰۶ء، ص ۲۵ تا ۳۲

یورپ میں گونگوں کی تعلیم

ایک زمانہ تھا جب ہم استعجاب کے لہجے میں کہا کرتے تھے کہ ''کیا گونگے بھی بول سکتے ہیں؟'' جب ضرورت ہوتی تھی کہ قدرت کے ناممکن التبدیل قوانین کی کوئی بیّن مثال مخاطب کے ذہن نشین کریں تو اس سے بہتر کوئی مثال نہیں ملتی تھی کہ کیا گونگے بھی بول سکتے ہیں؟ مگر آج علوم کی ترقی انسان کی حریت اور یورپ کی علمی فیاضی نے ایسے واقعات پیش کر دیے ہیں کہ ہم بیان واقعہ کے لہجے میں کہتے ہیں کہ گونگے بھی بول سکتے ہیں!

انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں اگرچہ علوم وفنون موجودہ قالب اختیار کر چکے تھے، علم کی روشنی یورپ سے نکل کر دور دور تک پہنچ چکی تھی اور قرونِ وسطیٰ کی بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو گئیں تھیں، لیکن اس مسئلے پر جب کبھی توجہ ہوئی تو اس درجے ناممکن سمجھا گیا کہ کسی عالم نے اپنی کوششیں اس کے لیے وقف نہیں کیں۔ لیکن صدی کے آخری حصے میں یکا یک قدرت نے انسان کے اس بے انتہا مظلوم طبقے پر ترحّم آمیز نگاہ ڈالی اور اس کی علمی لذتوں سے محرومی کا طول طویل زمانہ ختم ہوا۔ یورپ میں جا بجا اس امر کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس بے زبان فرقے کو جہالت اور محتاجی کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ لاکھوں روپے اس کام کے لیے وقف کیے گئے، بیسیوں انجمنیں اس مقصد سے قایم ہوئیں، یہاں تک کہ آج ان کوششوں کے نتایج حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں اور دنیا حیرت کی نگاہوں سے اس اعجاز نما کامیابی کو دیکھ رہی ہے۔

گونگے بول رہے ہیں، مخاطب کا مفہوم سمجھتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، دنیا کی روز مرّہ ترقی میں ہماری طرح حصہ لیتے ہیں۔ تجارت میں وہ نظر آتے ہیں، ہر قسم کی علمی ملازمتیں وہ کرتے ہیں۔ ان کے خاص خاص اخبارات نکلتے ہیں، جس کے ایڈیٹر اور مضمون نگار اسی فرقے کے فاضل افراد ہوتے ہیں۔ ان کی خاص انجمنیں ہیں، جن کے ممبر، سیکریٹری

گونگے ہی گونگے ہوتے ہیں۔ غرض کہ علم وتمدن کی روشنی سے اس طرح اپنے ضمیر کو منور کرتے ہیں کہ دنیا کی کوئی علمی لذت اور تمدنی دل چسپی ان سے اپنا دامن نہیں سمیٹ سکتی۔

مسلمان بھی اپنے دور میں اس علمی فیاضی سے محروم نہیں رہے۔ ان کی فیاض طبیعتوں نے گونگوں کو نہ سہی، لیکن اندھوں کو اپنی علمی دل چسپیوں میں شریک کرلیا تھا۔ تاریخ میں آج سیکڑوں عالموں، مقرروں اور مصنفوں کے نام ملتے ہیں جو ظاہری آنکھوں سے محروم تھے، مگر علم کی روشنی نے ان کے ضمیر کو اس طرح منور کردیا تھا کہ ظاہری آنکھوں سے مستغنی ہوگئے تھے۔ بشار، ابوالعینا، علی قیروانی اس پایے کے شاعر اور ادیب تھے کہ اپنے زمانے میں فردِ روزگار سمجھے جاتے تھے۔ مگر حیرت ہوتی ہے، جب ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ سرمۂ بصارت سے محروم تھے!

ابوالعلامعرّی کے فضل وکمال سے کس تاریخ دان کے کان نا آشنا ہیں؟ لیکن وہ بھی اسی باکمال جماعت کا ایک فرد ہے، جو بچپن میں دولتِ بصارت سے محروم ہوگئے، مگر اپنی کوششوں کے صلے میں دولتِ علم سے مالا مال ہوئے۔

یورپ میں آج گونگوں کی تعلیم کا جو انتظام ہے، جس طریقے سے تعلیم دی جاتی ہے اور جو نتائج ان سے حاصل ہوئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان کا اجمالی بیان ایک علمی خبر کی صورت میں یہاں درج کریں۔ لیکن اصلی بیان سے پیشتر یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ اس افسوس ناک نقص کے اصلی اسباب کیا ہیں؟ اور یورپ میں آج تعلیم وتربیت کا جو انتظام کیا گیا ہے، وہ کس قسم اور صورت کے گونگوں کے متعلق ہے؟

گنگ کی دو قسمیں ہیں، عارضی اور پیدائشی۔ بعض حالتوں میں چند عوارض ایسے لاحق ہو جاتے ہیں کہ گلے میں یا زبان میں ایک نقص پیدا ہو جاتا ہے، آواز بیٹھ جاتی ہے، زبان کام نہیں دیتی اور ہمیشہ کے لیے بدقسمت انسان قوت گویائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا گنگ، عارضی گنگ ہے۔ یورپ میں تعلیم وتربیت کا جو انتظام کیا گیا ہے، اس کو اس قسم کے گونگوں سے کوئی تعلق نہیں۔

پیدائشی گنگ دراصل نتیجہ ہے خلقی بہرے پن کا، یا عالمِ طفولیت میں قوت سماعت سے قطعی محروم ہو جانے کا۔ انسان کی قوت گویائی کا دار ومدار درحقیقت قوت سماعت کی صحت پر ہے، بچہ جب یکا یک عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو ہر قسم کی جسمانی اور دماغی قوت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ وہ

بولتا نہیں لیکن بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ منتظر ہوتا ہے کہ خاندانی سوسایٹی کا اثر اس کی رہنمائی کرے اور تھوڑے ہی دنوں میں ہزار داستان بنا دے۔ اس کے نازک اور ضعیف ترین اعضا بہ ظاہر اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کے قابل نہیں نظر آتے، مگر ان میں نشو و نما کی وہ فطری قابلیت چھپی ہوتی ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے شیر افگن بنا دیتی ہے۔ اس کی زبان کام نہیں دیتی، تتلا تتلا کر بے ربط آوازیں نکالتا ہے اور قوتِ گویائی کے عجیب و غریب کرشمے سے محض نا آشنا معلوم ہوتا ہے، مگر قوت سماعت اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ سنتا ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگ کس طرح باتیں کرتے ہیں، کس لب و لہجے میں ان کے الفاظ زبانوں سے نکلتے ہیں، کس چیز کو کس لفظ سے پکارتے ہیں اور کس حالت کو کس نام سے یاد کرتے ہیں؟ فطرت کی دوسری بخشی ہوئی قوتیں اس کو سہارا دیتی ہیں، وہ کوشش کرتا ہے کہ ان کی تقلید کرے اور اسی ترکیب سے، اسی لب و لہجے میں سنے ہوئے لفظوں کو نقل کرے۔ رفتہ رفتہ قوتِ سماعت اس کی نقالی اور تقلید کی اصلاح کرتی رہتی ہے اور قوتوں کی نمو اور ترقی کے ساتھ قوت گویائی بھی طبعی حد تک ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ جو قابلِ رحم انسان قوتِ سماعت سے محروم دنیا میں آیا، یا بچپن ہی میں اس قوت نے بے وفائی کی تو چوں کہ اس کا دماغ خارجی آوازوں کے اثر سے بے خبر رہتا ہے، اس لیے قوت گویائی کو بھی تحریک نہیں ہوتی اور اس کی فطری قابلیت محض بیکار جاتی ہے، یہی گنگ پیدایشی یا حقیقی گنگ ہے۔ یورپ نے اسی کے علاج کیا اور اسی قسم کے گونگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔

دنیا کا عام خیال یہ ہے کہ آنکھوں سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی نعمت نہیں۔ یہ جاتی ہے تو تنہا نہیں جاتی، زندگی کا لطف بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ عام طور پر بہرے سے زیادہ مجبور اور بہت زیادہ قابل رحم اندھا سمجھا جاتا ہے، جو زندگی میں مجبور و محتاج ہو جاتا ہے، نہ چل سکتا ہے، نہ کسی کو دیکھ سکتا ہے، فطرت کے مناظر سے محروم اور دوستوں عزیزوں کی صورت سے نا آشنا رہتا ہے، لیکن در حقیقت یہ خیال صحیح نہیں۔ سب سے زیادہ مجبور، محتاج، اور قابل رحم وہ انسان ہے، جو قوتِ سماعت سے محروم دنیا میں آیا۔ یا زمانِ طفولیت میں اس دولت سے محروم ہو گیا۔ آنکھوں سے معذور انسان اس لیے بدقسمت ہے کہ ایک قوت جاتی رہی، لیکن قوت سماعت سے محروم اس سے زیادہ بدقسمت ہے کہ دو قوتیں اس سے ضایع ہو گئیں۔ اندھا دنیا کے دل چسپ مناظر کے جلووں سے محروم ہے، دوستوں کی صورت سے نا آشنا ہے، مگر پھر بھی ایک ایسی چیز اپنے پاس رکھتا ہے، جو

ان کا نقشہ اور صورت اس کے ذہن میں محفوظ کردیتی ہے۔لیکن بہرا دنیا کے دل چسپ جلووں کو دیکھتا ہے، مگر چوں کہ نہ کسی کی سنتا ہے اور نہ اپنی سنا سکتا ہے، اس لیے علم کی روشنی سے بالکل محروم رہتا ہے۔آنکھوں سے معذور ہزاروں برسوں کی علمی تحقیقات سے قوتِ سماعت کی بدولت واقف ہوسکتا ہے، اس لیے آنکھوں کا کام کانوں سے لے سکتا ہے۔مگر جو بدقسمت قوتِ سماعت سے محروم ہے اس کے پاس کوئی طبعی ذریعہ ایسا نہیں، جس سے اس قوت کی کمی کی تلافی ہوسکے، اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب سے بڑی نعمت قوتِ سماعت ہے جس کا ضایع ہونا درحقیقت قوتِ گویائی کا ضایع ہونا ہے۔جو شخص اس قوت سے محروم ہے وہ زندگی کے لطف سے محروم ہے۔اگرچہ قدرت کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کوئی نعمت ایسی نہیں ہے، جس کا ضایع ہونا زندگی کے لیے بربادی نہ ہو۔

خلقی گنگ کے اسباب:

فزیالوجی کی تحقیقات نے ثقلِ سماعت کے مختلف اسباب قرار دیے ہیں۔بعض حالتوں میں کان کی بناوٹ میں کوئی نقص پیدا ہوجاتا ہے، یا سماعت کے اندرونی اعضا میں سے کوئی عضو ضعیف ہوجاتا ہے۔بعض حالتوں میں کوئی مادہ اس طرح حایل ہوجاتا ہے کہ آواز کی موجیں عصب سماعت تک نہیں پہنچ سکتیں۔اس لیے ذہن ان سے موثر نہیں ہوتا۔

لیکن یورپ کی عام طبی تحقیقات سے خلقی ثقل سماعت کے چار بڑے سبب دریافت ہوئے ہیں:

۱۔بہت قریبی رشتے میں باہمی تزوّج

۲۔خاندانی اثر بہ طور وراثت کے

۳۔والدین کا جسمانی ضعف، یا صرف ماں یا باپ کا

۴۔مرض خنازیر

ان چار سببوں میں پہلا سبب خلقی ثقل سماعت کا قوی ترین سبب ہے۔جب کسی خاندان میں عرصے تک باہمی تزوّج کا طریقہ قایم رہتا ہے تو خاندان کی تمام متفرق بیماریاں اور جسمانی نقص ایک ہی نسل میں جمع ہوجاتے ہیں اور نسل کا بڑا حصہ مختلف عوارض میں مبتلا ہوجاتا ہے۔من جملہ ان کے بڑا عارضہ بہرا پن بھی ہے۔تجربے سے ثابت ہوچکا ہے کہ جن جن خاندانوں یا

جماعتوں میں باہمی تزوج کا طریقہ نہیں ہے یا کم ہے، ان کی اولاد اس عارضے سے عموماً محفوظ ہوتی ہے۔ چناں چہ انگلستان کے بعض فاضل اطبا نے پچھلے دنوں اس مسئلے پر خاص طور پر توجہ کی اور دریافت کرنا چاہا کہ خاص اس سبب سے کس تعداد میں یہ نقص ثابت ہوتا ہے؟ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تین ہزار حادثات میں خاص اس سبب سے ذیل کی تعداد قوتِ سماعت سے محروم پائی گئی:

والدین کی باہمی قرابت	خلقی بہرے پن کے حوادث	اکتسابی حوادث	جملہ
(۱) عم زاد بھائی بہن کے باہمی تزوج سے	۸۰	۵	۸۵
(۲) عم زاد بھائیوں کی اولاد میں باہمی تزوج سے	۶۰	۳	۶۳
(۳) عم زاد دادا کی اولاد میں باہمی تزوج سے	۳۱	۱	۳۲
(۴) عم زاد پر دادا کی اولاد میں باہمی تزوج سے	۷	۰	۷
(۵) دور کی قرابت میں باہمی تزوج سے	۱۳	۰	۱۳

اس نقشے میں سب سے زیادہ تعداد نمبر ۱ کی ہے اور بتدریج نمبر ۵ تک کم ہوتی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس قدر زیادہ قریب کے رشتے میں باہمی تزوج ہوتا ہے، اسی قدر اس نقص کے حادثات زیادہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

گونگوں کی تعلیم پر توجہ:

گونگوں کی تعلیم ایک محض ناممکن بات تسلیم کر لی گئی تھی۔ دنیا کا عام خیال یہ تھا کہ زبان کی تعلیم بغیر نطق کے محال ہے۔ بعض اقوام گونگوں کو اس درجے منحوس اور مغضوب الٰہی سمجھتے تھے کہ گونگوں کی ولادت خاندان کے لیے بربادی کا شگون ہے۔ فرانس میں ایک مدت تک یہ خیال قائم رہا۔ اس لیے کیوں کر ممکن تھا کہ قدیم دنیا میں اس منحوس اور مغضوبِ الٰہی فرقے کی تعلیم پر کوئی آمادہ ہوتا۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں یکا یک ایک شخص نے یورپ کو توجہ دلائی کہ گونگوں کی تعلیم

ناممکن نہیں ہے۔ اس کا قول تھا کہ

"کتابت کلام کے ساتھ مربوط ہے اور کلام فکر کے ساتھ، لیکن یہ ممکن ہے کہ بغیر نطق کے واسطے کے حروف یا خیالات فکر سے کتابت میں منتقل کیے جائیں۔"

اس شخص کا نام کردم کردان تھا!

اس رائے نے عام خیالات پر بہت بڑا اثر کیا۔ بہتوں کی رائے بدل گئی۔ سمجھنے لگے کہ پیدائشی گونگوں کی تعلیم ناممکن نہیں ہے۔ کردان ہی کے زمانے میں ایک اسپینی راہب بونسی نامی نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہا، اس میں کوئی شک نہیں کہ گونگوں کی تعلیم کا اصلی بانی یہی باہمت شخص ہے، جس نے سب سے پہلے گونگوں کو تعلیم کی خوش گوار امید دلائی۔ لیکن چوں کہ قدرت کو یہ مبارک کام ایک اور شخص کے ہاتھوں پورا کرانا تھا اس لیے بونسی کی کوششیں خاص اس کی ذات تک محدود رہیں۔ نہ اس نے اپنے طریق تعلیم سے کسی کو واقف کیا نہ کوئی کتاب لکھی۔ ۱۶۲۰ء میں یکا یک میڈرید سے ایک کتاب چھپ کر شایع ہوئی جو ایک اسپینی عالم بونٹ کی عمر بھر کے تجربہ و تحقیق کا نتیجہ تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے گونگوں کی تعلیم و تربیت کے تمام تحقیق کردہ اور مجرب طریقے لکھے تھے اور بتلایا تھا کہ بے زبانوں کو کس طرح زبان بخشی جاسکتی ہے۔ اس کتاب نے گونگوں کی موجودہ تعلیم کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے اٹلی میں پھر انگلستان میں گونگوں کے مدرسے قایم ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام متمدّن مقامات میں یہ طریقہ عام ہوگیا۔

گونگوں کی تعلیم کا طریقہ:

طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو کس طرح تعلیم دی جاتی ہے جو نہ کانوں سے سن سکتے ہیں، نہ زبان سے بول سکتے ہیں؟ اس لیے مختصر لفظوں میں گونگوں کی تعلیم کا طریقہ بتلا دینا ضروری ہے۔

آج کل یورپ اور امریکہ میں گونگوں کی تعلیم کے عام طور پر دو طریقے پائے جاتے ہیں:

۱۔ ہاتھوں کے اشاروں سے

۲۔ الفاظ کے ذریعے سے

انگلستان اور امریکہ میں مدرسین عموماً پہلے طریقے سے کام لیتے ہیں۔ مگر جرمنی اور اسٹریا

میں دوسرا طریقہ مستعمل ہے۔ پہلی قسم کی دو صورتیں ہیں:

الف۔ طبعی اشارات: گونگوں کی تعلیم کا یہ ایک اجمالی ذریعہ ہے، جن سے مختلف اشیا کی صورتوں کی تمثیل ان کے ذہن نشین کی جاتی ہے۔ اس قسم کے اشارات گونگوں کی عام زبان ہے اور اس کی تعلیم آسان اور بالکل آسان ہے۔

ب۔ خاص اصطلاحی اشارات: اس صورت کے ذریعے سے وہ مطالب اور جذبات و کیفیات گونگوں کے ذہن نشین کیے جاتے ہیں جن کی کوئی خاص صورت یا مثال نہیں بتلائی جا سکتی۔

پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک گونگے کے سامنے ایک نارنگی یا ناریل رکھ دیا گیا اور ہاتوں کے اشارے اور قبض و بسط سے اس کی مدور صورت بتلا کر سمجھا دیا گیا کہ نارنگی یا ناریل کی علامت یہ صورت ہے، لیکن طبعی کیفیات اور جذبات اور بعض خاص حالتوں کے لیے یہ صورت کافی نہیں اس لیے خاص خاص قواعد مقرر کر کے اس قسم کے اصطلاحی اشارات وضع کیے گئے جن سے ان حالتوں اور کیفیتوں پر استدلال ہو سکتا ہے۔ مثلاً بھوک ایک حالت اور کیفیت ہے۔ اس کیفیت کے لیے ایک اشارہ بطور ممتاز علامت کے گونگے کو سمجھا دیا گیا۔ اب جب اس پر یہ کیفیت طاری ہوگی، وہ اسی علامت سے کام لے گا اور مخاطب کو سمجھا دے گا کہ "مجھے بھوک لگی ہے۔"

اصطلاحی اشارات کی زبان یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے مدرسوں میں جاری ہو گئی ہے۔ اس زبان کے ذریعے سے انسان اپنے ہر قسم کے مافی الضمیر کو مخاطب پر ظاہر کر سکتا ہے، گونگوں کی خصوصیت نہیں۔ اگر ہم بھی اس زبان کو سیکھ لیں تو بغیر زبان کے ہلائے آسانی کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔

لیکن چوں کہ اشارات سے کافی واقفیت بغیر باضابطہ تعلیم کے نہیں ہو سکتی، اس لیے ایک ایسے ذریعے کی ضرورت ہوئی۔ جو گونگوں میں اور عام لوگوں میں بہ طور ایک مشترک زبان کے مستعمل ہو۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے گونگوں کے لیے حروف تہجی ایجاد کی گئی جس پر نہایت کامیابی سے یورپ اور امریکہ میں عمل کیا جا رہا ہے۔

گونگوں کی حروفِ تہجی:

قدرت نے انسان کو مختلف قوتیں عطا کی ہیں اور ہر قوت کے فعل کے لیے خاص خاص

اعضا بخشے ہیں، بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زبان ہاتھ کا کام نہیں کرسکتی اور ہاتھ سے زبان کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ مگر ایسا خیال کرنا درحقیقت قدرت کی بے انتہا چھپی ہوئی نعمتوں کی ناشکری ہے۔ ایک عضو کے بیکار ہونے پر دوسرے اعضا وہ کام دینے لگتے ہیں، جن سے عضوِ معطل کی موجودگی میں نہ وہ کام لیا جاتا تھا، نہ توقع تھی لیکن قدرت نے ہماری آسایشوں کا جو سامان ہم کو عطا فرمایا ہے، وہ دنیا کی بنائی ہوئی کلوں کا سا نہیں ہے کہ جہاں ایک کیل پرزا ضایع ہوا، سارے کا سارا طلسم برباد ہوگیا۔ گونگوں کی تعلیم کا اس دوسرے طریقے سے جو انتظام کیا گیا ہے، وہ اس خیال کی ایک بہترین مثال ہے۔

پہلا طریقہ:

اس طریق تعلیم کی صورت یہ ہے کہ حروف ہجائیہ کی جگہ انگلیوں کی خاص خاص حرکتوں اور قبض وبسط سے علامتیں بنائی ہیں اور ہر علامت کو ایک خاص حرف قرار دیا ہے۔ مثلاً

(۱) پانچوں انگلیوں کے بند کرلینے سے (الف)

(۲) صرف انگوٹھے کے بند کرلینے سے (ب)

(۳) صرف انگشت شہادت کے بند کرلینے سے (ت)

اسی طرح ی تک محض انگلیوں کے قبض وبسط سے پورے حروف تہجی وضع کیے ہیں۔ انھیں حرفوں کی ترتیب سے گونگے اپنا مفہوم تحریری صورت میں ظاہر کرتے ہیں اور مخاطب فوراً سمجھ لیتا ہے۔

دوسرا طریقہ:

اس تمام بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یورپ نے گونگوں کو نطق کی نعمت سے بالکل محروم سمجھ کر دوسرے طریقوں سے اظہار مافی الضمیر کے طریقے وضع کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نطق کی کوشش بہ ظاہر ایک محال امر کی کوشش معلوم ہوتی ہے اور اگر ایسا سمجھ لیا جاتا تو مشرقی طبیعتوں کے لیے محل اعتراض بھی نہ تھا، مگر یورپ کی حیرت انگیز اور نہ تھکنے والی کوششوں کے متعلق یہ تسلیم کرنا سخت غلطی ہے۔ ان تمام کوششوں کے ساتھ اس امر کی بھی کوشش کی گئی کہ گونگوں کو نطق کی نعمت

سے حتی المقدور محروم نہ رکھا جائے۔ اس غرض سے کم عمر بچوں کو دہن و زبان کی مختلف حرکتیں دکھلا دکھلا کر سمجھایا جاتا ہے کہ وہ بھی تقلید اور نقل کی کوشش کریں اور اگر قوتِ سماعت ان کی مدد نہیں کرتی تو اس کا کام قوت بصارت سے لیں۔ استاد بچے کو اپنے سامنے کھڑا کرتا ہے، پہلے صرف منھ کھولتا ہے اس طرح، جیسے بولنے کے لیے آمادہ ہے۔ بچہ بھی اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کچھ دنوں میں اس حرکت کا عادی ہو جاتا ہے۔ استاد جب دیکھتا ہے کہ نطق کے اس ابتدائی مرحلے کو بچے نے طے کر لیا تو زبان کی دوسری حرکتوں کی مشق کراتا ہے۔ حرکت سے طبعی طور پر آواز پیدا ہوتی ہے اور بچہ ان حرکتوں کا عادی ہو کر بغیر کسی تحریک کے مشق کرتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ آواز میں انتظام اور ترتیب پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ دنوں میں بہ دقت بولنے لگتا ہے۔ مگر چوں کہ یہ طریق تعلیم انھیں گونگوں کے لیے سفید ہو سکتا ہے جن میں کم از کم ان حرکات کی صلاحیت ہو، اس لیے ہر گونگا اس طریقے سے فایدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس طریقے کے کامیاب ہونے میں تامل ہو کہ کیوں کر خارجی تعلیم طبعی نقص کو دور کر سکتی ہے؟ مگر یہ ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، گنگ کی علت قوتِ سماعت کا نقص ہے کہ بچہ دنیا کی آوازوں سے بے خبر رہتا ہے۔ اس لیے قوت گویائی کو تحریک نہیں ہوتی۔ اگر کسی دوسرے ذریعے سے قوتِ گویائی کو تحریک ہو اور وہ کام دینے لگے تو کامیابی میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم کے تمام طریقوں میں یہ طریقہ بے حد مشکل ہے۔ جس بچے کا ذہن آواز کے تصور سے عاجز ہے اس کو آواز نکالنے، اس میں انتظام اور ربط پیدا کرنے کا عادی بنانا آسان کام نہیں ہے، مگر یورپ کی ہمت اور استقلال کے سامنے اس قسم کے مشکلات کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے کوشش کا سلسلہ جاری رہا، بالآخر کامیاب ہوئے۔

حروف کی مختلف آوازوں کا تعلق چوں کہ صرف زبان اور منھ کے اندرونی حصے ہی سے نہیں ہے بلکہ حلق اور سینہ وغیرہ اعضا سے بھی بہت زیادہ تعلق ہے، اس لیے اس طریق تعلیم میں استاد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایک ہاتھ بچے کے سینے پر رکھے اور تنفس کی آمد و شد کا اندازہ کرے اور بچے کو اپنی طرف مخاطب کر کے ابتدا میں صرف حروف علت کی آواز اور مخارج صوت کی حرکت کا عادی بنائے۔ اسی طرح جب تمام مخارج صحیح طور پر کام دینے کے لیے کچھ کچھ آمادہ ہو جاتے ہیں اور آواز میں انتظام پیدا ہو جاتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ مشق اور عادت، قوت گویائی پیدا کر دیتی ہے۔

آواز کی تعلیم کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ سب سے پہلے بچے کو بسیط آوازوں کی مشق کرائی جاتی ہے، مثلاً اس کے سامنے شمع جلا کر، پھر پھونک مار کر بجھا دیتے ہیں اور اس کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح پھونک مار کر بجھانے کی کوشش کرے۔ اس صورت میں نفخ کی سی آواز طبعی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ بچہ اس سے واقف ہو جاتا ہے پھر کوشش کرتا ہے کہ اسی قسم کی آوازیں پیدا کرے۔

گونگوں کی تعلیم کا یہ آخری طریقہ بھی دوسرے طریقوں کی طرح تمام یورپ اور امریکہ میں پھیل گیا ہے اور لاکھوں روپے صَرف کر کے کوشش کی جارہی ہے کہ دنیا کے تمام حصے اسی طریقے پر کاربند ہو جائیں۔ امریکہ کے فیاض اور علم دوست لوگوں کا اس کام میں سب سے آگے قدم بڑھا ہوا ہے۔ بیسیوں انجمنیں اس مقصد سے قایم کی گئی ہیں، سیکڑوں آدمی اس کام کی اشاعت کے لیے اپنا وقت اور مال صَرف کر رہے ہیں اور یورپ کے علاوہ دنیا کے اور حصوں میں بھی تعلیم جاری ہوگئی ہے۔

یورپ میں آجکل جس سرعت سے یہ آخری طریقہ ترقی کر رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جاتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں ابتدائی طریقے بالکل معدوم ہو جائیں گے۔ تعلیم نطق میں جو کامیابیاں ہوئی ہیں ان کا بھی یہی اشارہ ہے کہ

> ''ہماری موجودگی میں اشارات کے گورکھ دھندوں میں گونگوں کو پھنسانا قرین عقل نہیں ہے۔''

اس وقت تمام دنیا میں کل چار سو انتیس مدرسے ہیں جن میں دو سو اُنسٹھ مدرسے اسی طریقے پر کاربند ہیں۔

تمام یورپ میں فرانس والوں کو گونگوں کی تعلیم میں بہت زیادہ دل چسپی ہے۔ آج کل فرانس میں ستر مدرسے قایم ہیں، جن میں چونسٹھ مدرسے آخری طریقے سے تعلیم دیتے ہیں اور صرف چھ مدرسے بہ ذریعہ اشارات کے!

تعلیم کے نتایج:

ان کوششوں سے جو مفید نتایج پیدا ہوئے ہیں اور انسان کے اس بڑے گروہ نے جو قدرتی طور پر، مگر بزرگوں کی غلطیوں کی وجہ سے قوت گویائی سے محروم تھا، جو فواید حاصل کیے ہیں، ان کا صحیح

اندازہ سردست ممکن نہیں۔ لیکن ذیل میں ہم ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے صرف اتنا اندازہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں سال بھر میں کس تعداد کے گونگے قوت گویائی سے کامیاب ہوئے۔ یہ تعداد ۱۸۸۵ء کی ہے:

ملک کا نام	مدرسوں کی تعداد	طلبا کی تعداد	ملک کا نام	مدرسوں کی تعداد	طلبا کی تعداد
فرانس	۶۲	۳۸۹۶	سویس	۱۱	۳۸۰
ممالک متحدہ امریکہ	۵۵	۷۰۵۵	بلجیم	۱۰	۸۶۴
انگلستان	۴۰	۲۶۴۶	ناروے	۷	۳۵۸
جرمنی	۹۰	۵۶۱۴	اسپین	۷	۲۲۲
اٹلی	۳۶	۱۴۸۹	روس	۴	۴۶۰
اسٹریا	۱۷	۱۱۲۹	دنیا کے دیگر حصوں میں	۲۷	۲۱۵۶
اسٹاک ہالم	۱۷	۲۸۰	میزان کل	۳۸۳	۲۶۹۵۹

ابوالکلام آزاد دہلوی
ندوہ، لکھنؤ (۱)

ا۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ، مارچ ۱۹۰۶ء، ص ۲۷ تا ۳۹

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی

(۱)

مسلمانوں کے لیے درحقیقت یہ بات سخت قابلِ شرم ہے کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں۔ عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر، جو کچھ کہو عربی ہے۔ مسلمانوں کے تمام علوم وفنون اسی خزانے میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانے پر یورپ کا قبضہ ہے اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں۔ درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں، جن کے الگ کردینے کے بعد عربی کا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا ہے۔ صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا، اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخے کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہو گئے، بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں، جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ان کو ہمارے علماء کے دماغوں میں ایک لمحے کے لیے بھی جگہ نہ ملی ہوگی، عربی کی علم اللسان، لغت، صرف، نحو، عروض، قوافی کے متعلق بیسیوں کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئیں ہیں کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبانوں میں آجائے تو بیش بہا معلومات سے مالا مال ہو جائیں۔

ڈاکٹر لائیٹر ہماری اس افسوس ناک غفلت کو محسوس کر کے لکھتے ہیں کہ

’’مسلمان ہیں تو بہت، مگر وہ جانتے کیا ہیں؟ اگر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا

کوئی عمدہ دیوان درکار ہو تو یورپ سے مانگنا پڑے گا۔ ابن خلدون، ابن رشد، ابن بطوطہ، حاجی خلیفہ، ابن اثیر، اور مقریزی جو اسلام میں آسمان علم کے آفتاب ہیں، یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں! تابط شرا، امرء القیس، بحتری اور ابوتمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہوگا؟ یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں!"

ڈاکٹر لائیٹنر کو تو صرف اس کا افسوس ہے کہ اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے مانگنا پڑے، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں اور انھیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے؟ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعے علمائے اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں جن کی بدولت آج انھیں اس امر کا موقع حاصل ہے کہ اپنے علمی ذخیرے سے فایدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس مضمون کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں یہ دکھلایا ہے کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی اور صرف ونحو، لغت وادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں؟ دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصّل فہرست دی ہے، جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شایع ہوئیں۔

یورپ کو عربی اور عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی؟ اور کیوں کر ہوئی، یہ بجائے خود ایک دل چسپ مضمون ہے جس کے بیان کی یہاں نہ گنجایش ہے اور نہ ضرورت! صرف اس قدر بتلانا سلسلۂ مقصد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا اور کیوں کر عربی علوم وفنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہوگئے۔ (۱)

دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب وغریب ہے کہ یورپ کی شایستگی کی بنا ایک ایسی پولٹیکل خوں ریزی نے رکھی جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کی گئی ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجے تک بلند ہو چکے تھے، یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکا یک یورپ کو موقع دیا کہ مسلمانوں کی شایستگی کا مطالعہ کرے۔ بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قایم ہوگئی

اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرایع وسعت کے ساتھ پیدا ہوگئے، تو یورپ کی آنکھیں کھلیں، اور مسلمانوں کی شایستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا۔ شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جان بازوں نے مغرب کا رُخ کیا، تو یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے کہ مسلمان علمی ترقیات کی دنیا میں اکیلے مخزن ہیں اور تہذیب وشایستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شایستگی پر عام توجہ پیدا ہوگئی اور یہ توجہ برابر بڑھتی گئی۔ کیوں کہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کا اسلامی ممالک میں گزر ہوا اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے۔ اس لیے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑا اُٹھایا، اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہوگیا!

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی اور لاطینی ویونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور ارکینِ سلطنت کے لیے مخصوص تھی، اس لیے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اوّل قدم اٹھا وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا۔ حیرت یہ ہے کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشاں خواب دیکھنے لگا اور اسلامی فلسفے کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی۔ حال آں کہ ابتدا میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارھویں صدی کے اوایل سے مسلمانوں کے علوم وفنون پر یورپ کو توجہ ہوئی اور چودھویں صدی کے اواخر تک فلسفے کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوگئیں۔ (۲) ابتدا میں متعدد محکمے قایم کیے گئے کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفے کی کتابیں ترجمہ کی جائیں۔ پھر پوپ اکلرمنڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لیے یورپ سے نوجوان طلبا اندلس روانہ کیے گئے (۳)۔ اندلس میں چوں کہ خود عیسائی اور یہودی فلسفے میں مسلمانوں کے شاگردِ رشید تھے، اس لیے یورپ کے طلبا ان کی اعانت سے فایدہ اٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے، اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے (۴)۔

جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا، اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے، ان کے نام آج تاریخی صفحات پر موجود ہیں۔ ان میں

بہت سے طالب علم ایسے ہیں جنھوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے تقید سے خود کو ہمیشہ کے لیے آزاد کرلیا، اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ مدرسوں اور قرطبہ کے دارالعلوموں میں صرف کردی۔ کچھ طالب علم ایسے ہیں، جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے اور ایک عرصے کی تلاش و تحقیق کے بعد جب سرزمین مغرب میں قدم رکھا، تو اسلامی علوم وفنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔ ہارڈمن کریموں اس زمانے کا مشہور طبیب اور ہیئت دان ہے۔ یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا اور ایک عرصے کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کرلی، تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹرز مارمٹ ایک فرانسیسی راہب تھا، جس کو جغرافیے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا، افریقہ کی خاک چھانی اور مدت کی آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔ ڈنیل مارلی اور پیٹرز ماکر نے اسی طرح اندلس کا سفر کرکے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی۔ آخرالذکر نے قرآن شریف کا عربی سے ترجمہ بھی کیا اور آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی۔ (۵) ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں (۶)۔ ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کردیا اور اسلامی فلسفے نے عام طور پر مقبولیت حاصل کرلی۔

لیکن چوں کہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درس گاہ نہ تھی، اس لیے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کرسکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کے کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولھویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہوگئی۔ ۱۶۴۲ء میں پندرھویں گری گورس پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقاید کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فایدہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کو توجہ ہوگئی۔ اس کے بعد ہی ۱۶۲۷ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قایم کیا گیا، تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پاکر اشاعتِ مذہب کی غرض سے باہر جاسکیں۔ اس مدرسے

میں خاص طور پر عربی اور سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کیے گئے تھے۔ عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسے کی بہ دولت چھپ کر شایع ہوئیں۔ تعلیم کے لیے ضرورت ہوئی کہ صرف ونحو اور ادب کی کتابیں بہ کثرت مہیا ہوں، اس لیے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے اور کچھ کتابیں قدیم زمانے کی لکھی ہوئیں دستیاب کیں اور انھیں نہایت اہتمام سے طبع کرا کر شایع کیا۔

صرف ونحو عربی کی جو کتابیں یورپ میں لکھی گئیں:

اس انجمن نے عربی کے لیے جو کچھ کیا، وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا، لیکن اسی زمانے میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے محض ذاتی کوشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی اور پھر صرف ونحو اور ادب ولغت کی کتابیں لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا۔ ان لوگوں میں پہلا شخص آر پی نیو نامی ایک عالم ہے جو ہالینڈ کا باشندہ تھا۔ مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی اور متعدد زبانوں کو حاصل کر کے ۱۶۱۳ء میں ہالینڈ واپس آیا۔ ہالینڈ میں چوں کہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی سے ہو چکی تھی، اس لیے پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہو گیا۔ اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہو گئی اور صرف ونحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ ترتیب دیا (۷)۔

آر پی نیو کے بعد لافن وارنر نامی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی، یہ عالم ۱۶۱۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۶۵ء میں وفات پائی۔ ۱۶۴۰ء میں مشرقی ممالک کا سفر کر کے عربی کی نادر کتابیں جمع کیں اور لیڈن یونیورسٹی کے کتب خانے میں داخل کر دیں۔

سترھویں صدی کے اواخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوشش سے عربی لٹریچر کا مذاق ترقی کرتا رہا، لیکن اٹھارھویں صدی کے اوایل سے یورپ میں عربی کا وہ نیا دور شروع ہوا، جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنا رکھی۔ اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر سیل دسٹر کی تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا۔ علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابلِ قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف ونحو ہے، جس کی دو ضخیم جلدیں ۱۰۷۱ء میں چھپ کر شایع ہوئیں۔ اس کتاب میں مصنف

نے ایک مفید التزام یہ کیا ہے کہ جن جن صرفی ونحوی مسایل کو لکھا ہے، ان کے متعلق بہ طور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کر دیے ہیں (۸)۔

اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہو گئے جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہوگئی، من جملہ ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے۔ مسلمانانِ ہند کا یہ زمانہ اگرچہ زمانۂ انحطاط تھا، مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ اور دہلی کے جو علما آج زیادہ مشہور ہیں، وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں، اس لیے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی۔ اس توجہ سے جو مفید نتایج پیدا ہوئے ان میں ایشیاٹک سوسایٹی بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا، یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ انگریز بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دور میں برابر کے شریک رہے۔ مشہور انگریز عالم لمسڈن (۹) نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک عمدہ کتاب صرف ونحو پر لکھ کر ۱۸۱۳ء میں شایع کی۔ اسی طرح کلکتہ میں دو اور رسالے اسی زمانے کے قریب قریب شایع ہوئے، جن میں سے ایک رسالے میں عربی کی چھوٹی بڑی حکایتیں جمع کی تھیں اور دوسرے رسالے میں الف لیلہ کے تیسرے حصے کا انتخاب اور ترجمہ تھا۔ (۱۰) اس دور میں صرف ونحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں:

۱۔ علامہ ای والڈ جرمنی کی صرف ونحو عربی، ۱۸۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک چھپ کر لیپزیگ سے شایع ہوئی۔

۲۔ علامہ کاسبری کی صرف ونحو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر لیپزیگ سے شایع ہوئی، پھر علامہ اگسٹس نے ترمیم وتہذیب کے بعد ۱۸۵۲ء میں دوبارہ شایع کیا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۸۸۷ء تک اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔

۳۔ پھر ۱۸۵۹ء میں ایک انگریز عالم رایٹ نے کاسبری کی صرف ونحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمے کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا، جو لندن میں چھپ کر شایع ہوئی۔

یورپ کے علمانے جب عربی زبان پر توجہ کی، تو ان کو صرف ونحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی، جو ان کے لیے مفید ہوں۔ جب ایسی کتابیں نہیں ملیں تو خود انھوں نے کوشش کر کے کتابیں تصنیف کیں اور آنے والے زمانے کے لیے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا۔ اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ اسی کوشش پر مبنی ہیں۔

یورپ اور عربی لغات کی ترتیب:

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا، وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی۔ سب سے پہلا لغت جو یورپ میں شایع ہوا وہ جیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے جو اٹلی کا رہنے والا تھا۔ پھر علامہ جوالیس نے اس کی تقلید کی اور ۱۸۵۲ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شایع کیا۔ یہ دونوں لغت چوں کہ صرف عربی کے تھے اس لیے علامہ مائینس نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی، فارسی، ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمنی دونوں زبانوں میں درج کیا۔ اس لغت کا نام کنز اللغات الشرقیہ ہے۔ ۱۸۸۰ء میں وایندا دار السلطنت اٹلی سے چھپ کر شایع ہوا۔

اس کے بعد علامہ فرائیٹگ نے چار جلدوں میں، اور کازی مرسکی نے فرنچ میں، اور باڈجر اور لین نے انگریزی میں چار لغت تیار کیے، جو ۱۸۳۷ء سے ۱۸۸۱ء تک چھپ کر شایع ہوئے۔ ان میں پہلا لغت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔

ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت نہیں پائی جاتی لیکن ساتواں لغت، علامہ لین کا، اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ اس مصنف نے نہایت کوشش سے عربی کے تمام قاموس جمع کیے اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔

لیکن جس بے نظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لیے اپنا مرہون منت بنالیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر دوزی کا قاموس Sagg Lementaux Dictionnarv ہے، یعنی اضافہ لغت عربی پر۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے کتب خانے میں یہ لغت میری نظر سے گزرا ہے۔ دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور مصطلحات جمع کیے ہیں، جو عربی کے کسی لغت میں نہیں ملتے۔ کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے یہ بے نظیر لغت تیار ہوا۔ تاریخ وادب اور علوم وفنون کی سیکڑوں کتابیں چھان ڈالیں اور جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ ملے، جمع کر لیے، پھر سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کر کے نہایت کوشش سے ان کا سراغ لگایا، اور تحقیق وتنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا، اسے لفظ بہ لفظ درج کیا۔ پہلی جلد کی ابتدا میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے، جن سے

اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی۔اس کے دیکھنے سے اس محقق کی تلاش وتحقیق کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون کون سی نایاب کتابیں جمع کیں اور کس طرح ان سے مبہم اور مشکوک الفاظ کا پتا لگایا!

مسلمانوں نے جب اسپین فتح کرکے ایک متمدّن سلطنت کی بناڈالی تو آٹھ سو برس کے اثر نے اسپین کی ملکی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کردیے۔یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں، مگر اختلاف لب ولہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔پروفیسر ووزی نے مدت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے، جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع کیے ہیں اور دکھلایا ہے کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیوں کر اختیار کی اور عربی میں ان کی اصلی صورت کیا تھی؟ افسوس ہے کہ یہ دونوں بے نظیر لغت فرنچ میں ہیں اور ہم بہ راہِ راست ان سے فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے منتخبات:

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل ذکر ہے۔یورپ نے عربی علم ادب کے نہایت مفید منتخبات ترتیب دیے ہیں۔اور ان منتخبات میں ادب کی بعض ان کتابوں کا انتخاب ہے، جو اس وقت تک چھپ کر شایع نہیں ہوئیں اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیے ہیں، بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کی ہیں۔اس قسم کی چودہ کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں، جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لندن، برلن اور پیرس وغیرہ میں چھپی ہیں۔

لغت دارجہ کی صرف ونحو:

آج کل جو عربی عام طور پر نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے، اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں۔یورپ نے دارجہ کے بھی صرف ونحو لکھے ہیں اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔سب سے پہلے کانس نامی مستشرق نے ۱۸۷۵ء میں دارجہ کی صرف ونحو لکھی اور اسپین میں چھپ کر شایع ہوئی۔پھر دومیے نے لکھ کر واینا سے شایع کی۔اسی طرح ۱۸۹۰ء تک بارہ کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے، جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی۔

لغت دارجہ کے مجموعۂ امثال:

صرف ونحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو بھی (جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں) یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعے الگ الگ ترتیب دیے ہیں۔ مثلاً علامہ لینڈ برگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں۔ بادجر نے صرف مکہ معظمہ کے امثال ترتیب دیے ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع ''مجموعۂ امثال'' ترتیب دیا ہے جس میں عام طور پر دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کیے ہیں۔

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں عرب کے مختلف خطوں میں مشہور ہیں اور جن سے ان کے اخلاق وعادات اور طرزِ معاشرت کا پتا چل سکتا ہے، جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو بھی نہایت تلاش سے جمع کیا ہے، اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں:

۱۔ سوسین کا مجموعۂ حکایات، جس میں موصل اور ماردین کی حکایتیں جمع کی ہیں، یہ رسالہ مضمون کی صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شایع ہوا تھا۔

۲۔ بی ٹابیک کا مجموعہ جو ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے چھپ کر شایع ہوا۔

۳۔ لینڈ برگ کا مجموعہ جو ۱۸۸۸ء میں شایع ہوا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی، لکھنؤ

الندوہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۸ء، ص ۲۳ تا ۳۱

حواشی

۱۔ الندوہ کے کسی گذشتہ نمبر میں ابن رشد کی لائف کا دوسرا نمبر نکل چکا ہے، جس میں اسلامی فلسفے کی اشاعت کے اسباب وحالات کسی قدر تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ اس مضمون کو دیکھتے ہوئے ناظرین اس نمبر کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔ تفصیلی حالات کے لیے اس مستقل مضمون کا انتظار کیجیے جو اس عنوان پر عن قریب شایع ہوگا۔

(اس حاشیے میں ابن رشد پر علامہ شبلی کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جو الندوہ کی جلد ۱ کے تیسرے اور ساتویں شمارے میں شایع ہوا تھا اور اس کی آخری اور تیسری قسط جلد ۳ کے چھٹے شمارے (اگست ۱۹۰۶ء) میں شایع ہوئی تھی۔ ا۔س۔ش)

۲۔ سیاحت المعارف، ص......

۳۔ سیاحت المعارف: ص ۲۹۷

۴۔ ایضاً ص ۲۹۷ و ۳۲۱

۵۔ سیاحت المعارف: ص ۳۰۰

۶۔ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا

۷۔ آرپی نیو: سالِ ولادت ۱۵۸۴ء اور سالِ وفات ۱۶۲۴ء ہے۔ صرف ونحو کے علاوہ اور تصنیفات حسبِ ذیل ہیں: عربی تعلیم کا ابتدائی رسالہ، عربی اور عبرانی کا باہمی تعلق ''عہد جدید'' کا عربی میں ترجمہ، چند کتابوں کا عربی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا، لیکن اس کا تفصیلی حال معلوم نہیں۔

۸۔ پروفیسر سیل وسٹر کا پورا نام ''ان ٹوان آیزک سیل وسٹروے ساسی'' ہے۔ بچپن میں صحت کی حالت اچھی نہ تھی۔ اس نے ابتدائی تعلیم ایک پرائیویٹ استاد سے حاصل کی۔ باوجود اس کے، ذہن اس قدر تیز تھا کہ کم عمری ہی میں یونانی اور لاطینی میں کافی لیاقت پیدا کرلی، بارہ برس کی عمر میں ایک فاضل راہب کی ملاقات ہوئی جس کا نام ''بے نی ڈیگ ٹائیں'' تھا۔ اس راہب کی صحبت سے مشرقی زبانوں کا شوق پیدا ہوا، اور دس برس کی محنت اور مطالعے سے مشرق کی سات مشہور زبانوں میں غیر معمولی قابلیت حاصل کرلی۔ ۱۷۸۰ء میں جب کہ اس کی عمر صرف تیس برس کی تھی، انجیل کے بعض قیمتی مسایل کا پتا لگایا، اور ۱۷۸۵ء میں اکاڈیمی آف انس کریپ شن (یعنی قدیم کتبہ جات کی انجمن) کو دو قابلِ قدر یادگاریں نذر دیں۔ ان دو کارناموں نے اس کی شہرت دور دور تک

پہنچا دی، اور یورپ کی تمام علمی انجمنیں اس کی قدردانی کے لیے آمادہ ہوگئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانس میں ہر طرف پولیٹکل بے چینی پیدا ہوگئی تھی اور عن قریب بغاوت کی آگ مشتعل ہونے والی تھی۔ ۱۸۰۰ء میں یکا یک یہ آگ بھڑ کی اور فرانس میں انقلاب ہوگیا۔ اس بے اطمینانی کے زمانے میں وہ مشرقی لٹریچر کی بعض اہم تحقیقات میں مشغول تھا۔ کچھ عرصے کی خوں ریزی کے بعد جب دوبارہ بادشاہت قایم ہوئی تو گورنمنٹ کی طرف سے اس کی خاص طور پر قدردانی کی گئی، اور جنیوا بھیجا گیا، تاکہ ان مشرقی نسخوں کا مطالعہ کرے، جو اس شہر میں محفوظ تھے۔ ۱۸۰۵ء میں جنیوا سے واپس آیا اور اپنی تحقیقات کی رپورٹ اکاڈیمی میں پیش کی۔ پھر ۱۸۰۸ء میں فارسی لٹریچر کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور نپولین اوّل شاہ فرانس نے سیکرٹری کے عہدے پر سرفراز کیا اس عرصے میں فرانس کی پولیٹکل حالت میں دوبارہ انقلاب شروع ہوا اور ۱۸۱۰ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہوکر نئے سرے سے بوربون قایم ہوئی۔ اس زمانے سے وے ساسی کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اوّل سررشتہ تعلیم کی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا، پھر ایشیاٹک سوسایٹی پیرس کا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ یہ ایک ایسی علمی جماعت تھی، جس کی بالذات بھی وہ بہت کچھ مدد کیا کرتا تھا۔ وی فلپ کے عہد میں شاہی توجہ پھر مبذول ہوئی اور شاہی کتب خانے کے مشرقی حصے کا محافظ اور اکاڈیمی آف انس کریپشن کا لایف سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس ممتاز محقق نے من جملہ دیگر کتابوں کے عربی صرف ونحو پر ایک ضخیم کتاب لکھی، جو پندرہ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی کی کوششوں سے پیرس میں اُردو، سنسکرت اور چینی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی کی تجویز وہدایت سے روس اور جرمنی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ سال ولادت ۱۷۵۸ء اور سال وفات ۱۸۳۸ء ہے۔ صرف ونحو کے علاوہ دیگر تصنیفات حسب ذیل ہیں:

تذکرہ شعرائے عجم، اصولِ عامہ صرف ونحو؛ اس میں مختلف مصنفینِ عرب کے کلام نظم ونثر کا انتخاب ہے۔ ایک عربی قصے کا ترجمہ، قدامت فارس، مذہب ...... کے حالات، یہ آخری تصنیف ہے۔ اس میں شام کے ایک پراسرار مذہب کے حالات درج کیے ہیں۔ (انسائی کلوپیڈیا آف بریٹانیکا، اورینٹل)

۹۔ اس کا پورا نام "لمسڈن میتھیو ایل ایل ڈی" ہے۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کا عربی اور فارسی کا پروفیسر تھا۔ عربی کے علاوہ فارسی میں بھی اس کی ایک صرف ونحو موجود ہے۔ ۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا (کمپنی) کی ملازمت ترک کر کے انگلستان گیا اور علمی مشاغل میں مصروف رہا۔ ولادت ۱۷۷۷ء اور وفات ۱۸۳۵ء۔

۱۰۔ وقایع ولیم ناموئیس، مصنفہ مولوی کبیر الدین احمد مرحوم کا دیباچہ۔

ندوۃ العلماء کا اجلاسِ دہلی

اور

قوم کی شاہراہِ مقصود

ندوۃ العلما کا تیرھواں سالانہ اجلاس، جو ۲۶ رمارچ ۱۹۱۰ء کی صبح کو متضاد امیدوں اور یاس آمیز توقعات کے ہجوم میں نظر آیا تھا ش ۲۸ رکی شام کو جب رخصت ہوا تو ہر شخص نے محسوس کیا کہ شادمانی اور خوش کامی کے مصافحے سے اس کا وداع خالی نہ تھا۔ اس کی ابتدا گو اُمید و بیم سے ہوئی مگر خاتمہ یک سر جوش و اثر تھا! وہ ایک شان دار تاریخ ہمارے حافظے میں یادگار چھوڑ گیا ہے، جس کے نتایج پر غور و عمل کرنے کے لیے بارہ مہینے کی فرصت میں سے ہمیں ایک دن بھی ضایع نہیں کرنا چاہیے اور اس کی سہ روزہ صحبت کے واقعات پر اطمینان اور تفصیل کے ساتھ نظر ڈالنی چاہیے۔

اجلاس کی اہمیت کا اعلان:

انسان نتایج کی جب قیمت لگاتا ہے تو توقعات کا پیمانہ اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ گذشتہ اجلاس سے عام توقعات کے علاوہ ملک کو خاص توقعات بھی پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے جلسے کی کامیابی کا معیار خود بہ خود ارفع و اعلیٰ ہو گیا تھا۔ جلسے سے پہلے مولانا شبلی نعمانی کا ایک مبسوط آرٹیکل اخبارات میں شایع ہوا تھا جس میں وہ اہم امور پیش کیے گئے تھے، جن کو جلسے میں پیش ہو کر طے ہونا تھا۔ ان میں سے ہر ایک مسئلہ اوّل تو بجائے خود اہم اور عظیم الشان تھا، پھر ملک کی ایسی بدیہی ضرورتوں سے تعلق رکھتا تھا، جن کو تمام قوم محسوس کر رہی تھی اور مدت سے کسی قابل اعتماد صدا کی منتظر تھی۔

اشاعتِ اسلام، مذہبی ضروریات کے لیے مرکز کی تاسیس، ایک جامع ومکمل سیرۃ نبوی کی تدوین! یہی ایسے مقاصد ہیں جن کے لیے موجودہ زمانے میں قوم کے اندر جس قدر انتظار اور بے چینی پیدا ہو کم ہے۔ پس ان کے اعلان نے قدرتی طور پر ہم میں ایسے توقعات پیدا کر دیے تھے جن کا پیمانہ بہت وسیع تھا اور سالانہ اجلاس جب تک اس پیمانے پر ٹھیک نہ اترتا امیدوں کا صحیح جواب نہ تھا۔

اس کے علاوہ ندوے کی نئی زندگی کو تقریباً پانچ چھ سال کا زمانہ گزر گیا۔ اس عرصے میں اس کی آواز نے از سرِ نو اثر پیدا کیا اور جو افسردگی عام طور پر ملک میں پیدا ہوگئی تھی وہ گورنمنٹ کی توجہ، بعض فیاضانِ قوم کے عطیات اور خود ندوے کی رفتارِ ترقی کی تیزی سے رفتہ رفتہ دور ہوگئی، پس ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ دہلی کا اجلاس جو سنگِ بنیاد کے جلسے کے بعد پہلا اجلاس ہے کہاں تک قوم کی ہمدردی اور دلچسپی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے؟ اور قلم وزبان کی جو سرگرمیاں نظر آرہی ہیں اس میں دل کہاں تک شریک ہے؟

دہلی مرحوم:

اور پھر ان وجوہ سے قطعِ نظر اس اجلاس کی اہمیت کے لیے دہلی کا لفظ بجائے خود ایک قدرتی اثر تھا۔ وہ سرزمین جس کی مسجد کے سربفلک مینار اور جس کے قلعے کی خوبصورت برجیاں ہماری برہم شدہ صحبت کی افسانہ خواں ہیں اور جس کا چپہ چپہ اسلامی تمدن کے گزرے ہوئے قافلے کا نقشِ قدم ہے، اپنی صدیوں کی مسلسل عظمت اور دائمی اثر کے ساتھ سامنے تھی، وہاں ملّت مرحومہ کے مرثیہ خواں جمع ہو کر رونے اور رلانے کے لیے صفِ ماتم بچھانے والے تھے اور جس خاک نے ولی اللہ جیسے حکیم الملت علما پیدا کر کے پھر اپنی آغوش میں لے لیے تھے، اس سے شکوہ کرنا تھا کہ

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

اور ندوہ جو علوم اسلامیہ کے تنزل کا افسانہ خواں ہے، اس کے لیے دہلی سے بڑھ کر اور کون سا مقام ماتم کدہ بن سکتا تھا، جس کی خاک کا ایک ایک ذرہ نہیں معلوم کن کن علما اور حاملین مذہب کے استخوانِ زیرِ قبر کا سرمہ ہے، جو ہماری صدیوں کی علمی اور مذہبی زندگیوں کا مزار اور مدفن ہے، جس سے بڑھ کر اور کوئی خاک ہماری خوں افشانی حسرت کی حق دار نہیں۔ جس کا نام سنتے ہی اگر ہمارا دل دو نیم نہ ہو تو اس قابل نہیں کہ پہلو میں جگہ پائے!

توقعات کے ساتھ موانع:

لیکن ایک طرف تو توقعات اور امید ہائے پے در پے کا یہ حال تھا اور دوسری طرف موانع چند در چند ایسے جمع ہو گئے تھے جو جلسے کے انعقادِ محض کی طرف سے بھی شک وشبہ پیدا کرتے تھے۔ اوّل تو مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ نہایت شان وشکوہ کے ساتھ اخیر جنوری میں منعقد ہو چکا تھا جس پر اہل دہلی وقت اور روپیہ جی کھول کر خرچ کر چکے تھے اور ندوے کی تاریخ انعقاد تک جو مہلت انھیں ملی بھی تھی وہ ڈیڑھ ماہ چند یوم سے زیادہ نہ تھی۔ اس طرح تقریباً ایک ہی زمانے میں ایک گھر کو دو مہمان خاندانوں کی میزبانی کے لیے تیار ہونا پڑا۔ اور واقف کار سمجھ سکتے ہیں کہ میزبان کے لیے یہ کیسا سخت امتحان ہے! اس پر طرّہ مسلمانوں کا عالم گیر قحط الرجال اور بالخصوص دہلی کی عام افسردگی کہ کام کرنے والے آدمی ہر جگہ کم ہوتے ہیں اور دہلی میں کم تر: پس یہ کیسا مشکل موقع تھا کہ جو لوگ لیگ کی میزبانی سے فارغ ہو کر رفع تکان کے لیے آرام بھی کرنے نہ پائے تھے انھیں ندوے کے لیے پھر اُٹھ کر کھڑا ہو جانا پڑا۔

مقامی حالت:

اس کے علاوہ مقامی حالات کچھ اس طرح کے واقع ہوئے تھے کہ بعض اشخاص نہ صرف جلسے کے لیے غیر مستعد بلکہ بہ وجوہِ چند در چند سنگ راہ بننا چاہتے تھے۔ وہ ان کے لیے ایک کڑوی کسیلی دوا تھی اور ممکن نہ تھا کہ منھ بنائے بغیر وہ اس تلخ گھونٹ کو حلق سے اترنے دیتے۔ پھر یہ بھی تھا کہ گو ندوے نے بھولے سے بھی ایسا ارادہ نہیں کیا، لیکن اس کا وجود قدرتی طور پر ان کے اغراض ومنافع کے لیے ایک ناقابلِ دفاع حملہ تھا، اور حملے سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود ہی حملہ آور ہو جاتے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، لیکن بالآخر دوا پینی پڑی اور شکست کی ذلت اور حقارت کو ناگزیر دیکھ کر اس کے لیے بھی آمادہ ومستعد ہو جانا پڑا۔

غرضے کہ لیگ کے جلسے میں طاقتیں صرف ہو چکی تھیں، فرصت اور مہلت بالکل نہ تھی، کام کرنے والوں کی قلت، مقامی حالات پیچیدہ، ایک چالاک اور متفقہ جماعت (گو ایک شرذمۂ قلیل) آمادۂ مخالفت وپیکار۔ پھر اس پر طرہ موسم کی مخالفت کہ گرمی پورے طور پر شروع ہو چکی تھی

اور جلسہ پنڈال میں قرار پایا تھا۔اس کے علاوہ ہر جلسے کی کامیابی کے لیے پہلی چیز اجتماع کی کثرت ہے۔مگر چند سالوں سے ایسٹر کی تعطیل بھی کرسمس کی طرح سالانہ اجلاسوں کا موسم بنتی جاتی ہے۔ اور بالخصوص پچھلی تعطیل میں تو ملک کا کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی بڑی کانفرنس یا کم از کم مقامی انجمن کا سالانہ اجلاس نہ ہو! پنجاب میں انجمن حمایت اسلام لاہور، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن اصلاح راجپوتانِ ہند پٹیالہ کے سالانہ جلسے تھے، ادھر یوپی میں علی گڑھ کالج اولڈ بوائز ایسوی ایشن کا سالانہ ڈنر، اور بدایوں میں کوئی اُردو کی انجمن ہے، اس کا سالانہ اجلاس تھا۔ پھر بنارس میں صوبے کی کانفرنس بھی ندوے ہی کی تاریخوں میں منعقد ہوئی تھی۔ ادھر بنگال، مدراس، اور برار میں بھی پراونشیل کانفرنسوں کے اجلاس تھے اور ان چھوٹے چھوٹے جلسوں اور انجمن ہائے اسلامیہ کے سالانہ اجلاسوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں ہو رہے تھے۔ اگر ملک میں عام بیداری اور قومی مجالس سے دل چسپی ہوتی تو خواہ ایک ہی وقت میں کتنے ہی جلسے کیوں نہ ہوتے مگر ہر جلسہ اپنے لیے کافی جماعت موجود پاتا۔ لیکن قوم میں یہ مذاق صرف ایک خاص گروہ میں محدود ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ

وائے بر صید کہ یک باشد و صیادے چند

اس لیے اتنی تقسیمات کے بعد سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ندوے کے حصے میں آنے کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟ پس علاوہ دیگر اسبابِ ناامیدی کے کچھ عجب نہیں کہ ندوے کو اپنے دوستوں کی نسبت اس لحاظ سے بھی ناامیدی ہو کہ

محال ست ایں کہ بردامِ نگاہِ ما گذر افتد
غزالے را کہ از پے صد کمند انداز می آید

جلسے کی حیرت انگیز کامیابی:

لیکن بایں ہمہ عالم امید وبیم، جلسہ جس شان و شکوہ، عظمت و رفعت، کیفیت و اثر، جوش وخروش اور ہر حیثیت سے اکمل و اجمل ہوا، اس کی نظیر ندوے کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس کی عظمت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب موانع مندرجۂ صدر کو ان کی اصل تفصیل اور طاقت کے ساتھ پیشِ نظر رکھ لیا جائے۔ نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ کامیابی عام نظر انتقاد سے نہیں دیکھی گئی بلکہ

ان توقعات کی محک پر جانچی گئی ہے جو بعض اہم مسایل کے اعلانات اور ندوے کے دورِ جدید کے اثر سے خود بخود دلوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ چوں کہ ہم کو یقین ہے کہ یہ جلسہ اپنے نتائج کے لحاظ سے زمانۂ جاری کا اہم ترین واقعہ ہے اور ہمیشہ اس حیثیت سے یادگار رہے گا، اس لیے چاہتے ہیں کہ اگر فرصت ساتھ رہے تو جلسے کے واقعاتِ سہ روزہ کو ایک ایک کر کے نظر نقد کے سامنے دہرائیں، کیوں کہ جلسے کا زمانہ ماسبق محض سعی وامید وبیم اور جلسہ صرف ایک دل چسپ مصروفیت ہے، مگر اصلی زمانہ وہ ہے جو جلسے کے بعد سے شروع ہوتا ہے کیوں کہ عمل کا زمانہ وہی ہے۔

اجلاس کا موقع:

اس جلسے کی کامیابی کا پہلا واقعہ مقام اجلاس کی موزونیت اور دل فریبی ہے۔ اور کامیابی کا کریڈٹ سب سے پہلے ان اربابِ ہمت کو ملنا چاہیے جو عربک اسکول جیسی وسیع اور شان دار عمارت کو منتخب کرنے اور پھر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ خوش منظر عمارت اجمیری دروازے کے باہر ایک وسیع خطۂ زمین پر واقع ہے اور اس درجے شان دار، خوش قطع اور خوش وضع ہے کہ اگر اس کی تاریخ معلوم نہ ہو تو بمشکل یقین آسکتا ہے کہ یہ کسی عربی درس گاہ کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ بلند اور قدیم عربی وضع کے دروازے سے گزرنے کے بعد ایک وسیع اور مربع صحن کی فرحت بخش فضا نظر آتی تھی۔ جس میں سامنے کی طرف سرخ پتھر کی خوش نما مسجد بنی ہوئی ہے اور چاروں طرف حاشیہ چھوڑ کر باقی حصے میں سبزے کا فرش مخملی اور پھر اس فرش کا طراز مختلف پھولوں اور خوبصورت درختوں کی چمن بندی ہے۔ صحن کے تینوں طرف دو منزلہ عمارت کا سلسلہ ہے جس کی دونوں منزلوں میں نہایت وسیع اور ہوادار روشن بورڈنگ کے کمرے بنے ہیں۔ ایسی طرب انگیز عمارت دہلی میں جلسے کے لیے نہیں مل سکتی تھی۔ ندوے کے تمام مہمان اسی میں ٹھہرائے گئے۔ گویا ان کے پورے چوبیس گھنٹے یکساں طور پر ایک بہترین تفرج گاہ میں بسر ہوتے تھے۔

اس عمارت کے پہلو میں ایک وسیع میدان اسکول کے ملحقات میں سے ہے۔ اسی میں اجلاس کے لیے پنڈال بنایا گیا تھا اور شان و وسعت کے لحاظ سے ایک عظیم الشان جلسے کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔ تقریباً ایک ہزار ممبر اور وزیٹر اس میں بہ سہولت جمع ہو سکتے تھے اور اس کامیابی کو اربابِ دہلی کی حسن نیت اور خلوص کی طرف منسوب کریں یا قوم کی خوش طالعی سمجھیں کہ جگہ کی

وسعت اور اشخاص کی قلت جو کسی مجمع کی ناکامی کا نمایاں مگر بدتر سے بدتر منظر ہوتا ہے وہ باوجود پنڈال کی غیر معمولی وسعت کے الحمد للہ! اجلاس کی کسی نشست میں خالی نظر نہیں آیا۔

حضرات دہلی نے اس موقع پر جس جوش وخلوص اور محنت وجاں فشانی کے ساتھ جلسے کا انتظام واہتمام کیا، اس کا صحیح اندازہ ہمارے لیے بہت مشکل تھا کیوں کہ دستر خوان پر بیٹھنے والوں کو ان دقتوں اور کلفتوں کا کیا علم، جن سے کارکنان مطبخ کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن تاہم جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ جلسے کے موقعہ ومحل کا انفصال بہت ناوقت ہوا اور عربک اسکول اس وقت ملا، جب جلسے کی تاریخیں بالکل سر پر آگئی تھیں تو بلا مبالغہ الف لیلہ کا وہ عالی شان محل یاد آگیا، جس کو الہ دین کے عجیب وغریب موکل نے چند لمحوں کے اندر کھڑا کر دیا تھا۔ کیوں کہ ڈھائی دن سے بھی کم مدت کے اندر ایسے وسیع اور موزوں پنڈال کا مع اپنی تمام جزئیات کے تیار ہو جانا اور ایسی حالت میں کہ قطب صاحب کا عرس اور ہولی کی وجہ سے کام کرنے والوں سے شہر بھر خالی تھا، کچھ کم عجیب واقعہ نہیں ہے۔ بالآخر ہم نے یہ سمجھ کر اپنے تعجب کو دور کیا کہ غیر مرئی اور مافوق العادت مخلوقات کی قدیم روایات کی بہر صورت تصدیق کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ اربابِ دہلی اس بارۂ خاص میں الہ دین جیسے خوش قسمت نہ ہوں مگر عزمِ راسخ، جوش وخلوص اور ادائے فرض کے عجوبہ خیز مؤکلوں کی جماعت تو ضرور ان کے قبضے میں ہے، اور یہ نیرنگ آرائیاں موکلوں کی اعانت بغیر ممکن نہیں۔

ہماری قوم میں ایسے دقیقہ سنجوں کی تو کمی نہیں ہے جو فن تعمیر کے دقایق کو سمجھ سکیں مگر مزدوروں کا عالم گیر قحط ہے اور کام کرنے والے ہر جگہ مفقود ہیں۔ پس دہلی کے میزبانوں کی عزت ہمیشہ ہماری نظروں میں رہے گی کہ انھوں نے ادائے فرض کی ایک بہتر سے بہتر مثال قایم کردی۔ ان کا عزم راسخ ایک فتح یاب قوت تھی جس کے سامنے ہر مانع اور ہر مخالف کو سرِ شکست جھکانا پڑا وتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون۔

ڈیلی گیٹس اور عام شرکاء کی کثرت:

مجمع کے لحاظ سے یہ جلسہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور قایم مقاموں کا بہتر سے بہتر اجتماع تھا، جس کی دہلی جیسے شہر میں توقع کی جاسکتی ہے۔ سوءِ اتفاق سے زمانہ ایسا ملا تھا کہ ملک کے ہر حصے میں کانفرنسوں اور انجمنوں کے جال بچھے ہوئے تھے مگر ندوہ کی صدا میں کچھ ایسی کشش اور

مقناطیسیت تھی کہ ایک بہت بڑا گروہ تو دامن بچاتا ہوا ۲۶ رمارچ تک دہلی پہنچ گیا اور جن لوگوں کے دامن الجھے وہ بھی صید از دام جستہ کی طرح کسی نہ کسی طرح نکل کر دوسرے اور تیسرے دن کے جلسوں میں شریک ہو گئے۔ پنجاب کے معززین اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک بڑا گروہ اپنے صوبے کا کامل طور پر قایم مقام تھا، جن کی بے نظیر دل چسپی ندوے کے لیے نئی امیدوں کا ایک جاں فزا باب تھی۔ علی گڑھ میں چوں کہ ۲۶ رتک اولڈ بوائز ڈنر اور سرسیّد کی برسی کے جلسے تھے اس لیے پہلے اجلاس میں وہ اصحاب شریک نہ ہو سکے، جن کا علی گڑھ میں شریک ہونا لازمی تھا۔ لیکن دوسرے دن وہاں سے بھی ایک جماعت آ گئی، جس میں نواب وقار الملک بہادر کا ذکر کیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح کشمیر اور بمبئی جیسے دور دراز مقامات کے ڈیلی گیٹس کا جلسے میں موجود رہنا، اس کی وسعتِ اثر کے ثبوت کے لیے شاہد عادل تھا۔ پنجاب کے علاوہ صوبہ اودھ و آگرہ کے تقریباً ہر ضلع سے بکثرت اشخاص شریک ہوئے اور اس طرح ندوہ اپنے مرکزی مقام کے صوبے پر رفتہ رفتہ جس درجہ مؤثر ہو گیا ہے اس کا نمایاں ثبوت بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ دہلی کے اطراف و جوانب کا ذکر تو لاحاصل ہے، کیوں کہ جو آواز کشمیر، بمبئی اور کلکتہ سے اپنے عشاق کو کھینچ لائے، یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس کے ہمسائے کس بے قراری کے ساتھ بے اختیارانہ دوڑے ہوں گے!

حضرات علما کی جماعت بھی مختلف اطراف ملک سے بکثرت آئی۔ عام شرکا اور مقامی وزیٹروں کی تعداد کا یہ حال تھا کہ تقریباً ہر اجلاس میں پنڈال بھرا ہوا نظر آتا تھا اور اس خصوصیت کے لحاظ سے تو اس اجتماع کو جس قدر امتیاز دیجیے کم ہے کہ جو ہجوم و ازدحام پہلے دن کے اجلاس میں تھا وہ اخیر تک برابر قایم رہا۔ شہر کے معززین اور تعلیم یافتہ بھی ہر اجلاس میں شریک غالب رہے اور یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہوا کہ معمولاً جلسہ صرف ممبروں اور وزیٹروں کا تھا اور ٹکٹ کے بغیر کوئی شخص شریک نہیں ہو سکتا تھا۔

انتظامی حالت:

عام انتظامی حالت کے لحاظ سے تو ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایسے پبلک جلسے کے لیے، جس میں سیکڑوں اشخاص شریک ہوئے ہوں، اس سے زیادہ بہتر انتظام کے تصور سے ذہن عاجز ہے۔ جن لوگوں کو اس قسم کے انتظامات کی ذمے داری کا تجربہ ہوا ہے، صرف

وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیکڑوں مہمانوں کی میزبانی کس درجے مشکل اور پراز صعوباتِ گوناگوں کام ہے۔ بڑی دقت عام انتظام کی ان بیسیوں جزئیات میں ہوتی ہے جو کام سے پہلے تو ذہن میں نہیں آسکتیں، لیکن جب کام شروع ہو جاتا ہے قدم قدم پر اُن سے الجھنا پڑتا ہے اور بسا اوقات ایک ذرا سی مجبورانہ غلطی سے سارے کا سارا کام بگڑ جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ جزئیات میں کسی ایک جزئی امر کی بدنظمی سے پورا کام اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن کارفرمایانِ دہلی نے اس اخلاقی اصول کی عملی مثالوں میں ایک نئی مثال کا اضافہ کر دیا کہ عزم راسخ اور فرض کے خیال سے جو محنت پیدا ہوتی ہے، وہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو ممکن نہیں کہ ہر قسم کی کامیابیوں کا حاصل کرنا انسان کے قبضے اور قابو میں نہ ہو۔ اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کو بھی کوئی نہ کوئی شکایت سننی پڑتی ہے۔ مگر ہم نے یہ بات اب کی صرف دہلی ہی میں دیکھی کہ مہمانوں کے مجمع کثیر میں، جو مختلف مذاق اور عادات کا مجموعہ تھا اور جن میں سے تقریباً ہر شخص اپنے لیے کوئی نہ کوئی مخصوص ضرورت رکھتا تھا، پورے تین بلکہ چار سے بھی زیادہ دنوں کے اندر ایک زبان بھی حرفِ شکایت سے آلودہ نہ ہوئی، بلکہ جس شخص کو دیکھا اپنے باحوصلہ میزبانوں کے کسی نہ کسی نئے وصف میں رطب اللسان نظر آیا۔

ڈائننگ ہال کا انتظام اتنا عمدہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ ہم کو یقین ہے تمام مہمان یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے کہ عمدہ اور لذیذ کھانے صرف دہلی ہی میں پک سکتے ہیں! گویا انھوں نے اپنے حسنِ انتظام سے دہلی کی نسبت واقعی مبالغے کے ساتھ ایک عام حسنِ ظن پیدا کرنے میں مدد دی، لیکن اگر ہم ایک ایک مہمان سے مل سکتے تو ضرور کہتے کہ اس خیال کی صحت میں تو شک نہیں مگر اتنا تمہ اور بڑھا دیجیے کہ بہ شرطے کہ میزبانانِ دہلی ہی کی طرح فیاض، باحوصلہ، نیز خوش سلیقہ میزبان بھی میسر آئیں۔

مشکل یہ ہے کہ نئی تہذیب کے قوانین کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ میزبان کے حسنِ اخلاق اور لطف وتواضع کی جتنی تعریف ممکن ہو کیجیے مگر خوبی طعام کے حظ ولذت کے اعتراف کو صرف کام ودہان کے اقرار پنہاں تک محدود رکھیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم حوصلہ مندانِ دہلی کی اس عرب روشی کی کئی صفحوں میں داد دیتے اور پھر افسوس کرتے کہ حقِ تحسین ادا نہ ہوسکا۔

عین جلسے میں تین دن تک جو امن وسکون رہا وہ یوں بھی شاہد حسنِ انتظام تھا مگر جن اصحاب

کو ان پوشیدہ اور مخالفانہ سازشوں کا افسانہ معلوم ہے، جس کی آگ جلسے کے بعد تک برابر سلگتی رہی اور جس کے شرارے خود جلسے کی فضا میں بھی چند لمحوں کے لیے نظر آ گئے تھے، وہ یقیناً اس اعتراف میں ہمارا ساتھ دیں گے کہ طاقت اور تدبر کے اعلیٰ درجے کی دانش مندانہ انتظامی قوت اگر منتظمین کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو جلسے کی کامیابی ایک طرف، امن وسکون کے ساتھ انعقاد بھی مشکل تھا۔

ہر طاقت ور ہاتھ، جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست دے سکتا ہے، لیکن تحسین اسی فاتح کے لیے ہے جو اسلحہ کے استعمال کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کر لے۔

بہرکیف یہ تو جلسے کے انتظامات تھے اور مختصر یہ ہے کہ اہل دہلی نے ہر حیثیت سے اپنے آپ کو ایک نمونہ اور مثال ثابت کیا لیکن بہتر یہ ہے کہ اب اسٹیج کی طرف رخ کریں۔ تفصیل روداد تو ارکان ندوہ کو لکھنی چاہیے اور وہ لکھیں گے مگر میں صرف مہمات امور پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد روداد نہیں صرف نتائج ہیں۔ چوں کہ میں دہلی پہنچتے ہی سخت بیمار ہو گیا اس لیے بذاتِ خود ہر اجلاس میں شریک بھی نہ ہو سکا۔

جلسے کا پُر اثر آغاز:

دس بجے تقریباً جلسہ کا ہال لبریز تھا۔ ندوے کے ہر اجلاس میں ابتدا کے چند لمحے نہایت قیمتی اور مقدس ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی آواز جو اس کی فضا میں بلند ہو کر دلوں پر گرتی ہے، وہ انسانی آواز نہیں ہوتی وہ صدائے رعد آسائے حق جو گذشتہ تیرہ سو برس سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور ہماری حیات وبقا کا مبدا ہے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دیتی ہے اور ہم مدہوشانہ اس کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ اس اجلاس کا فاتحۃ الکتاب بھی یہی آواز تھی۔

سب سے پہلے خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب آنریری مجسٹریٹ نے بہ حیثیت پریسیڈنٹ ری سپشن کمیٹی اپنا مطبوعہ ایڈریس پیش کیا۔ یہ ایک دل چسپ تحریر تھی، جس میں ندوے کا نہایت خلوص آمیز جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا تھا اور ری سپشن کمیٹی کے ایڈریس میں جن بیانات کی عموماً توقع کی جاتی ہے وہ سب نہایت موزوں انداز اور ترتیب سے اس میں موجود تھے۔ اس کے اختتام کے بعد صدارت کا حسبِ معمول انتخاب ہوا اور حاذق الملک حکیم اجمل خان صاحب نے اپنا مطبوعہ پریسیڈنشل ایڈریس پڑھنا شروع کیا۔

پریسی ڈنشیل ایڈریس:

پریسی ڈنشیل ایڈریس ہمیشہ پبلک مجالس کی اہم ترین کارروائی سمجھی جاتی ہے اور جلسے کی اہمیت اور رفعت کا پیمانہ اسی سے قایم کیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی علمی اور دماغی کم مایگی نے اس کے بے اثر نمونے اس کثرت سے پیش کیے کہ اب ہمارے جلسوں میں عموماً اس کے لیے کچھ زیادہ بلند امیدیں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک مسلمانوں نے علم واہلیت کی قدر کرنا نہیں سیکھا۔ صدارت کی کرسیوں پر بالعموم ایسے اشخاص بٹھائے جاتے ہیں جن کا جسم علم کے وزن سے خالی، مگر اس کی کمی پوری کرنے کے لیے تمام تر چاندی اور سونے کا بوجھ ہوتا ہے۔

مگر ہم ندوے کے لیے پریسیڈنٹ انتخاب کرنے میں ارکانِ ندوہ کے حسنِ انتخاب کی علانیہ داد دیں گے۔ انھوں نے اگرچہ ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو بظاہر طبقۂ علما میں داخل نہیں، مگر اے کاش! علما کا طبقہ ایسے نفوس قدسی صفات پیش کرسکتا! ان کو ندوے کے عرش صدارت پر دیکھ کر اس وقت بھی ہم نے اپنے آپ کو نادم نہیں پایا جب وہ اپنا ایڈریس اوّل سے آخر تک سنا چکے تھے۔ ان کا ایڈریس گو مختصر تھا مگر ندوے کے ایڈریس میں لازمی طور پر جن جن مطالب کو ہونا چاہیے ان میں سے تقریباً کوئی بات نظر انداز نہیں کی گئی تھی۔ ندوے کی تاریخ اختصار کے ساتھ اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ علما کا علمی اور اخلاقی تنزل، ندوۃ العلما کی ضرورت اور دارالعلوم کی خصوصیات کا بیان جتنا کچھ کیا گیا، بہ حیثیت مجموعی مؤثر اور دل نشیں تھا۔ حکیم صاحب کو اگرچہ اُردو تحریر وتصنیف کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا، رسالہ طاعون اور چند متفرق مضامین کے سوا وہ بہت کم اُردو اہل قلم کی صف میں نظر آئے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ لٹریچر کے حسن کی مشاطہ مشق و مہارت نہیں ہے، مذاق سلیم ہے، وہ لٹریچر کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں گو زیادہ لکھتے نہیں۔ پس طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی ان کا ایڈریس کسی طرح امید شکن نہیں تھا!

تاہم بہتر تھا کہ حکیم صاحب ذرا زیادہ تفصیل اور اطناب سے کام لیتے۔ اختصار اور ایجاز بلاغت ضرور ہے مگر نہ اتنی کہ ہر جگہ خوشنما ہو۔ علوم اسلامیہ کا تنزل، نصاب قدیم کے نقایص، ارتقاے ذہنی اور اجتہادِ فکری کا عالم گیر فقدان، ملک کی اخلاق سے یکسر محرومی، یہ اور اسی قسم کے بعض اور مطالب اس درجہ اہم تھے جن کو ندوۃ العلما کے پریسیڈنشیل ایڈریس میں اگر تفصیل کے ساتھ

بیان نہ کیا جائے تو انھیں سننے کے لیے پھر ہم کہاں جائیں۔ حکیم صاحب نے علما کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کفر سازیوں اور باہم دگر معرکہ آرائیوں کی شکایت کی ہے۔ حال آں کہ طبقۂ علما کے تنزل کا افسانہ بہت طول طویل ہے اور اس کا کوئی باب ایسا نہیں جو درد انگیز نہ ہو۔

اس اجلاس میں پریسیڈنشیل ایڈریس کے علاوہ دو اور اہم کارروائیاں ہوئیں۔ ندوۃ العلما کی رپورٹ مولانا سیّد عبدالحی صاحب سیکرٹری دفتر ندوۃ العلما نے حسب معمول پیش کی اور مولانا شبلی نعمانی کا لیکچر ندوہ کی ضرورت اور اس کے مقاصد پر، جن کی تقریریں اجلاس ہائے ندوہ کی سب سے زیادہ قابلِ قدر نعمت ہے۔

مولانا سیّد عبدالحی:

مولانا سیّد عبدالحی کا چوں کہ ذکر آ گیا ہے اس لیے یہ کہے بغیر قلم آگے نہیں بڑھتا کہ مولانا شبلی نعمانی کے بعد وہ دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے ندوۃ العلما کی خدمت گذاری میں قابلِ صد تحسین ایثارِ نفس سے کام لیا ہے اور جو آغازِ کار سے اس وقت تک ندوے کی تاریخ میں ایک مثال رہے ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ فرض اور ضمیر کے معانی سے قوم کی قوم بیگانۂ محض ہو رہی ہے اور قومی ترقی کے عام شور و غوغا میں ایک آواز بھی خلوص اور ایثار کی سنائی نہیں دیتی، ایک ایسے شخص کی تعریف کیوں نہ کی جائے جس نے ابتدا سے ندوے کا ساتھ دیا اور اُس وقت بھی جب کہ غایت درجے کی کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں ندوہ چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے اغراض شخصیہ کے لیے مفید نہ پا کر تمام مدعیانِ کار ایک ایک کر کے الگ ہو رہے تھے، وہ اس کی خدمت میں برابر سرگرم رہا اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ باوجود مالی بے اطمینانی و ضروریات معاش کے جو قلیل رقم ندوہ پیش کرتا تھا، اس کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا وجود فرض کے خیال اور ایثار کے جوش کا کتنا مؤثر نمونہ ہے!

ان کی رپورٹ میں وہ تمام کامیابیاں نہایت تفصیل سے دکھلائی گئیں تھیں جو پچھلے دو سالوں میں ندوۃ العلماء کو گورنمنٹ اور قوم کی توجہ سے حاصل ہوئیں، لیکن چوں کہ دارالعلوم کی رپورٹ میں بھی یہ امور پورے تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں اس لیے ان کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔

مولانا شبلی نعمانی:

رپورٹ کے بعد ندوے کی ضرورت اور اس کے مقاصد کی تشریح کے لیے مولانا شبلی نعمانی کھڑے ہوئے۔ یہ مولانا کا خاص موضوع ہے اور ایسی مؤثر اور پرکشش داستان ہے جو کبھی پرانی ہونے والی نہیں۔ جس کو بار بار سن لینے کے بعد بھی ہمارا سامعہ نہیں تھکتا اور جو "قصہ ہاے دوست" کی طرح:

صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

کی مصداق ہے۔ قوم کی زندگی اور بقا اس پر موقوف ہے کہ اس داستان کو کان لگا کر سنے اور جب تک ایسا نہ ہو ندوہ کو چاہیے کہ ہمیشہ دہراتا رہے۔

گذشتہ اجلاس سے اگرچہ ہم کو شکایت ہے کہ مولانا نے کسی علمی موضوع پر لیکچر نہیں دیا، مگر ندوے کی ضرورت، دار العلوم کی رپورٹ، وقف اولاد، اور چند دیگر مواقع پر جس تفصیل کے ساتھ انھوں نے تقریریں کیں انھوں نے ایک حد تک اس کمی کی تلافی کر دی۔ مولانا کا لیکچر ایک آرٹر کی سحر بیانی کی جگہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پروفیسر کا درس ہے جو کسی علمی موضوع پر حلقۂ تلامذہ میں لیکچر دے رہا ہو! یہ قدرت آج صرف انھیں کو حاصل ہے کہ جس موضوع پر چاہتے ہیں ایک مرتب اور مدوّن تصنیف حاضرین کو سنا دیتے ہیں۔ ان کا لیکچر بہ لحاظ ترتیب مطالب اور حسنِ استدلال ایک مکمل رسالہ ہوتا ہے جس کو اگر قلم بند کر لیا جائے تو نظر ثانی کی بھی ضرورت نہ ہو اور بلا تامّل رسائلِ شبلی میں ایک کا اضافہ ہو جائے۔

قومی ترقی:

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا! وہ جب لیکچر دے رہے تھے تو ہم کو یقین ہے کہ سامعین نے اگر اپنے دلوں کو ڈھونڈھا ہوگا تو پہلوؤں کو خالی پایا ہوگا۔ انھوں نے ندوے کی ضرورت کو ایک ایسی مدلل اور ناقابلِ انکار صورت میں پیش کیا کہ سننے والوں میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو لیکچر کے بیان سے کلیتہً متفق نہ ہو گیا ہو۔ یہ اثر ان کے حسن بیان کا نہ تھا بلکہ خود بیان کی سچائی اور واقعیت کا تھا! آج چالیس برس سے تمام ملک قومی ترقی کی صداؤں سے گونج رہا ہے اور اس کثرت کے ساتھ سیکڑوں مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ مرزا غالب کے نقش وفا کی طرح قریب ہے کہ

بے معنے ہو جائے۔ کانفرنسوں اور انجمنوں کی کثرت کا یہ حال ہے کہ ملک کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں کوئی نہ کوئی جماعت اپنے دایمی پیشے کی طرح اس مشغلے میں زندگی نہ کاٹتی ہو۔ کانفرنسوں سے الگ عام اخبارات اور مجامع میں ترقی کا غوغا اور ہنگامہ اس زور اور تسلسل کے ساتھ قایم ہے کہ ہمارے دماغوں کو اس تموج اور ہیجان سے ایک دن کے لیے بھی سکون نصیب نہیں ہوتا، لیکن باوجود اس طوفان وتلاطم کے جب زمانے سے پوچھا جاتا ہے کہ قوم کی حالت میں کیا انقلاب ہوا، انگریزی جس کو قوم کے تمام امراض کا نسخۂ وحید قرار دیا گیا تھا اور قومی ترقی اور عزت کی کوئی سطر ایسی نہیں تھی جو اس کے دفتر مناقب وفضایل میں درج نہ کر دی گئی ہو، اس نے قوم کو علم واخلاق، عزت وتمول، تہذیب وتمدن میں کہاں تک بلند کیا۔ پھر اس تعلیم کے خواہ کیسے ہی نتایج کیوں نہ ہوں لیکن اتنے وسیع عرصے میں قوم کے کس کس گروہ میں جاری ہو سکی، کتنے روسائے ملک، کتنے تعلقے داروں، کتنے اہل حرفہ اور کتنے تاجروں نے تعلیم کو حاصل کیا۔ عام طبقہ جو قوم کا اصلی گروہ ہے اور جس کی اصلاح بغیر قوم ایک انچ اپنی سطح تنزل سے اونچی نہیں ہو سکتی، اس میں کس درجے تک تعلیم پھیلی، قوم میں کتنے مصنف، کتنے مقرر اور کتنے اہل قلم پیدا ہوئے، جہل کے مقابلے میں علم کے جو نتایج بیان کیے جاتے ہیں وہ کہاں تک قوم میں پیدا ہو سکے، ارادوں کا کیا حال ہے، دماغ کس عالم میں ہیں، سوسایٹی میں کس درجے نشاط اور شگفتگی کی طرف تغیرات ہوئے اور پھر جو کچھ ہوا وہ معاصر اقوام کے مقابلے میں کیا درجہ رکھتا ہے؟ تو ان سوالات کے جواب میں یاس اور ناامیدی کے نقوش دکھلا دیے جاتے ہیں اور آواز آتی ہے کہ اس سے زیادہ اڑنے کی بال وپر میں طاقت نہیں۔ تین چار ہائی کورٹ کے جج، سو دو سو ڈپٹی کلکٹر اور منصف، ایک محدود تعداد اُن پھرکیوں اور چرخیوں کی جن کی قیمت بازار میں پندرہ بیس روپے سے زیادہ نہیں اور جو صرف اس لیے ہیں کہ نوکری اور ملازمت کی کسی مشین میں لگا دی جائیں اور مدت العمر اپنے محور پر حرکت کرتی رہیں، ہماری امیدوں کے ارتقا وارتفاع کا سدرۃ المنتہیٰ! بس یہی نقطہ ہے اور ہماری پنجاہ سالہ ترقیات کی داستان اس سے زیادہ طویل نہیں۔ ہم نے پوری نصف صدی کی زندگی تخیل وترجی اور امید وآرزو میں کاٹ دی اور ہمیشہ اس دھوکے میں رہے کہ مستقبل آکر نجات دلا دے گا۔

آیندہ وگذشتہ تمنا وحسرت ست
یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

ندوہ اور قومی ترقی کا لاینحل عقدہ:

غرض کہ آج سے چالیس برس پیشتر قومی ترقی کا عقدہ جس طرح لاینحل تھا، آج بھی لاینحل ہے۔ ندوہ اسی عقدے کے حل کرنے کا مدعی ہے اور اس بارے میں اس کے مقاصد بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہیں۔ قوم کے قدرتی لیڈر علما تھے۔ قوم کے بڑے حصے کی باگ انھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ اگر خود ان کی حالت درست ہوتی تو وہ قوم کو بھی درست کرتے، لیکن علم واخلاق کے تنزل اور تعصب نے انھیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ اپنی قدیمی روایات کو قائم رکھ سکیں اور قوم کے لیے راہنما گروہ ثابت ہوں۔ نیا گروہ ان کے سجادے پر بیٹھا مگر وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا تھا کہ اپنا سا ایک گروہ اور پیدا کردے۔ پھر تعلیم کا جو نصاب تھا وہ اس کارخانے کے مشابہ تھا جس میں صرف ایک خاص قسم کے ہی برتن ڈھل سکتے ہیں اور جو صرف اس لیے تھا کہ ملک میں ملازمت پیشہ گروہ کا اضافہ کردے۔ پس ایسی حالت میں جب تک نئے علما کا ایک وسیع گروہ ہم میں پیدا نہ کیا جائے اور علم ومذہب سے ترکیب پایا ہوا نصاب مرتب نہ ہو، ہماری حالت میں حقیقی ترقی کی طرف کوئی تغیر نہیں ہوسکتا۔

ندوے کے مقاصد اس سے زیادہ نہیں اور مولانا شبلی سے بڑھ کر اس کی تشریح اور کون کرسکتا ہے! تقریباً دو گھنٹے تک ان کا لیکچر سامعہ نواز بزم وانجمن رہا۔ وہ جب بیٹھے تو گو علمائے مقدسین کے خوف سے سامعین کے ہاتھ چیرز کے لیے نہیں اٹھ سکتے تھے لیکن ان کے چہرے اس بے اختیارانہ اثر پذیری کے ترجمان تھے جس میں ان کے قلوب ڈوب گئے تھے۔

وقف علی الاولاد:

۲۶/ تاریخ کے دوسرے اجلاس میں وقف علی الاولاد کا مسئلہ پیش کیا گیا اور مولانا شبلی نعمانی نے اس کی اصلیت اور صورت شرعی پر نہایت مفصل تقریر کی۔ یہ اہم مسئلہ آج کئی سال سے ملک کے سامنے ہے۔ ابتدا میں متعدد اشخاص نے بطور خود اس کے متعلق کوششیں کی تھیں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اب تین سال سے مولانا موصوف نے از سر نو قوم کو توجہ دلائی۔ ان کی تقریر سے حاضرین کو معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ کیا جاچکا ہے، وہ ہر طرح سے امید افزا ہے۔ ملک کے ہر گوشے میں اس کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ تقریباً تمام علما اور تعلیم یافتہ طبقے نے غیر معمولی دل

چسپی کا اظہار کیا ہے۔ ایک مدلّل اور مبسوط رسالہ شایع ہو چکا ہے، جس کا انگریزی ترجمہ بھی گورنمنٹ میں جانے کے لیے تیار ہے۔ قوم کا کوئی گروہ اور فرقہ ایسا نہیں جو پریوی کونسل کی اس سخت اور نقصان رساں غلطی سے بے چین نہ ہو! حال میں آنریبل مسٹر جینا ممبر بمبئی نے امپیریل کونسل میں اس کی نسبت سوال کیا اور جو جواب دیا گیا وہ گو حسب دل خواہ نہ تھا مگر امید شکن بھی نہ تھا۔

مولانا کے بعد شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا، چودھری سلطان محمد خان صاحب بیرسٹرایٹ لا، سیّد عبدالحی صاحب، خان بہادر خواجہ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر اور چند دیگر اشخاص نے مختلف پہلوؤں پر بحث کی۔ آخر میں مولانا شبلی نعمانی نے اعلان کیا کہ شیخ عبدالرحیم صاحب تاجر چرم خاص وقف علی الاولاد فنڈ کے لیے پانچ سو روپے عطا فرماتے ہیں۔ یہ رقم ان مختلف رقوم کے علاوہ ہے جو گذشتہ دو سال کے اندر اس فنڈ میں جمع ہو چکی ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی اس سعی و محنت کا شکریہ ادا کریں جو وہ تین چار سال سے وقف علی الاولاد کے لیے فرما رہے ہیں، لیکن جو ذات یک سر وقفِ خدمتِ ملت ہو اُس کے کس کس احسان کا شکریہ ادا کیا جائے؟ وہ ہماری زبان، ہمارے لٹریچر اور ہمارے علوم و فنون کی ایسی گراں قدر اور عدیم النظیر خدمت انجام دے رہے ہیں جس کے احسان سے تمام عالم اسلامی سبک دوش نہیں ہو سکتا! پھر انھوں نے ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے ذمے لے لی ہے، جس کی نسبت مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ صرف انھیں کے دم سے قایم ہے۔ ان کے یہی احسانات کیا کم تھے، مگر ان کا دل ملت خواہ جو سرتاسر درد اور محبت ہے، ہمارے دیگر ضروریات کو محسوس کرنے میں بھی اسبق و اقدم رہتا ہے اور جب محسوس کر لیتا ہے تو جوشِ ملت پرستی کو ضبط نہیں کر سکتا۔

دارالعلوم کی سہ سالہ رپورٹ:

دوسرے دن کا پہلا اجلاس چند مفید رزولیوشنوں کی تحریک و منظوری سے شروع ہوا، جس میں باغیانہ افعال و جرایم سے اظہارِ نفرت کا رزولیوشن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے دارالعلوم ندوہ کی سہ سالہ رپورٹ پیش کی جو ایک مطبوعہ رسالے کی صورت میں پیشتر سے چھپوائی گئی تھی۔ رپورٹ کے پیش کرنے سے پہلے دارالعلوم کی ضرورت اور خصوصیات پر ان کا لیکچر اس درجے مدلّل اور مؤثر تھا کہ اگر مدارسِ عربیہ کے قدامت پرست اور

سخت سے سخت آرتھوڈ کس علما بھی موجود ہوتے تو ہم کو یقین ہے کہ ان کا جمود اپنے ضعف کو ضرور محسوس کرتا، آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے اس کا ذمے دار صرف نصابِ تعلیم اور طرزِ تعلیم ہے۔ آٹھ سو برس پیشتر علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ لکھتے ہوئے جس نقص کو محسوس کیا تھا، وہ اب ہمارے زمانے میں اس قدر طاقت ور اور عالم گیر ہو گیا ہے کہ دس دس برس کی جاں کاہ اور دماغ پاش تعلیم کے بعد جس کی تحصیل میں سیکڑوں دماغ اپنے قوا کو بیکار کر رہے ہیں، ایک واقف فن اور صاحبِ فہم سلیم دماغ پیدا نہیں ہو سکا۔ تعلیم کا اصلی منشا یہ ہے کہ ذہن میں قوتِ اجتہادی پیدا ہو اور قوائے ادراک وتعقل اپنے فعل میں تیز اور ذکی ہوں، لیکن یہ خصوصیت صرف ہمارے نصاب تعلیم ہی میں پائی جاتی ہے کہ اجتہاد کی جگہ تقلید جامد اور ادراک وتعقل کی جگہ تعطیلِ دماغ اس کے نتایج ممتاز ہیں۔ ہمارے نصابِ تعلیم کا مرکز قرآن کو ہونا چاہیے۔ فہم قرآن اصل مقصود اور تمام علوم بمنزلہ آلات اور وسایط کے ہیں لیکن ہمارے پورے نصاب میں ان علوم سے زیادہ اور کوئی کس مپرس نہیں، جو براہِ راست فہم قرآن میں مدد دے سکتے تھے۔ علوم اسلامیہ کے درس کے لیے بہترین کتابیں قدما کی ہو سکتی تھیں، لیکن ان کی جگہ چند ناکافی کتابیں متاخرین کی پڑھا دی جاتی ہیں، جن کی تحصیل قرآن سے قریب کرنے کی جگہ اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔ پھر تمام مدارس عربیہ کا سسٹم اور طلبا کا طریق بود و باش اس قدر متبذل اور گدایانہ ہے جس میں زندگی کا اثر پذیر حصہ کاٹ دینے کے بعد ممکن نہیں کہ محاسن اخلاق اور عمدہ جذبات پیدا ہو سکیں۔ مولانا نے اوّل نہایت تفصیل سے نصابِ قدیم کے ان تمام نقایص کو بہ تفصیل بیان کیا، پھر ان مقاصد کی تشریح کی، جن پر دار العلوم کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آخر میں وہ خصوصیات دکھلائیں جن کے لحاظ سے دار العلوم تمام ممالک اسلامیہ کے مدارس عربیہ میں منفرد ہے۔ اس میں ایک خاص خصوصیت یہ بھی تھی کہ علوم جدیدہ اور انگریزی زبان دانی ہر طالب علم کے لیے لازمی ہے۔

یہ رپورٹ تمام تر اہم اور قابلِ غور بیانات کا مجموعہ ہے اور ہمارے عقیدے میں موجودہ زمانے کی کوئی تحریک قوم کے مستقبل کی نسبت ایسی روشن اور ہمت افزا امیدیں پیدا نہیں کر سکتی، جیسی اس رپورٹ کے ہر عنوان اور ہر جملے سے دلوں میں موجزن ہوتی ہیں۔ اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ راہِ ترقی کی اصلی رکاوٹ دور ہو گئی ہے اور ایک ایسی شاہراہ ہمارے سامنے ہے جو یقیناً منزلِ مقصود پر جا کر ختم ہوگی۔

ہمارے تنزل اور انحطاط کے تمام اسباب اس نقطے پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں کہ قوم کے پریشان اور متفرق گلے کا کوئی راعی نہیں، لیکن دار العلوم اپنی تعلیم و تربیت سے جو جماعت تیار کر رہا ہے وہ اسی بھٹکے ہوئے بے راہ گلے کو جمع کر دے گا، وہ علم، مذہب اور اخلاق میں قوم کے لیے ایک روشن مثال ہوگا۔ اس کا نمونہ قوم میں حقیقی زندگی اور نشاط کی روح از سرِ نو پیدا کرے گا۔ اس کی بدولت علم کی برہم شدہ صحبتیں پھر رونق پر آ جائیں گی۔ اس سے توقعات قایم کرنے میں جس قدر اسراف کیا جائے، کم ہے۔

دار الاقامہ کے لیے چندہ:

اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے دار العلوم کے لیے بورڈنگ ہاؤس کی ضرورت پر توجہ دلائی اور فرمایا کہ سر دست سو کمروں کی تعمیر کا انتظام ناگزیر ہے جن میں سے ایک کمرہ سات سو روپیہ کی لاگت سے تیار ہوگا۔ اس پر حسب ذیل کمروں کے لیے چندے کی رقوم پیش کی گئیں:

اسمائے گرامی	تعداد کمرہ
مولوی سیّد حسن صاحب وکیل مراد آباد	ایک کمرہ (نقد)
حضرت بہاولپور کی طرف سے	ایک کمرہ (نقد)
اہلِ کشمیر کی طرف سے	ایک کمرہ
نواب رستم علی خان صاحب رئیس کرنال	ایک کمرہ
حافظ حاجی عبد الکریم صاحب سوداگر صدر دہلی	ایک کمرہ
حاجی فتح محمد صاحب کمسریٹ اسٹور کیپر جالندھر	ایک کمرہ (پان سو آ چکے ہیں)
صاحب زادہ فاروق علی خان صاحب ٹونک	ایک کمرہ
شیخ جان محمد صاحب رئیس ہوشیار پور	ایک کمرہ (پان سو آ چکے ہیں)
مسٹر محمد اسحاق صاحب وکیل الٰہ آباد	ایک کمرہ (دو سو آ چکے ہیں)
شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر	ایک کمرہ
مولوی عبد الاحد صاحب مالک مجتبائی پریس دہلی	ایک کمرہ
مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی	تین کمرے
نواب سیّد علی حسن خان صاحب رئیس لکھنو	ایک ہزار روپے

یہ چندہ اگر چہ اپنی تعداد میں غیر معمولی نہیں لیکن جتنا کچھ ہوا بغیر کسی مجبور کن تحریک و جوش انگیزی کے ہوا، عام طور پر ہمارے جلسوں میں طرح طرح کی تدبیروں سے چندہ وصول کیا جاتا ہے، لیکن یہ تمام رقمیں وہ ہیں جو ارباب ہم نے خود بہ خود اپنے جوش اور خلوص سے پیش کیں۔

ایک شان دار اور پُر اثر منظر:

لیکن جلسے کا سب سے زیادہ پُر شان اور پُر اثر منظر دار العلوم ندوۃ العلما کی تعلیم کا نمونہ تھا جو دوسرے دن کے اجلاس میں قوم کے آگے پیش کیا گیا۔ دار العلوم کی تعلیم کو مدارس عربیہ کے مقابلے میں مختلف قسم اور حیثیت کے خصوصیات حاصل ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا نمونہ یکا یک کسی جلسے میں نہیں دکھایا جا سکتا۔ مثلاً نصاب قدیم فن تعلیم کے لحاظ سے یکسر ناقص تھا۔ ادب، تاریخ اور تفسیر جیسے علوم ضروریہ کالعدم تھے۔ علوم سے طلبا کو صحیح مناسبت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ تعلیم سے بڑا مقصد تہذیب دماغ ہے، مگر اس کی جگہ طبیعت میں عموماً کج فہمی، کج رائی اور جدال پسندی پیدا ہو جاتی تھی۔ طلبا کی بسر اوقات کا یہ حال تھا کہ دریوزہ گری کی روٹیاں وسیلۂ حیات تھیں اس لیے اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ کیریکٹر کی جگہ ابتدا سے گدایانہ زندگی کے عادی ہو جاتے تھے۔ اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لیے مذہبی تقشّف اور تعصّب تو طبیعتِ ثانیہ ہو جاتا تھا مگر مذہبی زندگی، اصلی خصایل معدوم تھے۔

ندوہ ان تمام نقایص کو دور کرنے کا مدعی ہے، لیکن یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں جن کا نمونہ کسی جلسے کے اسٹیج پر دکھلا دیا جائے۔ ان کا اندازہ اس وقت کیا جا سکے گا جب دار العلوم ندوۃ العلما کے طلبا بہ کثرت ملک میں پھیلیں گے۔ ان کی زندگی پبلک ہوگی اور ملک کو موقع ملے گا کہ علمی قابلیت، دماغی قوت اور اخلاق و مذہب کو قدرتی امتحانوں میں ڈال کر دیکھے۔ البتہ چند خصوصیات ایسے ضرور ہیں جن کا نمونہ ہر موقع پر دکھلایا جا سکتا ہے۔ مثلاً طلبا کی قوت تحریر و تقریر، فن ادب سے مناسبت، عربی میں برجستہ تحریر و تقریر کی قابلیت!

ندوہ اس وقت اپنے آپ کو سخت مشکل میں پاتا ہے، جب دیکھتا ہے کہ اس کے مخاطب عموماً نئے تعلیم یافتہ اصحاب ہیں، کیوں کہ ایک ایسا گروہ جس کے سامنے انگریزی مدارس کا طریق تعلیم ہو، کسی طرح نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارا قدیم نصاب تعلیم کیسے عجیب اور دردانگیز نقایص کا مجموعہ ہے؟

تمام دنیا میں ہر زبان کی تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں تقریر و تحریر اور بول چال کی قابلیت پیدا ہو، لیکن اس عجیب خصوصیت کا حق دعویٰ صرف اس نصاب ہی کو حاصل ہے کہ برسوں کی تعلیم اور عمر بھر کے درس و تدریس و مطالعے کے بعد بھی ہمارے علما اس سے عاجز ہوتے ہیں کہ فصیح عربی میں قلم برداشتہ چار سطریں لکھ سکیں یا چند منٹ گفتگو کر سکیں۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ علما کے لیے نو وارد عرب اور ایرانی سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ اور پریشان کن چیز نہیں!

ندوے نے فن ادب کی تعلیم کا خاص انتظام کیا ہے۔ اس لحاظ سے تمام ہندوستان میں صرف اسی کی درس گاہ کو یہ فخر آمیز حق حاصل ہے کہ اپنے امتیاز خاص پر داد چاہے! اس کے طلبا کو فصیح عربی میں یہ قدرت حاصل ہے کہ قلم برداشتہ ہر قسم کے موضوع پر مضامین لکھ سکتے ہیں اور جن مطالب پر چاہیں بے ساختہ اور برجستہ لیکچر دے سکتے ہیں۔ ان کے درس میں متاخرین کی جگہ قدما کی اعلیٰ قسم کی تصنیفات رکھی گئی ہیں، اس لیے ان کی مناسبت اور مذاق کا رجحان قدرتی طور پر علو و رفعت کی طرف ہے۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی جب رپورٹ پیش کر چکے تو حاضرین کو متوجہ کیا کہ وہ جس طرح چاہیں طلبا کی ادبی قابلیت کا امتحان لے سکتے ہیں! اکثر صاحبوں نے خواہش کی کہ ندوے کے اجلاس دہلی کے حالات عربی میں قلم بند کریں! چناں چہ اسی وقت چند طلبا پنسل اور کاغذ لے کر بیٹھ گئے اور لکھنا شروع کر دیا۔

ندوے کا اجلاس تھوڑی دیر کے لیے دارالامتحان بن گیا تھا۔ آٹھ نو سو سے زیادہ نظریں مع ان قلوب کے جو طرح طرح کے شکوک اور شبہات کا آشیانہ بن رہے تھے، وقف انتظار تھیں اور ان چند نوعمر انسانوں کی طرف لگی ہوئی تھیں، جو نہایت بے پروائی سے مشغول تحریر تھے۔ بالآخر یہ عام انتظار اور اشتیاق حیرت اور تعجب کو اپنی جگہ چھوڑ گیا، جب طلبا نے اپنی اپنی عربی تحریریں پیش کیں۔ ان میں سے ہر تحریر صحت و فصاحت کے ساتھ وہ ادیبانہ اوصاف بھی رکھتی تھی جس کو نصابِ جدید کی تعلیم کا ایک نمایاں امتیاز سمجھنا چاہیے۔ خود حضرات علما حیرت اور تعجب کے ساتھ داد دے رہے تھے کہ طلبا نے چند منٹوں میں قلم برداشتہ ایسی عبارت لکھی جس کا عرصے کی مشق اور محنت کے بعد بھی لکھنا آسان نہیں۔

تمام ہال جب کہ تحسین و تعریف کی صداؤں سے گونج رہا تھا، مولانا شبلی نے فرمایا کہ یہ تحریر کا

نمونہ تھا، بہتر ہے کہ طلبا کی قوت تقریر کا بھی اندازہ کرلیا جائے۔ اس پر عبدالواجد نامی ایک طالب علم نے عربی میں برجستہ تقریر شروع کردی۔ جن لوگوں نے مدارس عربیہ کے طلبا کو اُردو زبان میں بھی کبھی صاف تقریر کرتے ہوئے نہ دیکھا ہواُن کے لیے یہ کیسا تعجب سے بے خود کردینے والا منظر تھا؟ وہ جب تقریر کررہا تھا تو اس وقت سننے والوں کا ذہن راضی نہیں ہوتا تھا کہ اسے دارالعلوم کا ایک طالب علم تسلیم کریں۔ اس کی تقریر ادب اور انشا پردازی سے اس درجے معمور تھی کہ خود علما کے گروہ سے ہر ہر لفظ اور ہر ہر ترکیب پر تحسین وتوصیف کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تقریر نہیں ہے، بلکہ کسی ادیب کی فصیح وبلیغ تحریر ہے جسے پُرشوکت جملوں اور ادیبانہ ترکیبوں میں اربابِ دہلی کی مہمان نوازی اور ندوے کے تازہ ترین حالات کو بیان کیا ہے۔

مدح وتحسین کے غلغلے میں جب تقریر ختم ہوئی تو حاضرین میں سے ہر شخص دارالعلوم کے اس نتیجۂ تعلیم کی عظمت سے متاثر تھا، متعدد اشخاص نے اس تقریر سے خوش ہوکر چند رقمیں بطور صلے کے پیش کیں کہ طلبا کو دی جائیں۔

اس کے بعد سیّد محمد صاحب اور عبدالمجید صاحب نے انگریزی میں تقریریں کیں، جس سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ ندوے میں انگریزی زبان دانی کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اس نے دو سال کے اندر کیا نتیجہ پیدا کیا ہے؟ آگے چل کر شیخ عبدالقادر صاحب ان تقریروں پر ریمارک کریں گے۔

اس وقت تک صرف دو تین طالب علموں کو تقریر کے لیے وقت ملا تھا اور کئی طلبا منتظر اور مستعد تھے کہ انھیں بھی تحریر وتقریر کا موقع دیا جائے! لیکن شدتِ حرارت اور ضیقِ وقت کی وجہ سے مولانا شبلی نے یہ سلسلہ بند کردینا چاہا کہ جس قدر نمونے پیش ہوچکے ہیں کافی ہیں۔ اتفاق سے طلبا میں پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کا ایک طالب علم سیّد امداد حسین بھی موجود تھا جس نے دارالعلوم میں زبان ثانی انگریزی کی جگہ ''بھاکا'' اختیار کی ہے۔ یہ طالب علم اسٹیج کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مولانا شبلی نے روک دیا، لیکن اسٹیج پر پنجاب اور بہاوّل پور کے جو حضرات تشریف رکھتے تھے وہ مصر ہوئے کہ ہمیں اپنے ایک ہم وطن طالب علم کی قابلیتوں کا بھی اندازہ کرلینے دیجیے!

آریا سماج نے چند سالوں سے پھیل کر ہماری مذہبی ضرورتوں کے دایرے کو بھی وسیع کردیا ہے۔ ہم میں سے ایک خاص گروہ کے لیے اب سنسکرت اور بھاکا کی تحصیل ناگزیر ہے کیوں کہ جب تک وید اور وید کی اس تفسیر کو جو آریا سماج کی اصلی بنیاد ہے، بغیر کسی واسطے کے سمجھ نہ سکیں، ہم

میں اور ان آریا واعظوں میں کچھ فرق نہیں ہوسکتا جو عربی کا ایک حرف سمجھے بغیر قرآن مجید اور سیرۃ نبوی پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ دارالعلوم نے اس ضرورت شدید کو محسوس کر کے کچھ عرصے سے بھاکا زبان کی تعلیم کا انتظام کر دیا ہے اور یہ طالب علم اسی تعلیم کے چند مہینوں کا نمونہ تھا۔

سیّد امداد حسین نے اوّل اُردو آمیز بھاکا میں تقریر کی، جس طرح آج کل آریا سماج کے مشنری عموماً اُردو میں وعظ کہتے ہیں۔ لیکن لوگوں نے خواہش کی کہ وہ خالص بھاکا زبان کی تقریر کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ اسلام کے عقاید و تعلیم پر اس نے نری بھاکا میں تقریر شروع کر دی۔

اُس جوشِ مسرت و انبساط، حیرت و تعجب اور متصل نعرہائے تحسین کی کسی طرح لفظوں میں تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، جس سے اس وقت تمام جلسہ معمور تھا۔ اس کی روانی و فصاحت، بے ساختگی اور بے تکلّفی، پھر مذہبی و علمی اصطلاحات کا بہ کثرت صحیح استعمال اور سب سے زیادہ لب و لہجے اور مخارج و تلفظ کی ہر جگہ صحت، یہ تمام باتیں ایسی تھیں جنھوں نے جمع ہو کر اس تقریر کو نہایت دل کش اور پُر اثر بنا دیا تھا۔ وہ جب تقریر کر کے بیٹھ گیا تو جلسے کے وسط سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ بعض لوگ اسی طالب علم کی زبانی قرآن مجید کا ایک آدھ رکوع بھی سننا چاہتے ہیں! شاید اس خواہش کا محرک یہ خیال تھا کہ جو شخص بھاکا زبان اور سنسکرت کے الفاظ کو ایسی طبعی مناسبت کے ساتھ ادا کرتا ہو، اس کو قرآن مجید سے کیا مناسبت؟ کچھ عجب نہیں کہ اس کے حسنِ تقریر نے بہت سے لوگوں کے دل میں اس کی قومیت کا سوال بھی پیدا کر دیا ہو؟ کیوں کہ سچ یہ ہے کہ جب وہ تقریر کر رہا تھا تو یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ ندوہ کا ایک مسلمان طالب علم ہے یا آریا سماج کا کوئی واعظ! بہ ہر کیف اس خواہش کا محرک کوئی خیال اور کیسا ہی شبہ کیوں نہ ہو، مگر ہم اس خواہش کے نہایت منت گذار ہیں۔ کیوں کہ اسی کی بدولت سیّد امداد حسین کو قرآن مجید کی تلاوت کا موقع ملا اور ایک ایسی ناممکن التعبیر روحانی حظ سے ہمارا قلب و دماغ لذت یاب ہوا، جس کو بھلانا چاہیں بھی تو نہیں بھلا سکتے!

اجلاس کی چند یادگار گھڑیاں:

سیّد امداد حسین سورہ الرحمٰن کا پہلا رکوع اپنی مؤثر آواز اور جگر دوز لہجے میں تلاوت کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ کیا یہ صاعقہ اثر آواز جو ہمارے دلوں کو دونیم

اور آنکھوں کو دجلہ ریز کر رہی ہے، وہی صدائے جان نواز ہے جو کبھی ریگستانِ عرب کے ٹیلوں اور تودہ ہائے ریگ پر بجلی بن کر چمکی، کبھی غارِ حرا کی تاریکی میں تجلّیِ حق بن کر نور افشاں ہوئی، کبھی فاران کے قلعہ ہائے بلند پر ابرِ رحمت بن کر برسی، کبھی مشرق و مغرب کے ظلمت کدے پر آفتاب بن کر طلوع ہوئی اور اب ایک لٹے ہوئے کارواں اور برباد شدہ قافلے کے لیے رہنمائی کا سہارا اور امید کی روشنی ہے!

تمام جلسہ اثر اور کیفیت کا مرقع تھا۔ سیکڑوں انسانوں کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس کو اِس خود فروشانہ محویت نے مبہوت اور بے خود نہ کر دیا ہو۔ بالخصوص جو دل کہ لذت آشنائے درد تھے، ان پر ایک خاص طرح کا عالمِ وجد طاری تھا۔ ان کے دلوں سے سوز و گداز کا دھواں اُٹھ رہا تھا اور آنکھیں اشک فشاں اور خوں بار تھیں۔ اس کیفیت کی لذت کو بے درد اغیار کیا جانیں۔ ع

خندیدن آشنا نبود با گریستن!

سیّد امداد حسین کا بیٹھنا تھا کہ ہر طرف سے اشرفیوں اور روپیوں کا نچھاور شروع ہوگیا۔ لیکن ان تمام عطیات میں سب سے زیادہ قیمتی عطیہ مولانا شبلی نعمانی کی عبا تھی جو جوشِ مسرت سے بے اختیار ہو کر مولانا نے مرحمت فرمائی اور اس کے جسم پر بھی اس طرح راست آئی کہ ع

جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

خواجہ عبدالصمد صاحب گل رو رئیس کشمیر نے بھی اپنی طرف سے ایک تمغہ پیش کیا۔ ہم کہیں لکھ آئے ہیں کہ طلبا کی اخلاقی تربیت ایسی شے نہیں ہے جس کا یکایک نمونہ دکھلایا جاسکے۔ مگر اسی جلسے میں ایک قدرتی موقع ایسا پیدا ہوگیا جو دارالعلوم کی روحِ اخلاقی کا ترجمان ہے اور جس پر ندوے کا چہرہ اگر فخر آمیز نظر آئے تو کچھ بے جا نہیں۔ طلبا کی عربی تقریر و تحریر اور سیّد امداد حسین کی حسن بیانی پر مختلف حضرات نے بطور صلے کے قریب چار سو روپے کی رقمیں عطا فرمائیں تھیں۔ مگر تمام طلبا نے لینے سے صاف انکار کر دیا اور خود بخود خواہش کی کہ یہ تمام رقم دارالعلوم کی تعمیرات کے فنڈ میں داخل کر دی جائے۔

بظاہر یہ ایثار ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن جن لوگوں کو مدارس عربیہ کے طلبا کی پست ہمتی اور دنایت روشی کے اندازہ کرنے کا موقع ملا ہے، ان کے لیے ایک عربی مدرسے کے طلبا میں ایثارِ نفس کے نمونے کم از خرق عادت نہیں!

طلبا کی انگریزی تقریروں کی نسبت شیخ عبدالقادر صاحب بی اے کھڑے ہوئے کہ اپنی رائے ظاہر کریں۔ انھوں نے کہا، ممکن ہے بعض صاحبوں کو ان کے لب و لہجے اور ادائے مخارج میں کچھ سقم نظر آئے ہوں مگر یہ کہنا بالکل سچ ہوگا کہ دو تین برس کی تعلیم نے جو صلاحیت اور قابلیت پیدا کی ہے وہ توقع سے بہت زیادہ اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے۔

اسی طرح طلبا کی عربی تحریر و تقریر کی نسبت شیخ عبدالحق صاحب بغدادی ازہری اسسٹنٹ پروفیسر عربی علی گڑھ کالج سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک اہلِ زبان اور معلم ادب ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔ انھوں نے عربی کی ایک فصیح و بلیغ تقریر میں دارالعلوم کی تعلیم اور طلبا کی ادبی قابلیت کی بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ طلبا کی عربی تحریر و تقریر نے جاہلیت عرب کے سوق عکاظ کا سماں پیدا کر دیا تھا، جس کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

انسانی غلطیوں میں سب سے زیادہ نقصان رساں اور عالم گیر غلطی یہ ہے کہ وہ عموماً آلات و وسایط کو مقصود بالذات سمجھ لیتا ہے اور دوربین کے بنانے میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ آج قوم کی قوم اسی غلطی میں مبتلا ہے۔ رزولیوشن دراصل ان کاموں کا آلہ اور ذریعہ تھے، جن کی طرف تجویز و انتخاب کے بعد قدم بڑھانا تھا مگر اب خود ان کا وجود مقصود بالذات ہو گیا ہے اور اینٹ اور چونے کے جمع کرنے میں اتنی دوڑ دھوپ کی جاتی ہے، گویا عمارت کی بنیاد رکھ دی گئی اور رات بھر کے اندر دیواروں کو آسمان سے باتیں کرنی ہیں۔ اسی غلط روی کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ قوائے عمل عموماً افسردہ ہو گئے ہیں اور کاموں کے انتخاب کرنے میں صحتِ نظری بالکلیہ ناپید ہے۔ جب کبھی ہم کوئی تجویز پیش کرتے ہیں تو اس کے ایک ایک لفظ پر مجادلہ نما مباحثہ کے لیے تو تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس پر بھولے سے بھی نظر نہیں ڈالتے کہ ملک کی ضرورتوں کا کیا حال ہے؟ مقدم امور کیا کیا ہیں اور عمل کا سامان کس درجے ہے اور کہاں تک مستعد ہے؟ بلاشبہ بعض رزولیوشن ہماری مجلسوں میں ایسے بھی منظور کیے جاتے ہیں جن کی نسبت رپوٹوں میں عمل کا خانہ بالکل سادہ نہیں ہوتا، مگر اس کے لیے کارفرما طبقے کی ستایش نہیں کرنی چاہیے بلکہ خود رزولیوشنوں کی آسان عملی کی داد دینی چاہیے، کیوں کہ ان میں زیادہ تر اس قسم کی تجویزیں ہوتی ہیں کہ فلاں شخص کو تار دے دیا جائے، فلاں محکمے سے خط و کتابت کی جائے یا فلاں افسر کو دو چار چٹھیاں بھیج دی جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی تجویزوں پر عمل کرنے کے لیے دست و پا اور ذہن و دماغ کو زحمت

دینے کی ضرورت نہیں قلم و مداد اور چند صفحات کاغذ کا صرفہ گوارا کر لینا کافی ہے۔

ندوے کا گذشتہ اجلاس اس لحاظ سے فی الحقیقت قوم کے لیے ایک یادگار مثال تھی۔ اس جلسے میں جس قدر رزرـ لیوشن پیش ہو کر منظور ہوئے ان کی اہمیت اور عظمت کو چند سطروں میں نہیں لکھا جا سکتا۔ ان میں سے ہر تجویز ایسی تھی جس سے بڑھ کر موجودہ زمانے کی کوئی تحریک احیائے ملت اور بقائے قومیت سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتی۔ ہماری ضرورتوں کا یہ حال ہے کہ ع

تن ہمہ داغدار شد پنبہ کجا کجا نہم؟

اس لیے کارکن گروہ کے لیے تجاویز پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے الاقدم فالاقدم کے اصول پر نظر رکھنی چاہیے اور صرف ان امور کو انتخاب کرنا چاہیے جو ضرورت شدید اور ممکن التعمیل ہونے کے لحاظ سے مقدم ہوں۔ ندوے کا ہر رزولیوشن اسی نکتے پر مبنی ہے۔

مذہبی ضروریات اور اعمال کا ایک مرکز:

چناں چہ دوسرے دن کے اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی نے تجویز پیش کی کہ ندوۃ العلماء کو مسلمانانِ ہند کی تمام مذہبی ضروریات کے لیے مرکز قرار دیا جائے اور چند جزئی اختلافات کے بعد بالاتفاق منظور ہوئی۔

چالیس برس کے متصل شور و ہنگامے نے ملک میں عام بیداری کے آثار پیدا کر دیے ہیں، مگر نتائج مفقود ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہماری ہر قسم کی کوششوں اور کاموں کا کوئی مرکز نہیں۔ ابتدا سے ہم اس غلطی میں مبتلا ہوئے اور نہیں معلوم کتنی مستحکم اور وسیع تحریکیں جو تمام ملک پر چھا جاتیں، صرف اس لیے بے اثر رہیں کہ وہ کسی مرکز سے وابستہ نہ تھیں۔ تمام ہندوستان میں سیکڑوں مذہبی انجمنیں اور سوسائٹیں قایم ہیں۔ مختلف گوشوں سے مذہبی خدمات کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، بیسیوں اخبار اور رسالے اسی غرض سے نکلتے ہیں، سیکڑوں اشخاص ہیں، جو مذہبی ضروریات کو محسوس کرتے ہیں اور کام کرنے کے لیے مستعد ہیں لیکن چوں کہ ان سب میں کوئی باہمی رشتہ نہیں، اس لیے باہمی اعانت اور مبادلۂ خیال و مشورہ ایک طرف، ایک کو دوسرے کے حالات تک معلوم نہیں ہوتے۔ اس جنگل کی طرح جس میں چار پایوں کے مختلف غول الگ الگ حلقے قایم کر کے چر رہے ہوں، قوم کی تمام تحریکیں پراگندہ اور منتشر ہیں اور وہ سیکڑوں نالے جو جمع

ہو کر سمندر کا مقابلہ کرتے، الگ الگ رہنے کی وجہ سے قریب ہے کہ خشک ہو جائیں۔ زنجیر کے حلقے اگر بکھرے ہوئے پڑے ہوں تو بے فایدہ بوجھ ہے، لیکن اگر انھیں کو کسی سلسلے میں منسلک کر دیجیے تو ایسی کار آمد شے ہے، جس سے ہاتھی جیسے دشمن کو بھی آپ اپنے قابو میں لا سکتے ہیں۔

بلاشبہ ملک میں اب بھی ایسے وسیع مدارس موجود ہیں جہاں سے سیکڑوں طلباء مذہبی علوم کی سندیں لے کر نکلتے ہیں، لیکن وہ جن حالات میں مبتلا ہیں، ان کے لحاظ سے یہی غنیمت ہے کہ موجودہ زمانے کے سخت مقابلے میں اپنی جگہ پر قایم رہ سکیں۔ موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے نہ تو وہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اور نہ ان ضروریات کا احساس ہے۔ وہ اب تک اس عالم میں ہیں جہاں تغیر اور ترقی سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں۔ ایسی حالت میں ندوے کے سوا مسلمانانِ ہند کی مذہبی ضروریات کا اور کون مرکز ہو سکتا ہے؟

ندوہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تنہا مذہبی تحریک ہے، اُس نے مذہب کے تحفظ اور قومیت کے بقا کے لیے جو راستہ اختیار کیا ہے، اب مصر و ایران اور روس و قوقاز کے مسلمان بھی اسی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے مذہبی تعلیم پر زندگی کا نیا دور طاری کرنا چاہا ہے اور وہ اپنے ارادوں اور ظاہر شدہ اعمال کے لحاظ سے موجودہ زمانے کی سب سے زیادہ عظیم الشان تحریک قرار دی جا سکتی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اسی کو مذہبی ضروریات کے وسیع مستقبل کے لیے مرکز ہونا چاہیے تھا۔

ہم اس کو قوم کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ یہ رزولیوشن پیش ہوا اور بغیر زیادہ اختلاف کے اتفاقِ عام کے ساتھ منظور ہو گیا۔ جلسے میں پچاس ساٹھ سے زیادہ حضرات علما تشریف فرما تھے، تعلیم یافتہ طبقہ بہ تعداد کثیر موجود تھا، امرا و رؤسا اور عام ذی علم طبقے کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان سب کا دلی جوش کے ساتھ اتفاق ظاہر کرنا اس ہر دل عزیزی کو پورے وثوق کے ساتھ ظاہر کرتا ہے جو ندوے نے قوم کے ہر طبقے میں حاصل کر لی ہے۔

یہ رزولیوشن اہمیت اور اثرات کے لحاظ سے ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے۔ ندوے کو قدرتی طور پر ایک دن ہندوستان کا ایک مذہبی مرکز بننا تھا لیکن دایرہ بنانے میں پہلی چیز مرکز کا نقطہ ہے۔ اس لیے مرکز کے فیصلے نے کام کرنے کا راستہ بالکل صاف کر دیا۔

اشاعت وصیانت اسلام:

اہمیت کے لحاظ سے دوسرے درجے پر اشاعت اسلام کا رزولیوشن تھا، جس کے لیے ندوے کو مرکزی مقام قرار دیا گیا اور طے پا گیا کہ مستقل صورت میں کام شروع کر دیا جائے۔

اشاعت اسلام ندوے کے مقاصد میں ابتدا سے شامل ہے، لیکن ندوے نے اس وقت تک اس راہ میں آنے کے لیے قدم نہیں اٹھایا۔ اس پر بعض کو حیرت ہوئی، بعضوں نے طعنہ دیا کہ جو کام سب سے زیادہ مقدم تھا اس کے لیے ندوہ مستعد نہ ہو سکا، لیکن ان ظاہر بینوں کو اصل حقیقت کی خبر نہ تھی۔ ندوہ نے تقریباً اسی زمانے میں، جب وہ عالم وجود میں آیا، یہ ضرورت محسوس کی لیکن اس نے دیکھا کہ جن آلات کے بغیر مشین تیار نہیں ہو سکتی، وہ یکسر مفقود ہیں۔ اس وقت تک اسلام کی جمعیت کو صدمہ پہنچانے والا دو قسم کا گروہ ہے۔ بڑی جماعت تو ان مسلم اور دیہاتی قوموں کی ہے جس کی تبدیل مذہب میں مذہبی اور علمی سکوت کو کوئی دخل نہیں۔ اس کو اسلام پر قایم رکھنے کے لیے مذہب کے فلسفیانہ اسرار اور علمی استدلال کے فضایل بیکار ہیں۔ چند خاص اسباب ہیں جو ان کو اسلام سے برداشتہ خاطر کر دیتے ہیں اور چالاک حریف وقت پر پہنچ کر فایدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ان کے لیے صرف ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہے جو محاسن اخلاق سے معمور ہو، جس کے دل میں مذہب کا سچا درد اور اسلامی محبت کی ٹیس ہو، اپنے ابنائے ملت کو جو صدیوں سے ہمارے گھر کی رونق تھے، اپنے سے ٹوٹتا ہوا دیکھ کر سرتاپا کرب اور بے چینی ہو جائے، مذہب کے نام سے تجارت کرنا نہ چاہے، بلکہ اپنی آرام و راحت اور دنیوی امیدوں کو مذہب کی تجارت گاہ میں فروخت پر آمادہ ہو؟ ایثار اور انسانی ہمدردی کا مرثیہ خواں ہی نہ ہو بلکہ ان اعلیٰ ترین اوصاف کا ہمہ تن نمونہ ہو جن سے اسلام کی تصویر متشکل ہوتی ہے۔ ان محاسن کے اشخاص قریہ بقریہ شہر بشہر دورہ کریں، جس جگہ ضرورت دیکھیں وہاں اپنی سیدھی سادھی تعلیم اور اپنے اخلاق کے نمونے کے ساتھ عرصے تک مقیم رہ کر اسباب ارتداد کا سدباب کریں۔ لیکن ندوے کو صاف نظر آیا کہ برسوں سے ہمارے بازار میں اس متاع سے بڑھ کر اور کوئی شے نایاب نہیں!

یہ تو وہ گروہ تھا جس کی اصلاح کے لیے علم سے زیادہ کیریکٹر کی ضرورت ہے، مگر دوسرا خطرناک گروہ وہ ہے جو علم اور عقل کے اسلحہ سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوتا ہے اور جدید تعلیم یافتہ

متشککین، آریا سماج، مسیحی مشنری اور جامع لفظوں میں یہ کہ جدید مادیت سے ہر متاثر تحریک اور فرقہ اس میں داخل ہے۔ یہی جماعت موجودہ زمانے میں مذہب اسلام کی اصلی حریف ہے اور اسی کی شورش انگیزیاں ہیں جس نے تمام مذہبوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا ہے۔

ان جماعتوں کے لیے ہم کو علما کی ضرورت ہے۔ مگر ندوے نے جب تمام ملک پر تلاش کی نظر ڈالی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ان کے لیے ایسے علما مطلوب تھے جو مذہبی علوم میں مجتہدانہ رسوخ رکھتے ہوں، وسیع النظر اور دقیقہ سنج ہوں، علوم جدیدہ سے پورے طور پر واقف ہوں، معترضین اور متشککین کی زبان میں بول سکتے ہوں، اسلام کے عقاید اور احکام کی صحیح تعبیر کر سکتے ہوں، مخالفین کے کتب اور اصول پر انھیں پورا عبور حاصل ہو، لیکن زمانہ جانتا ہے کہ آج یہی اوصاف ہیں جن سے بڑھ کر اور کسی چیز کا قحط نہیں۔

ندوہ اگر اُس قوم کو صرف خوش کرنا چاہتا، جس کی خوشی سے زیادہ کوئی شے ارزاں نہیں تو بہت آسان تھا کہ چند واعظوں اور مولود خوانوں کو سفر میں رکھ کے تمام ملک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا، مگر اُس کے ایمان نے گوارا نہیں کیا کہ ضمیر کو ذبح کر کے اُس کے خون کے چھاپوں سے دیوار کو خوشنما بنائے۔ اس کو صاف نظر آیا کہ قوم کی ترقی اور اصلاح کے ہر کام میں اصلی رکاوٹ یہ ہے کہ ہم میں علما نہیں۔ اس لیے تمام کوششوں کو ایک دار العلوم کے لیے صرف کرنا چاہیے، جس سے ضروریاتِ حالیہ کے مطابق علما پیدا ہو سکیں۔ پس گو ندوے نے ان مجبوریوں میں گھر کر اشاعت اسلام کے لیے براہِ راست سعی نہیں کی، لیکن در اصل وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ اسلام کی اشاعت اور حفاظت کا اصلی اور حقیقی سامان تھا۔

لیکن حالت نازک تھی اور اب نازک تر ہو رہی ہے۔ دار العلوم کے نتایج کا کب تک خاموشی کے ساتھ انتظار کیا جاتا؟ قوم کا یہ حال ہے کہ وہ کام کی جگہ صرف صدائے کار کی مشتاق ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں جو بے اثر انجمنیں اس غرض سے قایم ہو گئی ہیں، ان پر قانع ہو جانے کے لیے تیار ہے۔ اس لیے اب ناگزیر تھا کہ ندوہ نہایت وسیع پیمانے پر اس کام کو شروع کر دے اور ایک مرکز قایم کر کے تمام ملک کی مستعدی اور آمادگی سے باقاعدہ اور نتیجہ آور صورت میں فایدہ اُٹھائے۔ دار العلوم کی گذشتہ دہ سالہ تعلیم نے جو معدودے چند اشخاص پیدا کر دیے ہیں اور جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا، اُن سے بھی سر دست ایک حد تک مدد ملنے کی پوری امید

ہے۔ بھاکا کی تعلیم اسی غرض سے جاری کی گئی ہے کہ مناظرے کے مشکلات کچھ نہ کچھ دور ہوں۔

ندوہ اس بارے میں جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کو زمانہ خود دیکھ لے گا، لیکن یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس کی آمادگی اس بارے میں عام ارادوں سے بالکل مختلف ہے۔ کسی بڑے شہر میں ایک انجمن کا قایم کر دینا اور چند واعظوں کو نوکر رکھ لینا اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کافی ہوتا تو ہماری ذمہ داری واقعی بہت ہلکی تھی، مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مخالفین جس پیمانے اور وسعت پر کام کر رہے ہیں، اُس کے نمونے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پس جب تک ایک مرکزی تحریک ملک کے تمام حصوں میں باقاعدہ کام نہ کرے گی، اُس وقت تک یہ مشکل حل نہیں ہو سکتی۔

انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ:

اشاعت اسلام کے سلسلے میں آج برسوں سے ایک اہم سوال قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کا ہے۔ جو قوم ایک عالم گیر مذہب کے داعی ہونے کی مدعی ہو اور تبلیغ ہدایت کا اپنے آپ کو ذمے دار سمجھتی ہو، اس کی کم مائیگیوں پر دنیا کو ہنسنے کا حق حاصل ہے۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ چھ کروڑ مسلمانوں کی تعداد جو کبھی امریکہ پر حملہ آور ہونا چاہے اور کبھی میکاڈو کے مسلمان ہونے کا خواب دیکھے، آج تک اُس زبان میں اپنی کتاب کا ترجمہ بھی نہ کر سکی، جس کے کئی کروڑ بولنے والے برسوں سے صدائے حق کے منتظر ہوں۔

برسوں سے اس ضرورت کو کون محسوس نہیں کرتا، لیکن آج تک کسی کو قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ چوں کہ راہ پُر خطر اور مشکلات سے پُر تھی، لیکن گذشتہ اجلاس کے کارہائے عظیمہ میں یہ تجویز بھی داخل ہے کہ ندوے نے اپنی نگرانی میں اس خدمت کو انجام دینے کا ارادہ کر لیا اور پہلی رکاوٹ جو مانع کار تھی وہ ایک دردمند اور فیاض طبع کی ہمت سے دور ہو گئی۔ دوسرے دن کے آخری اجلاس میں جب شیخ عبدالقادر صاحب نے یہ تحریک پیش کی تو کرنیل اسماعیل خان صاحب سابق سفیر دولت افغانستان نے اعلان کیا کہ اس ترجمہ کی ترتیب اور اشاعت کے لیے جتنی رقم مطلوب ہو میں اپنی جیب خاص سے پیش کروں گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کام انتہائے درجہ کی مشکلات سے کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا، لیکن مشکلات سے مرعوب ہونے کی جگہ اُن پر غالب آنے کی کوشش کرنی چاہیے اور امید ہے کہ

ندوہ کی ہمت مشکلاتِ راہ پر غالب رہے گی۔

تین اور اہم تجویزیں:

اس کے علاوہ تین تجویزیں اور منظور ہوئیں جن کی اہمیت کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

۱۔ انگریزی مدارس اور عام انگریزی لٹریچر کی تصنیفات میں عموماً تاریخ اسلام کی نسبت بے اصل اور بے سروپا واقعات درج کیے گئے ہیں، ان کی تصحیح اور حسبِ ضرورت تغلیط کے لیے ندوے کو ایک خاص صیغہ قایم کرنا چاہیے۔

۲۔ مشرقی علوم اور علی الخصوص علوم اسلامیہ کا ایک عظیم الشان پبلک کتب خانہ قایم کرنا چاہیے۔

۳۔ انگریزی مدارس کے طلبا کے لیے ندوے کو ایک مذہبی کورس بنانا چاہیے، جس سے طلبا میں اسلامی اخلاق وآداب اور مذہبی رسوخ واستحکام پیدا ہو۔

ان میں سے ہر تجویز بجائے خود اہم اور وقیع ہے۔ یورپین مصنفین کا قلم جب کبھی ہماری تاریخ اور ہمارے اخلاق وتمدن کی تصویر کھینچنا چاہتا ہے تو قدرتی طور پر غلط بیانی، پُرفریب تدلیس اور تعصب کی پیدا کی ہوئی غلطیوں کے مختلف رنگ اس کے سامنے ہوتے ہیں اور اُنھیں سے اس تصویر میں رنگ وروغن بھرا جاتا ہے۔ ہم اپنے گھر میں پرائیویٹ تعلیم حاصل کر رہے ہوں، اسکول اور کالج میں درس لے رہے ہوں، کسی پبلک دارالمطالعے میں کتب بینی کر رہے ہوں، مقصد یہ ہے کہ خواہ کہیں ہوں ہمارے سامنے ایسی ہی تصویریں رکھی جاتی ہیں اور ہمارا تصور ہمیشہ کے لیے ان کا عکس محفوظ کرلیتا ہے۔ آج ملکی اور قومی ترقی کی سیکڑوں مشکلات ہیں جن کی تحلیل کیجیے تو آخر میں وہی اثر رہ جائے گا جو ان تصویروں کے مطالعے سے پیدا کیا گیا ہے۔ قومی تاریخ سے بڑھ کر قومی زندگی کا کوئی ذریعہ نہیں، لیکن ہندوستان میں تاریخ کی تعلیم ہی ایک ایسی شے ہے جو قومی تاریخ سے نفرت، حقارت اور باہمی بغض وعداوت کے جذبات مستقل کرتی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں کے کورس کی نسبت کبھی کبھی کانفرنسوں اور اخباروں نے شکایت کی۔ لیکن اب تک اس کا کوئی باقاعدہ صیغہ نہ تھا۔ ندوے نے اب ایک مستقل دفتر اس کے لیے الگ کردیا ہے اور اگر باقاعدہ کام ہوتا رہا

تو آیندہ تعلیم یافتہ نسلوں کی نسبت ہر طرح کی خوش آیند امیدیں پیدا کی جاسکیں گی۔

کتب خانے کا مسئلہ عرصے سے ندوے کے سامنے ہے لیکن اس کی اہمیت متقاضی ہے کہ تمام قوم کے سامنے ہو۔ مولانا سید سلیمان صاحب تعلیم یافتۂ ندوہ نے اس پر ایک مبسوط لیکچر دیا تھا۔ اس کے مطالعے سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ندوے کا اس بارے میں مقصد اصلی کیا ہے؟

آخری جلسے میں مولوی محمد دین صاحب ڈایریکٹر تعلیمات بہاول پور نے تیسرا رزولیوشن پیش کیا۔ برسوں سے اس مسئلے کے مختلف عنوانوں پر بحث کی جارہی ہے، مگر اب تک ضرورتوں کا کوئی علاج نہیں ہوا۔ اس ناکامی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ اس قسم کے کاموں کو اپنے دایرے میں لینا چاہتے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی حیثیت اور اہلیت کیا ہے؟

تجویزوں کے لحاظ سے ایک بڑی خصوصیت:

ہم شاید کہیں لکھ آئے ہیں کہ تجویزیں تمہیدِ عمل تھیں، لیکن آج کل کے کارفرما طبقے نے انھیں کو اصل عمل سمجھ لیا ہے۔ اس لیے یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ تجویزوں کے لحاظ سے گذشتہ اجلاس کی نمایاں خصوصیات کیا کیا تھیں؟

۱۔ مقدم ترین کام یہ ہے کہ قوم کی تمام ضروریات پر اس حیثیت سے نظر ڈالی جائے کہ مقدم اور اشد ضرورتیں کیا کیا ہیں؟ ندوے میں جتنی تجویزیں پیش کی گئیں، ان میں سے ہر ایک تجویز ان ضروریات پر مبنی ہے جن کے بغیر قومیت برباد ہورہی ہے اور مذہب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

۲۔ ہر مجلس کو اپنے مقاصد اور اعمال کے لیے ایک دایرہ کھینچ دینا چاہیے، جس میں محدود رہ کر مصروف کارگذاری ہو، تاکہ تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق ہر جماعت خاص خاص کاموں کو اپنے ذمے لے لے۔ ہمہ گیری کی خواہش ہوجائے گی تو ایک کام بھی خوش اُسلوبی سے نہ ہوگا۔ یہ کہنا ہمارے لیے نہایت دل شکن ہے کہ آج کل کی بعض مجالس اپنے لیے دایرے بنا بنا کر توڑتی رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ تمام دنیا کو اپنے اندر لے لیں۔ ندوے کا ابتدا سے مقصد ایک ہی ہے، یعنی مذہبی وعلمی تعلیم اور مذہبی وعلمی ضروریات کا انتظام۔ اس بنا پر گذشتہ اجلاس میں جس قدر تجویزیں پیش ہوئیں وہ اس کے قرارداده دایرے سے باہر نہ تھیں۔

۳۔ تجویزوں میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ پائے عمل کے لیے حلقۂ زنجیر ہوجاتی ہیں

اور رہبرانِ قوم جب تجویزیں پاس کرا کے مصروف خواب نوشیں ہوتے ہیں تو دوسرے سال تک کروٹ نہیں لیتے، لیکن گذشتہ اجلاس میں ہر تجویز اس وقت پیش کی گئی جب غور و فکر کے بعد اطمینان کرلیا گیا کہ ان پر عمل کرنے کے لیے ندوہ پورے طور پر تیار اور آمادہ ہے اور جلسے کے اختتام کے ساتھ ہی عملی کارروائی شروع کردی جا سکے گی۔

عام اجمالی نظر:

غرض کہ جو کچھ ہوا، امید سے زیادہ اور توقع سے بڑھ کر تھا۔ جلسے کی کامیابی کا اندازہ عموماً ملک کی توجہ، تعلیم یافتہ جماعت کی ہم دردی اور شرکا کی کثرت تعداد سے کیا جاتا ہے۔ ان تمام امور کے لحاظ سے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ جلسہ بہتر سے بہتر کامیابی کی مثال تھا۔ تعلیم یافتہ جماعت ہر طرف سے بکثرت آئی۔ علی الخصوص پنجاب جو قومی جدو جہد کی ہر دوڑ میں اوروں سے پیش رو ہے، ندوے سے اظہار شغف میں بھی پیش رو رہا۔ ہز ہائنس نواب صاحب رام پور اور ہز ہائنس سر آغا خان گو شریک نہ تھے مگر ان کی ہمدردی کے تار اور خطوط شرکت سے زیادہ مؤثر تھے۔ پھر کارروائی جتنی کچھ ہوئی ہماری مدت کی الجھی ہوئی مشکلوں کا حل تھی۔ دراصل قوم کی شاہراہِ مقصود اب پورے طور پر درست ہو گئی ہے اور **لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا**۔ (الطلاق:۱)

حاذق الملک:

لیکن یہ تحریر بالکل ناقص رہ جائے گی اگر اربابِ دہلی کا مکرر شکریہ ادا نہ کریں، جن حضرات سے لوکل کمیٹی عبارت ہے، ہم کو یقین ہے کہ ان میں سے ہر شخص اس کامیابی کے لیے مستحق شکریہ ہے۔ ندوے کی رپورٹ سے ان کے اسمائے گرامی معلوم ہوں گے، لیکن ہم یہاں چند خاص بزرگوں کا ذکر کیے بغیر قلم روک نہیں سکتے۔ ندوے کو اس مرتبہ جو یادگار کامیابی حاصل ہوئی، اس کے اولین باعث حاذق الملک حکیم اجمل خان صاحب ہیں۔ ان کے اوصاف و محامد کی نسبت ہم بغیر کسی تفصیل کے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کیوں کہ بہت کچھ کہنے کے بعد بھی یہی کہہ کر خاموش ہونا ہے کہ:

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے!

ہم میں آج اوصاف سے بڑھ کر اور کوئی شے عنقا نہیں، لیکن حکیم صاحب کی ایک ذات بیسیوں اوصاف کا مجموعہ ہے اور ان اوصاف گراں مایہ نے ان کو اثر اور اقتدار کے ساتھ بجا طور پر تمام ملک میں سر بلند کر دیا ہے۔ پس اگر ہم ایسا یقین کریں تو اس یقین کے لیے مجبور ہیں کہ ملک و قوم کی خدمت کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی شخص مفید اور تیار نہیں۔ ان کی تھوڑی سی توجہ وہ اہم نتائج پیدا کر سکتی ہے، جن کی شکل برسوں کی جدوجہد اور نالہ وفریاد کے بعد بھی ہمیں نظر نہیں آسکتی، لیکن افسوس ہے کہ وہ جس مسند پر بیٹھے ہیں اس کی ضرورتیں دامن گیر ہیں۔ وہ باوجود اس مسند کے فرایض کے جس قدر قومی خدمتیں انجام دے رہے ہیں وہ بھی من جملہ اُن اعجوبہ زا واقعات کے ہے، جن کے نمونے صرف انھیں کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ تاہم قوم کی حالت قابلِ رحم ہے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ ایسے اشخاص موجودہ دورِ تنزل میں موجود ہوں اور اس کو اپنا زیادہ وقت نہ دے سکیں۔ ہم تو یہاں تک تیار ہیں کہ اگر قوم کے سو دو سو مریض ان کی مسیحائی سے محروم رہ کر رہگرائے عالم عدم ہوں تو ہمیں شکایت نہیں، بشرطے کہ پوری قوم جو امراض گوناگوں میں مبتلا ہے، ان کے دستِ شفا بخش کو اپنی طرف متوجہ پائے۔

قوم حکیم صاحب سے کچھ کہنا چاہتی ہے، بشرطے کہ وہ اس کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوں:

تو بدیں خوبی و من عاشق و وانگہ ز تو دُور

خود تو انصاف بدہ زیستنِ امکان دارد؟

مولوی عبدالاحد صاحب مالک مجتبائی پریس، نواب فیض احمد صاحب خان بہادر، مولوی عبدالحامد صاحب، مولوی عبدالسّلام صاحب اور حافظ عبدالغفار صاحب اسی طرح تمام قوم کی شکر گذاری کے مستحق ہیں کہ جب تک جلسہ رہا یہ تمام حضرات محنت و جاں فشانی کی مجسّم تصویر تھے۔ علی الخصوص اوّل الذکر بزرگ جن کی کوششوں کو عربک اسکول جیسی خوش نما اور حلال المشکلات عمارت کے ملنے میں بہت بڑا دخل ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی (۱)

۱۔ الندوہ۔لکھنؤ، بابت ماہ اپریل ۱۹۱۰ء، ص ۱ تا ۲۹

بیسویں صدی کے اُردو ادبی منظر نامے پر جن لوگوں کی طلائی حرفوں میں کندہ سحر کار لوحیں جگمگا رہی ہیں اور ہمیشہ ضیا بار رہیں گی، ان میں ایک ناقابلِ فراموش اور حافظہ گیر نام مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) کا ہے۔ آزاد ایسی بے مثل شخصیت تھے جن پر بہ سہولت ''نابغۂ روزگار'' کی ترکیب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اُردو میں کم شخصیتیں ہوں گی جن پر جامعیت کا حرف صادق آتا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، جدید و قدیم فلسفہ، علوم عمرانی، موسیقی، شعر و ادب سب پر ایسی عالمانہ اور مجتہدانہ نظر تھی کہ اس باب میں برعظیم کے گنے چنے لوگ ہی ان کے حریف ہو سکتے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مضامین و مقالات اور شذرات پر مشتمل ہے جو اپنے زمانے کے نہایت پُر ارزش علمی مجلّہ ''الندوہ'' میں شایع ہوتے رہے۔ آزاد نے شبلی سے اپنی غیر معمولی عقیدت اور مؤخر الذکر کے اصرار کے پیشِ نظر اکتوبر ۱۹۰۵ء میں الندوہ کے معاون مدیر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی اور قریباً چھ سات ماہ تک اس کی ادارت کے فرایض انجام دیتے رہے۔ ادارت سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کے بعض مقالے الندوہ کی زینت بنتے رہے۔

ڈاکٹر شاہ جہان پوری کی اس تدوین کردہ کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف آزاد کے مقالات کی جمع آوری نہیں، ان میں موجود مباحث اور توضیح طلب مقامات کا ایک عمدہ اور ناقدانہ اشاریہ بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آزاد و ابوسلمان کے مضامین کا یہ ملا جلا مجموعہ کئی حوالوں سے شبلیات و آزادیات کے باب میں بعض نئی معلومات کا نقیب کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لایقِ تبریک ہیں کہ ان کی مساعی سے آزاد کے افادات کم و بیش سو برس بعد کتاب کی صورت میں ظہور کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

Rs. 275/-

ISBN-13: 978-969-8917-42-5
ISBN-10: 969-8917-42-X